پریم بتیسی حصہ دوم

فہرست مضامین

بازیافت

(۱)

جب میں سسرال آئی ۔ تو بالکل غیر مہذب تھی ۔ مجھے نہ پہننے اوڑھنے کا سلیقہ تھا ۔ نہ بات چیت کرنے کی تمیز ۔ میں آنکھیں سامنے کر کے کسی سے بات نہیں کر سکتی تھی وہ خود بخود جھک جاتیں مجھے کسی کے سامنے گاتے ہوئے شرم آتی تھی ۔ مجھے عورتوں کے روبرو بے نقاب آنے میں بھی عار تھا ۔ میں کچھ تھوڑی سی ہندی پڑھی ہوئی تھی لیکن مجھے ناولوں کے پڑھنے میں لطف نہ آتا تھا ۔ مجھے فرصت ملتی تو رامائن پڑھتی ۔ اس میں میرا جی بہت لگتا تھا ۔ میں اسے کوئی انسانی تصنیف نہ سمجھتی تھی ۔ میرا خیال تھا کہ اسے کسی دیوتا نے بنایا ہوگا ۔ انسانی تخیل کی بلند پروازی کا مجھے مطلق اندازہ نہ تھا ۔ میں سارے دن گھر کا کوئی نہ کوئی کام کرتی رہتی ۔ اپنی بوڑھی ساس سے تھر تھر کانپتی تھی ۔ ایک دن دال

میں نمک زیادہ ہوگیا۔ سسر جی نے کھاتے وقت صرف اتنا کہا۔ "نمک ذرا اندازہ سے ڈالا کرو"۔ اتنا سن کر کلیجہ دہل گیا۔ مجھے کوئی اس سے زیادہ سخت سزا نہیں دے سکتا تھا۔

لیکن میری یہ دہقانیت۔ میری بے تمیزی اور پھوہڑ پن میرے بابو جی (شوہر) کو پسند نہ آتی تھی۔ وہ وکیل تھے۔ انہوں نے اونچی سے اونچی علمی ڈگریاں حاصل کی تھیں۔ اور گو وہ مجھ سے محبت ضرور کرتے تھے۔ لیکن اس میں سرگرمی کے بجائے رحم کا حصہ زیادہ ہوتا تھا۔ عورتوں کی تعلیم اور معاشرت کے متعلق ان کے خیالات بہت اعلیٰ تھے۔ وہ مجھے اس معیار سے بدرجہا نیچے دیکھ کر غالباً دل ہی دل میں افسوس کرتے تھے۔ لیکن اس میں میری کوئی خطا نہ دیکھ کر وہ رسم و رواج پر جھنجلاتے تھے۔ انہیں میرے ساتھ بیٹھنے یا باتیں کرنے میں مطلق لطف صحبت حاصل نہ ہوتا تھا۔ وہ سونے بھی آتے۔ تو کوئی نہ کوئی انگریزی کتاب لے آتے اور اسے گھنٹوں پڑھا کرتے۔ اگر پوچھتی۔ کیا پڑھتے ہو۔ تو نگاہ رحم سے دیکھ کر کہتے۔ "تم کو کیا بتلاؤں۔ یہ آسکر وائلڈ کی بہترین تصنیف ہے"۔ میں اپنی خامی پر دل میں حد درجہ نادم تھی۔ مجھے محسوس ہوتا تھا۔ کہ میں ایسے بیدار مغز روشن خیال آدمی کے قابل نہیں ہوں۔ مجھے تو کسی دہقان کے گھر پڑنا تھا۔ بابو جی مجھے ذلت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے۔ میرے لئے یہی ہزار غنیمت تھی۔

ایک دن شام کے وقت میں رامائن پڑھ رہی تھی۔ بھرت رام چندر جی کی تلاش میں نکلے تھے۔ ان کی درد اور حسرت میں بھری ہوئی باتیں میرے دل میں چٹکیاں لے رہی تھیں۔ آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ دل پاکیزہ جذبات سے بھرا ہوا تھا۔ کہ بابو جی کمرے میں آئے۔ میں نے فوراً کتاب بند کر دی۔ ان کے سامنے اپنی دہقانیت کو حتی الامکان چھپاتی لیکن انہوں نے کتاب دیکھ لی۔ پوچھا۔ "رامائن ہے نا؟"

میں نے خطاوار نگاہوں سے دیکھ کر کہا "ہاں ذرا دیکھ رہی تھی"۔

بابو جی "کتاب بے شک بہت اچھی ہے اور جذبات کے پہلو خوب دکھائے گئے

ہیں۔ لیکن انسانی فطرت پر وہ غائر نگاہ نہیں ڈالی گئی۔ جو انگریزی یا فرانسیسی مصنفوں کی خصوصیت ہے۔ تمہاری سمجھ میں تو نہ آئے گا۔ لیکن یورپ میں آجکل رئیل ازم (REALISM) کا دورہ ہے۔ وہ انسانی جذبات کی ابتداء و نشوونما ایسی تحقیق سے بیان کرتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ وہ اس امر میں اخلاق یا مذہب کی قیود کے پابند نہیں ہوتے۔ لیکن ہمارے یہاں شاعر کو قدم قدم پر اخلاق اور مذہب پر نگاہ رکھنا پڑتی ہے اس لئے اکثر اس کے جذبات غیر فطری ہو جاتے ہیں۔ یہی نقص تلسی داس میں بھی ہے۔"

میری سمجھ میں اس وقت کچھ بھی نہ آیا۔ بولی "میرے لئے تو یہی بہت ہے۔ انگریزی کتابیں کیسے سمجھوں"؟

بابو جی۔ کچھ مشکل نہیں ہے۔ تم ایک گھنٹہ روز بھی صرف کرو۔ تو کافی استعداد ہو سکتی ہے۔ لیکن تم نے تو گویا میری باتیں نہ ماننے کی قسم کھالی ہے۔ تم کو کتنا سمجھایا۔ کہ مجھ سے شرمانے کی ضرورت نہیں۔ تم نے کان نہ دیا۔ کتنا کہتا ہوں کہ ذرا صاف ستھری رہا کرو۔ پرماتما حسن دیتا ہے تو وہ چاہتا ہے کہ اس کی ساخت و پرداخت بھی ہوتی رہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے۔ تمہاری نگاہ میں اس کی قدر نہیں ہے۔ یا شاید تم سمجھتی ہو کہ میرے جیسے کم رو آدمی کے لئے تم جیسے بھی رہو۔ ضرورت سے زیادہ اچھی ہو۔ یہ گویا مجھ پر ظلم ہے۔ تم مجھے جبراً ویراگ سکھانا چاہتی ہو۔ جب میں شب و روز محنت کر کے روپے پیدا کرتا ہوں تو فطرتاً میری خواہش ہوتی ہے کہ اس کا بہترین صرف ہو اور اس سے بہترین حظ اٹھایا جائے۔ لیکن تمہارا دقیانوسی پن میری محنت پر پانی پھیر دیتا ہے۔ عورت محض کھانا پکانے۔ بچے جننے۔ شوہر کی خدمت کرنے اور ایکادشی کے برت رکھنے کے لئے نہیں ہے اس کی زندگی کا مقصد اس سے بہت اعلےٰ ہے۔ وہ انسان کی تمام مجلسی۔ ذہنی ترقیوں میں برابر کا حصہ لینے کی مستحق ہے۔ وہ انسانی آزادی کی مساوی حق دار ہے۔ مجھے تمہاری یہ قیدیوں کی سی حالت دیکھ کر نہایت ملال ہوتا ہے۔ بیوی انسان کا نصف بہتر مانی گئی

ہے۔ لیکن تم میری ذہنی۔ مجلسی۔ جذباتی غرض ایک ضرورت بھی نہیں پوری کر سکتیں۔ میرا اور تمہارا مذہب جدا۔ طور و طریق جدا۔ مشاغل جدا۔ خیالات جدا۔ زندگی کے کسی شعبے میں مجھے تم سے ہمدردی اور مدد نہیں مل سکتی۔ تم خود سوچ سکتی ہو کہ ان حالات میں میری زندگی کتنی بے لطفی سے کٹ رہی ہے"۔

بابو جی کا کہنا حرف بحرف صحیح تھا۔ میں ان کے گلے میں ایک زنجیر کی طرح پڑی ہوئی تھی۔ اس دن سے میں نے ان کے اشاروں پر چلنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ اپنے دیوتا کو کیونکر ناراض کرتی؟

(۲)

یہ کیسے کہوں کہ مجھے بناؤ سنگار سے نفرت تھی۔ نہیں اس کا مجھے بھی اتنا ہی شوق تھا۔ جتنا ہر ایک عورت کو ہوتا ہے۔ جب مرد اور بچے بھی نمائش پر جان دیتے ہیں تو میں تو عورت ہی ہوں۔ اب تک جو میں اس سے محترز رہتی تھی۔ وہ اپنے اوپر بہت جبر کر کے۔ میری اماں اور دادی نے ہمیشہ مجھ سے یہی کہا۔ کہ بناؤ سنگار کی عادت اچھی نہیں۔ وہ مجھے کبھی آئینے کے سامنے کھڑے دیکھ پاتیں تو لعن طعن کرنے لگتیں۔ لیکن اب بابو جی کے اصرار نے میری وہ جھجک دور کر دی۔ اماں جان اور نندیں میرے بناؤ چناؤ پر ناک بھوں سکوڑتیں۔ لیکن مجھے ان کی پروانہ تھی۔ بابو جی کی ان مخمور نشہ محبت سے لبریز نگاہوں کے لئے میں جھڑکیاں برداشت کر سکتی تھی۔ وہ اب مجھ سے زیادہ التفات کرتے تھے اور زیادہ خوش نظر آتے تھے۔ وہ میرے لئے خوش وضع ساڑیاں۔ خوش نما جاکٹیں۔ سجیلے گاؤن۔ چمکتے ہوئے جوتے۔ کامدار سلیپریں لایا کرتے۔ لیکن میں ان چیزوں کو پہن کر کسی کے سامنے نہ نکلتی۔ یہ لباس صرف بابو جی کے لئے مخصوص تھے۔ وہ مجھے یوں بنی ٹھنی دیکھ کر پھولے نہ سماتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مجھے دیکھ کر اب ان کو زیادہ خوشی

حاصل ہوتی تھی۔ بیوی اپنے شوہر کو خوش رکھنے کے لئے کیا نہیں کر سکتی؟ گھر کے دھندے میں اب مجھے مطلق دلچسپی نہ تھی۔ میرا وقت یا تو اپنے بناؤ سنگار میں صرف ہوتا تھا۔ یا پڑھنے لکھنے میں کتابوں سے مجھے ایک عشق سا ہونے لگا تھا۔

اگرچہ ابھی تک میں اپنی ساس سسر کا ادب کرتی تھی۔ ان کے سامنے گاؤن اور بوٹ پہن کر نکلنے کا مجھے کبھی حوصلہ نہ ہوتا تھا۔ لیکن اب مجھے ان کا تحکمانہ انداز اور برتاؤ ناگوار معلوم ہوتا۔ میں سوچتی۔ جب میرا شوہر سیکڑوں روپے ماہوار کماتا ہے تو میں گھر میں لونڈی بن کر کیوں رہوں؟ یوں میں اپنی مرضی سے جو کچھ چاہے کر دوں۔ لیکن وہ مجھے حکم دینے والے کون ہوتے ہیں؟ مجھے اپنی شخصیت کا احساس ہونے لگا۔ اماں کوئی کام کرنے کو کہتیں تو میں اسے ادبدا کے ٹال جاتی۔ ایک روز انہوں نے کہا "صبح کے ناشتے کے لئے تھوڑی دال موٹ بنالو"۔ میں سن کر ان سنی کر گئی۔ اماں نے تھوڑی دیر تک میری راہ دیکھی۔ لیکن جب میں اپنے کمرے سے نہ نکلی۔ تو انہیں غصہ آ گیا۔ وہ بہت زود رنج تھیں۔ ذرا ذرا سی بات پر تنک جاتی تھیں۔ اپنے رتبے اور خودداری کا انہیں اتنا غرور تھا کہ مجھے بالکل لونڈی ہی سمجھتی تھیں۔ حالانکہ اپنی لڑکیوں کے ساتھ وہ ہمیشہ نرمی سے پیش آتیں بلکہ میں تو کہوں گی۔ انہیں سر چڑھا رکھا تھا۔ وہ غصے میں بھری ہوئی میرے دروازے پر آئیں۔ اور بولیں "تم سے میں نے دال موٹ بنانے کے لئے کہا تھا۔ بنایا؟" میں نے کسی قدر ترش ہو کر کہا۔ "ابھی فرصت نہیں ملی"۔

اماں۔ "تو تمہارے نزدیک دن بھر پڑے رہنا ہی بڑا کام ہے۔ یہ آج کل تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ کس گھمنڈ میں ہو؟ کیا یہ سوچتی ہو کہ میرا شوہر کماتا ہے تو میں کام کیوں کروں۔ تو اس گھمنڈ میں نہ آنا۔ تمہارا شوہر لاکھ کمائے۔ لیکن گھر میں میرا ہی راج رہے گا۔ آج وہ چار پیسے کمانے لگا ہے۔ تو تمہیں مالکن بننے کا دعوےٰ ہو رہا ہے۔ لیکن اسے

پالنے پوسنے تم نہیں آئی تھیں۔ میں نے ہی اُسے پڑھا لکھا کے اس لائق بنایا ہے۔ واہ باکل کی چھوکری، اور ابھی سے یہ مزاج؟"

میں رونے لگی۔ میری زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ بابو جی اس وقت اُوپر کے کمرے میں بیٹھے کچھ پڑھ رہے تھے۔ یہ سب باتیں انہوں نے بھی سنیں۔ انہیں نہایت صدمہ ہوا۔ رات کو جب وہ گھر میں آئے تو بولے "دیکھا تم نے آج اماں کا غصّہ؟ یہی سختیاں اور زیادتیاں ہیں۔ جن سے عورتوں کی زندگی تلخ ہو جاتی ہے۔ ایسی باتوں سے کتنی روحانی کلفت ہوتی ہے۔ اس کا اندازہ کرنا ناممکن ہے۔ زندگی وبال ہو جاتی ہے۔ کلیجہ چھلنی ہو جاتا ہے۔ اور انسان کا ذہنی نشوونما اسی طرح رُک جاتا ہے جیسے ہوا اور دھوپ کے نہ ملنے سے پودے افسردہ ہو جاتے ہیں۔ یہ ہماری معاشرت کا نہایت تاریک پہلو ہے اور اس نے ہماری قومی نکبت میں خاص حصّہ لیا ہے۔ اب میں تو ان کا لڑکا ٹھیرا۔ ان کے سامنے زبان نہیں کھول سکتا۔ ان کے حقوق مجھ پر اس قدر زیادہ ہیں کہ ان کی شان میں ایک سخت کلمہ بھی میری زبان سے نہیں نکل سکتا۔ اور یہی قیود تمہارے اوپر بھی عاید ہیں۔ اگر تم نے ان کی باتیں خموشی سے نہ سُن لی ہوتیں۔ تو مجھے بے حد ملال ہوتا۔ میں شاید زہر کھا لیتا۔ ایسی حالت میں دو ہی صورتیں ممکن ہیں۔ یا تو ہمیشہ ان کی گھڑکیاں۔ جھڑکیاں سہے جاؤ۔ یا اپنے لئے کوئی دوسرا راستہ نکالو۔ اب اس عمر میں اماں سے یہ امید کرنا کہ وہ اپنا وطیرہ چھوڑ دینگی محال کو ممکن سمجھنا ہے۔ بولو کیا منظور ہے؟"

میں نے خائف ہو کر کہا "آپ جو کہئے۔ وہ کروں۔ آئندہ سے نہ پڑھوں لکھوں گی جو کچھ وہ کہیں گی وہی کروں گی۔ اگر وہ اسی میں راضی ہیں تو یہی سہی۔ مجھے پڑھ لکھ کر کیا کرنا ہے؟"

بابو جی۔ لیکن میں یہ نہیں چاہتا۔ اماں نے آج شروعات کی ہے۔ اب وہ

روز بروز اور بھی سخت ہوتی جائیں گی۔ میں تمہاری تہذیب و تربیت کی جتنی بھی کوشش کروں گا۔ اتنا ہی انہیں ناگوار ہوگا۔ اور وہ تمہیں پر اپنا غصّہ نکالیں گی۔ انہیں یہ خیال کہاں کہ جس آب و ہوا میں انہوں نے پرورش پائی تھی۔ وہ اب نہیں رہی۔ ترقی اور آزادی اور اصلاح کے خیالات ان کے نزدیک کفر سے کم نہیں۔ میں نے ایک حکمت سوچی ہے۔ چل کر کسی دوسرے شہر میں اپنا ڈیرا جماؤں۔ میری پریکٹس بھی یہاں نہیں چلتی۔ دوسری جگہ جانے کے لئے کسی بہانے کی ضرورت نہیں ہے۔

میں نے اس تجویز کی زیادہ مخالفت نہیں کی۔ گو اکیلے رہنے کا خیال کر کے کچھ طبیعت سہمتی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی آزادیوں کے خیال سے دل میں ایک ولولۂ مسرت پیدا ہوتا تھا۔

(۳)

اسی دن سے اماں نے مجھ سے بولنا چالنا ترک کر دیا۔ وہ مہریوں سے میری نندوں سے پڑوسنوں سے میرا مضحکہ اڑایا کرتیں۔ یہ مجھے حد درجہ شاق گزرتا تھا۔ وہ اس کے بدلے مجھے سخت سست کہہ لیتیں۔ تو مجھے اتنا صدمہ نہ ہوتا۔ اُن کی عزت میرے دل سے کم ہونے لگی۔ کسی کی تضحیک کرنا۔ اس کی نگاہ میں اپنا وقار کھو دینے کا نہایت آسان نسخہ ہے۔ میرے اوپر سب سے سنگین الزام یہ لگایا جاتا تھا۔ کہ میں نے بابو جی پر کوئی موہنی منتر ڈال دیا ہے۔ وہ میرے اشاروں پر چلتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت بالکل اس کے برعکس تھی۔

ساون کے دن تھے۔ جنم اشٹمی کا تہوار آیا۔ گھر میں سب نے برت رکھا۔ میں نے حسب عادت برت رکھا۔ ٹھاکر جی کا جنم رات کے بارہ بجے ہونے والا تھا۔ ہم سب بیٹھی گاتی بجاتی رہیں۔ بابو جی کو یہ بیہودہ رسمیں ذرا بھی نہ بھاتی تھیں۔ وہ

ہولی کے دن رنگ نہ کھیلتے۔ گانے بجانے کا تو ذکر ہی کیا۔ جب رات کو ایک بجے میں ان کے کمرے میں گئی۔ تو سمجھانے لگے "یوں جسم کو ایذا پہنچانے سے کیا فائدہ؟ کرشن ضرور قابلِ تعظیم بزرگ تھے اور اُن کی عزّت کرنا ہمارا فرض ہے۔ لیکن اس برت اور گانے بجانے سے کیا حاصل؟ اس نمائش کا نام مذہب نہیں ہے۔ مذہب کا تعلق ایمان سے ہے نہ کہ نمود سے۔ بابو جی خود اسی اصول پر عمل کرتے تھے۔ وہ بھگوت گیتا کی بہت تعظیم کرتے۔ لیکن اسے کبھی پڑھتے نہ تھے۔ اُپنشدوں کی تعریف میں اُن کے مُنہ سے پھُول جھڑتے تھے لیکن میں نے انہیں کبھی کوئی اُپنشد کھولتے نہیں دیکھا۔ وہ ہندو مذہب کے فلسفیانہ خیالات پر شیدا تھے۔ لیکن انہیں موجودہ زمانہ کے لئے ناموزوں سمجھتے تھے۔ بالخصوص وہ ویدانت کو ہندوستان کی تباہی کا خاص سبب خیال کرتے تھے۔ کہتے۔ اسی ویدانت نے ہم کو چوپٹ کر دیا۔ ہم دنیا کی نعمتوں کو حقیر سمجھنے لگے اور اس کا خمیازہ اب تک اٹھا رہے ہیں۔ یہ مقابلہ اور سرگرمی کا دَور ہے۔ ترک اور توکّل کا اس زمانے میں نباہ نہیں ہو سکتا۔ قناعت نے ہندوستان کو فقیر بنا دیا۔" اس وقت مجھے ان کا جواب دینے کی لیاقت کہاں تھی۔ ہاں اب سوچتی ہوں کہ وہ نئی تہذیب کے طلسم میں پھنسے ہوئے تھے۔ اب وہ خود ایسی باتیں نہیں کرتے۔ مدہوشی کا اثر کچھ زائل ہو چکا ہے۔

(۴)

اس کے تھوڑے ہی دنوں بعد ہم الہ آباد چلے آئے۔ بابو جی نے پہلے ہی سے ایک دو منزلہ مکان لے رکھا تھا۔ تمام کمرے فرش سے آراستہ تھے۔ مختلف قسم کی کرسیاں اور میزیں اَور آرائشی سامان جابجا سجے ہوئے تھے۔ یہاں ہمارے پانچ نوکر تھے۔ دو عورتیں۔ دو مرد اور ایک مہراج۔ اب میں گھر کے کام کاج سے بالکل آزاد ہو گئی۔ بیکاری سے جی گھبراتا۔ تو کوئی نہ کوئی ناول پڑھنے لگتی۔

یہاں پھول اور پیتل کے برتن بہت کم تھے۔ چینی کی رکابیاں اور پیالے لماریوں میں سجے ہوئے تھے۔ کھانا میز پر آتا تھا۔ بابو جی بڑے شوق سے کھاتے۔ رفتہ رفتہ میں بھی میز پر کھانے کی عادی ہو گئی۔ حالانکہ پہلے مجھے بہت شرم آتی تھی۔ ہمارے پاس ایک خوبصورت ٹینڈم بھی تھی۔ اب ہم پیدل بالکل نہ چلتے۔ کسی سے ملنے کے لئے دس قدم بھی جانا ہوتا تو گاڑی تیار کرائی جاتی۔ بابو جی کہتے "یہی فیشن ہے"

بابو جی کی آمدنی ابھی بہت کم تھی۔ خرچ کا بار نہ سنبھلتا تھا۔ میں انہیں اکثر متفکر دیکھتی اور سمجھاتی۔ کہ "جب آمدنی کافی نہیں ہوتی ہے تو لازمہ اتنا کیوں بڑھا رکھا ہے؟ کوئی چھوٹا سا مکان لے لو۔ دو نوکروں سے بھی کام چل سکتا ہے"۔ لیکن بابو جی میری باتوں پر ہنس دیتے۔ وہ کہتے ہم اپنے افلاس کا اعلان کیوں کریں۔ صورت افلاس افلاس سے زیادہ تکلیف دہ ہوتی ہے۔ بھول جاؤ کہ ہم غریب ہیں۔ اور دولت ہمارے پاس خود آئے گی۔ خرچ کا زیادہ ہونا ضرورتوں کا بڑھنا۔ یہی حصولِ دولت کا پہلا زینہ ہے۔ اس سے ہماری پوشیدہ قوتیں ظاہر ہوتی ہیں اور ہم میدان ہمت میں قدم بڑھانے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ قناعت افلاس کا دوسرا نام ہے۔ اس لئے ہمارے مصارف روز بروز بڑھتے جاتے تھے۔ ہم ہفتے میں کم سے کم تین دن ضرور تھیٹر دیکھنے جاتے۔ ہفتہ میں کم سے کم ایک دن ضرور ہی دوستوں کی دعوت ہوتی۔ اب مجھے معلوم ہوا۔ کہ زندگی کا مقصد زندگی سے لطف اُٹھانا ہے۔ ایشور ہماری بندگی اور عبادت سے بے نیاز ہے۔ اس نے ہم کو نعمتیں دی ہیں۔ کہ ان سے حظ اٹھائیں۔ یہی اس کی بہترین عبادت ہے۔ مجھے ایک عیسائی لیڈی انگریزی پڑھانے اور گانا سکھانے آنے لگی۔ گھر میں ایک پیانو بھی آگیا۔ ان دلچسپیوں میں پڑھ کر میں رامائن بھگت مال کو بھول گئی وہ کتابیں مجھے دقیانوسی معلوم ہوتیں۔ دیوتاؤں پر سے بھی میرا اعتقاد اُٹھ گیا۔

رفتہ رفتہ یہاں لوگوں سے تعلقات پیدا ہونے لگے۔ یہ ایک بالکل نئی سوسائٹی تھی۔ اس کا طرزِ گفتگو۔ طرزِ معاشرت۔ طرزِ خیال میرے لئے بالکل انوکھا تھا۔ اس سوسائٹی میں میں ایسی معلوم ہوتی تھی جیسے موروں میں کوا۔ ان لیڈیوں کی بات کبھی تھیٹر پر ہوتی۔ کبھی گھوڑ دوڑ پر۔ کبھی ٹینس پر۔ کبھی انگریزی مصنفین کے کلام پر۔ کبھی اخباروں کے مضامین پر۔ اُن کی پھرتی و چستی ذکاوت و فراست پر مجھے حیرت ہوتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ علم و روشنی کی پتلیاں ہیں۔ وہ بے نقاب باہر نکلتیں۔ مجھے بھی بار بار اپنے ساتھ کھینچ لے چلنے کی کوشش کرتیں۔ لیکن میری غیرت اور حیا کبھی مجھے ان کے ساتھ نہ جانے دیتی۔ میں ان لیڈیوں کو کبھی اُداس یا متفکر نہ دیکھتی۔ مسٹر داس نہایت سخت بیمار تھے۔ لیکن مسز داس کی پیشانی پر ذرا بھی میل نہ تھا۔ مسٹر باگڑا نینی تال میں تپ دق کا علاج کراتے تھے۔ لیکن مسز باگڑا روزانہ ٹینس کھیلنے جاتی تھیں۔ ایسی حالت میں میری کیا حالت ہوتی؟ اسے میں ہی جانتی ہوں۔

ان لیڈیوں کے حرکات و سکنات میں ایک جادو تھا۔ جو مجھے بے اختیار ان کی طرف کھینچتا تھا۔ میں انہیں ہمیشہ تفریح و مشاغل پر آمادہ دیکھتی اور میرا بھی جی چاہتا تھا کہ انہیں کی طرح بے باک ہوتی۔ ان کی انگریزی باتیں سن کر مجھے معلوم ہوتا تھا کہ وہ دیویاں ہیں۔ میں اپنی ان خامیوں کے پورا کرنے میں بدل و جان کوشاں تھی۔

کچھ دنوں کے بعد مجھے ایک ناگوار تجربہ ہونے لگا۔ بابو جی اب اگرچہ بظاہر پہلے سے بھی زیادہ میری خاطر کرتے۔ مجھے ہمیشہ "ڈیری" یا "ڈارلنگ" کہہ کر پکارتے۔ لیکن مجھے ان کی باتوں میں ایک قسم کا تصنع نظر آتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا۔ یہ باتیں ان کے دل سے نہیں زبان سے نکل رہی ہیں۔ ان کی محبت میں سچائی کی بہ نسبت نمود کا حصہ زیادہ ہوتا تھا۔ لیکن اس سے بھی زیادہ تعجب کی یہ بات ہے کہ اب مجھے بھی بابو جی پر وہ کامل عقیدت نہ رہی تھی۔ اب ان کے ذرا سا سر دُکھنے پر میرا دل نہ دُکھتا تھا۔ میری

شخصیت کا نشو و نما ہونے لگا تھا۔ اب میں اپنا بناؤ سنگار اس لئے کرتی تھی کہ یہ میرا دُنیاوی فرض ہے۔ اس لئے نہیں کہ میں کسی فرد واحد کی پابند ہوں۔ مجھ میں اپنے نشۂ حسن سے مخمور ہونے کا مادہ پیدا ہونے لگا تھا۔ جو نمودِ حسن کی پہلی منزل ہے۔ منشاءِ زندگی کی جو تعلیم بچپن سے دی گئی تھی۔ وہ اب دل سے محو ہونے لگی تھی۔ میں اب کسی دوسرے کے لئے نہ جیتی تھی۔ اپنے لئے جیتی تھی۔ بے نفسی اور قربانی کی اسپرٹ مجھ میں سے مفقود ہو چلی تھی۔

میں اگرچہ اب بھی پردہ کرتی تھی۔ لیکن دادِ حسن کی ایک نہایت بے تاب کن خواہش مجھے بے چین کیا کرتی تھی۔ ایک روز مسٹر داس اور کئی دیگر احباب بابو جی کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ میرے اور ان کے درمیان صرف ایک پردہ حائل تھا۔ بابو جی میری اس جھجک سے بہت نادم ہوتے تھے۔ اسے وہ اپنی شانِ تہذیب میں ایک داغ سمجھتے تھے۔ شاید وہ دکھانا چاہتے تھے کہ میری بیوی اس لئے پردہ میں نہیں ہے کہ وہ حسن یا لباس میں کسی سے کم ہے بلکہ محض اس لئے کہ ابھی اسے شرم دامنگیر ہے۔ وہ کسی حیلے سے مجھے بار بار پردہ کے پاس بلاتے۔ تاکہ ان کے دوست میری شکل اور لباس کو دیکھ سکیں۔ آخر کار شوقِ نمود کچھ دنوں کے بعد حیا پر غالب آیا۔ اور الہ آباد آنے کے پورے دو سال بعد میں بابو جی کے ساتھ بے نقاب سیر کرنے لگی۔ سیر کے بعد ٹینس کی نوبت پہنچی اور آخر میں نے کلب میں جا کر دم لیا۔ پہلے یہ ٹینس اور کلب مجھے ایک تماشا سا معلوم ہوتا تھا۔ گویا وہ لوگ ورزش کے لئے نہیں، بلکہ فیشن کے لئے ٹینس کھیلتے تھے۔ وہ کبھی نہ بھولتے تھے۔ کہ ہم ٹینس کھیل رہے ہیں۔ ان کے حرکات میں جھکنے میں۔ اُچکنے میں۔ دوڑنے میں ایک تصنع تھا۔ جو ظاہر کرتا تھا کہ اس کھیل سے ورزش نہیں محض نمود مقصود ہے۔

کلب میں اس سے بھی بدتر حال تھا۔ وہ نقالی تھا۔ خالص بے میل نقالی۔ لوگ

انگریزی کے چُنے ہوئے فقرے بولتے تھے۔ جن میں کوئی معنی نہ ہوتے تھے۔ نقلی ہنسی ہنستے تھے۔ جس کا کوئی محل نہ ہوتا تھا۔ عورتوں کی وہ پھوہڑ بے پردگی، مردوں کی وہ بھونڈی نسواں پرستی مجھے ایک دل لگی سی معلوم ہوتی تھی۔ سارا منظر انگریزی معاشرت کا ایک مرقع تضحیک تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ میں بھی وہی رنگ پکڑنے لگی اور وہی پارٹ ادا کرنے لگی۔ اب مجھے اندازہ ہوا کہ شوق نمود میں کتنی زبردست قوت ہے۔ میں اب نت نئے سنگار کرتی۔ نت نئے روپ بھرتی۔ محض اس لئے کہ کلب میں مَیں ہی سب کی نگاہوں کا مرکز بن جاؤں۔ اب مجھے بابو جی کی آرام و آسائش اور ضرورت کے مقابلے میں اپنے سجاؤ۔ بناؤ کا زیادہ خیال رہتا تھا۔ یہاں تک کہ یہ شوق ایک نشہ سا ہو گیا۔ اتنا ہی نہیں۔ دادِ حسن کے ملنے سے مجھے ایک غرور آمیز مسرت حاصل ہونے لگی۔ میرے احساس غیرت میں بھی ایک عجیب وسعت اور لچک پیدا ہو گئی۔ وہ نگاہیں جو کبھی میرے جسم کا ایک ایک رویاں کھڑا کر دیتیں۔ وہ کنائے اور بذلہ سنجیاں جو کبھی مجھے زہر کھا لینے پر آمادہ کر دیتیں۔ ان سے اب مجھے ایک شورش انگیز مسرت حاصل ہوتی تھی۔ لیکن جب کبھی کبھی میں اپنی حالت پر غور کرتی تو مجھے بہت افسوس ہوتا۔ یہ ناؤ کس گھاٹ لگے گی۔ ارادہ کرتی کہ اب کلب نہ جاؤنگی مگر وقت آتے ہی اضطراری طور پر پھر تیار ہو جاتی تھی۔ ارادہ نیک بالکل کمزور ہو گیا تھا۔

بابو جی کے مزاج میں مجھے ایک اور تغیر نظر آنے لگا۔ وہ زیادہ تر خاموش اور متفکر رہنے لگے۔ مجھ سے بہت کم بولتے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یا تو انہیں کوئی سخت تردد لاحق ہے۔ یا خدانخواستہ کوئی مرض ہو گیا ہے۔ ان کا چہرہ پژمردہ رہتا تھا۔ نوکروں سے ذرا ذرا سی بات پر خفا ہو جاتے اور باہر بہت کم جاتے۔ ابھی ایک مہینہ پہلے وہ سو کام چھوڑ کر کلب جاتے تھے۔ وہاں گئے بغیر انہیں کل نہ پڑتی تھی۔ لیکن اب

عرفان علی نے کسی قدر محجوب ہو کر کہا "ہاں لڑکے اچھی طرح ہیں۔ تم یہاں آرام سے ہو؟"

درگا۔ جی ہاں۔ سب حضور کی مہربانی ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے ایک کاغذ پر چند قلموں کے نام لکھ کر رکھ دیئے۔ اور رخصت مانگی۔ پریم شنکر ان کے ساتھ ساتھ پھاٹک تک آئے۔ ڈاکٹر صاحب نے دروازہ پر متانت سے مسکرا کر کہا۔ حضرت میں آپ کے اصولوں کا قائل تو نہیں ہوا۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ آپ نے ایک کمینہ اور شیطان آدمی کو انسان بنا دیا یہ آپ کی صحبت کا فیض ہے۔ میں ذات کا قائل ہوں۔ انسٹی ٹیوشنوں کا قائل نہیں لیکن معاف فرمایئے گا۔ میں پھر بھی کہونگا کہ آپ اس سے ہوشیار رہیئے گا۔ "ایجونکس" کا علم ابھی تک کوئی ایسا نسخہ ایجاد نہیں کر سکا۔ جو تخم کی تاثیر کو مٹا دے ۔

عوام پر اقتدار ہے ؟ مگر اس کے قبل بھی بارہا اس اقتدار کو زک ہو چکی ہے اور قرائن تبلا رہے ہیں کہ زمانہ قدیم میں اب اسے پھر زک پہنچنے والی ہے۔ شاید اب کے یہ شکست فیصلہ کن ہوگی۔ تہذیب کا دور جمہوریت سے شروع ہو کر جمہوریت ہی پر ختم ہوتا ہے۔ شاہی حکومت روساء کا اقتدار سرمایہ داروں کی بالادستی یہ درمیانی منازل ہیں۔ موجودہ دور نے درمیانی منزلیں طے کر لی ہیں اور اپنی آخر منزل تک آپہنچا ہے۔ مگر ہم ابھی تک اپنی ثروت اور اختیار کے نشہ میں اس قدر مخمور ہیں کہ ہم کو آثار اور قرائن بالکل نہیں نظر آتے۔ اطراف عالم سے جمہور کی گھنگھور صدائیں ہمارے کانوں میں پہنچ رہی ہیں۔ مگر ہم ابھی تک ایسے بے خبر ہیں۔ گویا عالم خواب میں ہوں۔ ہم اپنی یونیورسٹی ایجوکیشن اپنے قانونی انہماک۔ اپنے ڈراما اور تھیٹر اپنے مل اور کارخانوں اور اسی قسم کے دوسرے مشاغل میں محو ہیں۔ جن کا منشا دوسروں کی کمائی اور مشقت پر موٹا ہونا ہے۔ موجودہ گرانی ضروریات پر سارے عالم میں واویلا مچا ہوا ہے میں بہت خوش ہوں۔ اس سے ہماری تہذیب کے تاریک پہلو پر کیسی صاف روشنی پڑتی ہے۔ اب مہذب دنیا کو تجربہ ہو رہا ہے کہ تھیٹر کا وہ ایکٹر جو پانچ ہزار روپیہ ماہوار پیدا کرتا ہے معاشرت کا ضروری جزو ہے۔ یا وہ غریب کنندۂ ناتراش کاشتکار جسے ہم حیوان مطلق سمجھنے کے عادی ہیں۔

یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ درگا مالی ایک ڈالی میں کچھ پھل چند جوار کی بالیں چند آم سجا کر لایا۔ اس کے انداز اور بشرہ سے ایک خودداری نہ متانت برس رہی تھی گویا اب وہ ذاتی اہمیت سے باخبر ہو گیا ہے۔ وہ سلام کر کے ایک مونڈھے پر بیٹھ گیا۔ اور ڈاکٹر صاحب سے پوچھا "آپ کو کن چیزوں کی قلمیں چاہئیں۔ آپ بابو جی کو آرڈر دیجئے۔ میں کل آپ کے مکان پر پہنچا دوں گا۔ بال بچے تو اچھی طرح ہیں"؟

خاص موقعوں کی ضرورت ہوتی ہے"۔

پریم شنکر۔ میں یہ کب کہتا ہوں کہ ہر فرد مزدوری کرنے پر مجبور ہو۔ نہیں جسے پرماتما نے غور و فکر کی قوت عطا کی ہے۔ وہ فلسفیانہ مسائل کی تحقیق کرے۔ جس کے جذبات مفیدؔ اور عمیق ہوں۔ وہ شعر و سخن میں طبع آزمائی کرے۔ علیٰ ہٰذا میری دلیل صرف یہ ہے کہ پیشوں میں اس قدر امتیاز نہ رہنا چاہیئے۔ دماغ سے تعلیم و تہذیب اور درس و تدریس کا کام لینا چاہیئے۔ جذبات سے اخلاقی اور روحانی اصلاح کا۔ مگر ان روحانی یا دماغی کمالات کو ذریعہ ثروت نہ بنانا چاہیئے۔ میرے خیال میں بہتر یہ ہے کہ ہر شخص اپنے ہاتھوں سے کسب معاش کرے اور دل و دماغ صرف قوم کی اصلاح و فلاح روحانی مسائل کی تحقیق و تدقیق۔ علمی معلومات کی اشاعت اور ترویج کے لئے وقف ہوں لیکن تاوقتیکہ ہم اس اعلیٰ معیار تک نہ پہنچ سکیں۔ ہم کو ذہنی اور حرفتی پیشوں میں اس غیر فطری امتیاز کو مٹانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ کیونکہ یہ آئین قدرت کے بالکل خلاف معلوم ہوتا ہے کہ لازمی پیشوں کو تفوق ہو۔ بعض اہل الرائے کا خیال ہے کہ اس تسویہ سے اہل کمال بددل ہو جائیں گے اور دنیا ان کے انوار فیض سے محروم ہو جائیگی مگر وہ بھول جاتے ہیں کہ دنیا کے بڑے سے بڑے حکماء بڑے سے بڑے شعراء بڑے سے بڑے موجد۔ بڑے سے بڑے ارباب فنون لطیفہ۔ مال و زر سے بے نیاز تھے۔ اس وقت کمال کا معاوضہ اپنے قلب کی تسکین تھی۔ نوع کی ضرورت محرک کہاں تھی۔ جب سے کمال نے دولت کا دامن پکڑا۔ اسی وقت سے تہذیب کا انحطاط شروع ہوا"۔

ڈاکٹر عرفان علی اب زیادہ صبر نہ کر سکے۔ بولے "آپ کا مجوزہ نظام معاشرت فرشتوں کی دنیا کے لئے چاہے موزوں ہو۔ لیکن اس عملی دنیا کے لئے اور اس عملی دور میں ہرگز موزوں نہیں ہے"۔

پریم شنکر۔ محض اسی لئے کہ ابھی تک سرمایہ داروں کا اور مہذب جماعت کا

کی دوگنی چوگنی رقم کافی ہونی چاہیئے۔ مگر پانچ اور پانچ ہزار۔ پچاس اور پچاس ہزار کا بعد المشرقین کیوں ہو؟ انتظام سلطنت قانونی فیصلہ۔ قانون کی حمایت۔ طبابت۔ تصویرکشی۔ رقاصی معلمی۔ دلالی۔ تجارت اور صدہا دیگر پیشے ایسے ہیں جن میں ایک بھی کسب دولت نہیں کرتا۔ ان سب کا مدار دوسروں کی کمائی پر ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ وہ پیشے جو ضروریات زندگی پیدا کریں۔ قیام حیات کے لئے سامان بہم پہنچائیں۔ آج دنیا کے سارے مدبر۔ سارے وکیل۔ سارے دلال۔ سارے پروفیسر معرض فنا میں آجائیں تو دُنیا آنسو کا ایک قطرہ بھی نہ گرائے گی۔ بلکہ خوشی سے گھی کے چراغ جلائے گی۔ اس کے سر سے ایک بوجھ اتر جائے گا۔ کاشتکار اپنا ہل چلائیگا اور اپنے گوشۂ قناعت اور عافیت میں بیٹھا ہوا آرام سے زندگی بسر کریگا۔ آپ فرمائیں گے۔ یہ تو تمدن کے دور اولین کا نقشہ ہے۔ انسان نے قرنوں اور صدیوں میں جو ترقیاں کی ہیں۔ ان کو ہٹا کر پھر اسی دور توحش کی طرف واپس جاتا ہے۔ آپ فنون لطیفہ کی ترقی کو انسان کے جذباتی اور روحانی عروج کا لازمہ قرار دیںگے۔ علیٰ ہذا آپ کو موجودہ تہذیب کا ہر ایک پہلو حیات انسانی کے لئے ضروری نظر آئے گا۔ کیونکہ انسان محض چوپایہ نہیں ہے۔ لیکن حق یہ ہے کہ تہذیب اور ترقی خودغرضی اور جفاشعاری کی ایک مستور صورت ہے اور کچھ نہیں۔ ہندوستان کا کاشتکار چین کے مزارع سے لڑنے نہیں جاتا۔ اسی تعلیم یافتہ گروہ نے اپنے مطلب کے لئے قوم کا سوانگ کھڑا کیا۔ قومی حقوق کی حفاظت کے لئے فوجیں بنائیں۔ انصرام سلطنت کا نقشہ کھینچا۔ مسائل بین الاقوام کی ایجاد تجارت اور صنعت کے لاینحل عقدے اختراع کئے اور اب اپنی فتوحات پر ناز کرتا ہے۔ اپنی تہذیب پہ پھولا نہیں سماتا۔

عرفان علی۔ آپ اقتصادیات کے مسئلہ تقسیم محنت کو بالکل نظرانداز کر رہے ہیں قدرت نے افراد کو خاص خاص قابلیتیں عطا کی ہیں۔ ان کے بہترین استعمال کے لئے

زبردست آزاری پر مائل کرے۔ جو ہمیں تکلفات کا مطیع بنائے جو ہمیں دوسروں کا خون پی کر فربہ ہونے کی تحریک کرے۔ تعلیم نہیں شیطنت ہے۔ جہلا حرص و طمع کے بس میں ہو جائیں۔ تو قابل معافی ہیں۔ مگر مدعیان علم و تہذیب کے لئے نفس پرستی حد درجہ شرمناک ہے۔ علم و فضیلت کو ہم نے بام ثروت کا زینہ بنالیا۔ حالانکہ وہ خدمت کا وسیلہ تھا۔ اونچی سے اونچی تعلیم پائے ہوئے لوگ زیادہ سے زیادہ حریص نظر آتے ہیں۔ بس زبردستی ہماری تعلیم و تہذیب کا معیار ہے۔ میں اس تعلیم سے جہالت کو بدرجہا بہتر سمجھتا ہوں۔ ہمارے پروفیسر صاحب ایک ہزار سے کم تنخواہ پائیں تو ان کا منہ نہیں سیدھا ہوتا۔ ہمارے دیوانی اور مال کے حکام دو ہزار ماہوار پانے پر بھی شکوۂ تقدیر کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب چاہتے ہیں کہ ساری دنیا مریض ہو جائے اور میں سونے کی دیوار کھڑی کر لوں اور ہمارے وکیل صاحب (معاف کیجئے گا) اپنی قانون دانی کو ہیرے کے تول بیچنا چاہتے ہیں۔ سب کے سب "وقت دولت ہے" کے کلیہ کے غلام بنے بیٹھے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک سیکڑوں ہزاروں آدمیوں کی روزی غصب کر لیتا ہے اور پھر بھی خادم قوم بننے کا دعویٰ کرتا ہے۔ رعایا فاقہ کشی کرے۔ برہنہ رہے۔ طاعون سے مرے۔ ہمارا دماغی گروہ ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ پیدا دوسرے کریں کھانا ہمارا کام ہے۔ میں اس گروہ کو محض وجود معطل نہیں بلکہ شر و اثر سمجھتا ہوں۔

ڈاکٹر عرفان علی نے بہت تحمل سے کام لے کر پوچھا "تو کیا آپ چاہتے ہیں کہ ہم سب مزدوری کریں"؟

پریم شنکر۔ جی نہیں۔ حالانکہ اگر ایسا ہو تو میں اسے نوع انسان کے لئے مایۂ خیر و برکت سمجھوں۔ مجھے صرف حالات میں اس درجہ تفاوت سے اعتراض ہے۔ اگر ایک غریب آدمی پانچ روپے ماہوار میں گذار سکتا ہے تو ایک دماغی کام کرنے والے آدمی کے لئے اس

آرہی ہے وہ مشترکہ رقم سے لی گئی ہے، جسے ضرورت ہوتی ہے اس پر سوار ہوتا ہے۔ چونکہ ان آدمیوں کو مجھ پر زیادہ اعتبار ہے اس لئے وہ مجھے اپنا مکھیا سمجھتے ہیں اور میرے علم اور تجربہ کے باعث میرا دباؤ مانتے ہیں۔ جو کچھ کہتا ہوں اس کی تعمیل کرتے ہیں۔ کوئی یہ محسوس نہیں کرتا کہ میں کسی کا نوکر ہوں۔ سب کے سب ساجھے دار ہیں۔ اس لئے سب جان توڑ کر محنت کرتے ہیں اور کامل ایمانداری کے ساتھ۔ جب ایک شخص مالک اور دوسرا اسکا نوکر ہوتا ہے تو فوراً رقابت شروع ہو جاتی ہے۔ مالک چاہتا ہے کہ میں اس محنت سے زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کروں۔ نوکر چاہتا ہے کہ میں کم سے کم کام .... کروں۔ ان کے درمیان ذرا بھی ہمدردی یا برادرانہ تعلق نہیں ہوتا۔ دونوں ایک دوسرے کے دشمن ہوتے ہیں۔ کام چھوٹا ہو یا بڑا۔ اس رقیبانہ کشمکش کا نتیجہ برا ہوتا ہے۔ اس نے دنیا میں دولت اور افلاس کے دو جدا جدا فرقے قائم کر دئے ہیں اور ان میں خونریز جنگ ہو رہی ہے۔ مگر قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ رقابت کا دَور اب نزع کی حالت میں ہے اسکی جگہ اب باہمی امداد اور ہمدردی کا دور شروع ہونے والا ہے۔ میں نے دوسرے ملکوں میں رقابت کے نظارے خوب دیکھے ہیں اور ان سے سیر ہو گیا۔ باہمی امداد میں نجات کی صورت نظر آتی ہے۔ اب ہمیں زبردستی کو خیرباد کہہ کر ایثار سے کام لینا پڑیگا۔

عرفان علی۔ تو یہ کہیئے کہ آپ سوشلسٹ ہیں۔

پریم شنکر۔ جی نہیں میں سوشلسٹ یا ڈیموکریٹ کچھ نہیں ہوں۔ میں صرف حق اور انصاف کا خادم ہوں۔ میں اخلاق کو علم سے بالاتر سمجھتا ہوں۔ علم اور ذہانت۔ فہم اور فراست یا دیگر ذہنی اور دماغی اوصاف کو ہوس اور زرپرستی کا غلام نہیں بنانا چاہتا۔ مجھے موجودہ تعلیم اور تہذیب پر مطلق اعتماد نہیں ہے۔ علم کا کام ہے، تہذیب اخلاق اور تہذیب اخلاق کا نتیجہ فیاضی۔ فراخدلی۔ ایثار۔ بےنفسی۔ ہمدردی۔ غریب دوستی اور انصاف پسندی ہے۔ وہ تعلیم جو ہمیں ثروت و جاہ کا غلام بنا دے، جو ہمیں

اور دلیری سے انکار کرتا ہے کہ اس کا منہ تکتے رہ جایئے۔ آپ کو تو کبھی چرکا نہیں دیا؟

پریم شنکر۔ جی مطلق نہیں۔ مجھے اس نے شکایت کا کبھی موقع نہیں دیا۔ یہاں تو خوب محنت کرتا ہے۔ یہانتک کہ دوپہر کی چھٹی میں بھی آرام نہیں کرتا۔ مجھے تو اس پر اتنا بھروسہ ہو گیا ہے کہ سبزی پھل۔ پودے۔ بیج سب اسی کے ہاتھوں میں چھوڑ دئے ہیں سال بھر میں جو کچھ آمدنی ہوتی ہے وہ شام کو مجھے دے دیتا ہے اور کبھی ایک پائی کا بھی فرق نہیں ہوتا +

عرفان علی۔ جناب یہی تو اس کی مشاقی کی تعریف ہے کہ آپ کو اُلٹے استرے سے مونڈے اور آپکو مطلق خبر نہ ہو۔ آپ اسے کیا تنخواہ دیتے ہیں؟

پریم شنکر۔ یہاں کسی کو تنخواہ نہیں دی جاتی۔ سب آدمی نفع میں برابر شریک ہوتے ہیں۔ مہینہ میں ضروری اخراجات نکالنے کے بعد جو کچھ آمدنی ہوتی ہے اس پر دس فی صدی کار خیر کے لئے الگ کر لیا جاتا ہے۔ باقی روپے برابر تقسیم کر دئے جاتے ہیں۔ پچھلے ماہ ایک سو چالیس روپیہ کی آمدنی ہوئی تھی۔ مجھے ملا کر کل سات آدمی ہیں۔ ہر ایک کے حصہ میں بیس بیس روپے آئے تھے۔ اب کی ماہ میں جوار ہو گئی ہے۔ امرود اچھے آئے ہیں۔ زیادہ آمدنی کی امید ہے۔

عرفان علی نے تعجب سے پوچھا۔ کیا آپ اس قدر قلیل آمدنی پر بسر کر لیتے ہیں۔؟

پریم شنکر۔ جی ہاں! بہت آسانی سے۔ میں ان مصنوعی ضروریات کا پابند نہیں ہوں۔ جسے آجکل داخل تہذیب سمجھا جاتا ہے۔ میں وہی کپڑے پہنتا ہوں وہی کھانا کھاتا ہوں۔ اور اسی طرح رہتا ہوں۔ زیادہ کی ضرورت ہی کیوں ہو؟ دس بیس روپیہ ماہوار دیانت کا صرفہ ہے جو غربا کو تقسیم کی جاتی ہیں۔ یہ رقم مشترکہ آمدنی سے وضع کی جاتی ہے اور سب کے سب آدمی اس ثواب میں شریک ہوتے ہیں۔ سائیکل جو آپ کو نظر

اگر درگا اس وقت پھٹے حال۔ رونی صورت بنائے نظر آتا۔ اور انہیں دیکھتے ہی ان کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو جاتا۔ تو شاید ڈاکٹر صاحب کو اس پر رحم آجاتا۔ وہ اسے غالباً کچھ انعام دیتے۔ اور پریم شنکر سے اس کی نسبت چند کلمات خیر کہنے کی تکلیف گوارا کرتے ۔ وہ خاصتہً نیک آدمی تھے اور اپنے ملازموں سے مہربانی کے ساتھ پیش آتے تھے۔ مگر ان کی اس مہربانی اور اس التفات میں مطلق فرق نہ تھا۔ جو انہیں اپنے کتوں یا گھوڑوں کے ساتھ تھی۔ اس مہربانی کی بنیاد انصاف پر نہیں، رحم پر تھی۔ درگا نے انہیں دیکھا۔ کنوئیں پر کھڑے کھڑے ادب سے سلام کیا۔ اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ اس کی یہ خودداری ڈاکٹر صاحب کے جگر میں کانٹے کی طرح چبھی۔ انہیں اس خیال سے غصہ آیا کہ میرے یہاں سے نکلنا اس کے حق میں اکسیر ہو گیا۔ پریم شنکر جونہی ان سے مصافحہ کر کے انہیں چند نئے تختوں کی طرف لے چلے تو ڈاکٹر صاحب نے پوچھا "یہ آدمی آپ کے یہاں کتنے دنوں سے ہے"؟

پریم شنکر۔ چار پانچ مہینے ہوئے ہونگے۔

عرفان علی۔ کچھ نوچ کھسوٹ تو نہیں کرتا۔ اس سے پہلے یہ میرے یہاں مالی تھا۔ اس کی دست درازیوں سے تنگ آکر میں نے اسے نکال دیا تھا۔ کبھی پھول توڑ کر بیچ لیتا۔ کبھی پودے اکھاڑ لے جاتا۔ اور پھلوں کا تو ذکر ہی کیا۔ ایک بار میں نے چند احباب کی دعوت کی تھی۔ ملیح آبادی سفیدہ خوب پھلا ہوا تھا۔ جب سب لوگ آکر بیٹھ گئے اور میں درخت کے پاس گیا۔ تو سارے پھل غائب۔ کچھ نہ پوچھئے۔ اس وقت کتنی خفت ہوئی۔ میں نے اسی وقت ان حضرت کو دھتکار بتائی۔ بڑا ہی دغاباز بدنیت آدمی ہے۔ اور ایسا شاطر کہ اسے گرفتار کرنا محال ہے۔ کوئی وکیل ہی جیسا کائیاں آدمی ہو۔ تو اسے پکڑ سکتا ہے۔ ایسی صفائی

کچھ نرمی کی جانب مائل کر دیا تھا۔ مگر ایسے بدنیت شخص کو اپنے یہاں رکھنا غیر ممکن تھا۔ انہوں نے اسی دم درگا کو معزول کر دیا۔ اور اس کی باقی تنخواہ جرمانہ میں ضبط کر لی۔

(۳)

کئی ماہ گذرنے کے بعد ایک روز ڈاکٹر عرفان علی مسٹر پریم شنکر کے باغیچہ کی سیر کرنے گئے۔ وہاں سے چند اچھی اچھی قلمیں لانے کا ارادہ تھا۔ پریم شنکر کو بھی باغبانی کا شوق تھا۔ اور دونوں آدمیوں کے درمیان یہی ایک مناسبت تھی۔ ورنہ دونوں بالکل متضاد تھے۔ پریم شنکر قناعت پسند۔ سادہ مزاج۔ غریب دوست آدمی تھے۔ وہ کئی سال امریکہ رہ چکے تھے۔ وہاں زراعت اور فلاحت کی تعلیم حاصل کی تھی۔ اور اب یہاں آکر اسی فن کو ذریعہ معاش بنا لیا تھا۔ انسانی خاصہ اور موجودہ نظام معاشرت کے متعلق ان کے عجیب خیالات تھے۔ جن کے باعث شہر کے مہذب طبقہ کے لوگ انہیں مراقی فاترالعقل سمجھتے تھے۔ ان کے خیالات سے لوگوں کو ایک قسم کی فلسفیانہ ہمدردی ضرور تھی۔ مگر اس میں لوگوں کو شک تھا کہ ان پر عمل بھی کیا جا سکتا ہے۔ یہ عمل کی دُنیا ہے۔ فلسفہ کی دُنیا نہیں ہے۔ یہاں فلسفہ ہمیشہ فلسفہ ہی رہے گا۔ اُسے واقعات زندگی سے کوئی علاقہ نہیں۔ ڈاکٹر صاحب باغیچہ میں داخل ہوئے تو پریم شنکر کو کیاریاں سینچتے ہوئے پایا۔ کنوئیں پر ایک سفید پوش آدمی کھڑا پمپ سے پانی نکال رہا تھا۔ وہ درگا مالی تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے دل میں اس وقت درگا کی جانب سے ایک لبغض للہ سا پیدا ہوا۔ جس شخص کو انہوں نے سزا دے کر اپنے یہاں سے علیحدہ کر دیا تھا۔ اسے اس قدر خوش باش ہونے کا کیا حق تھا

کام ہی نہیں کیا۔ تب مجھ پر کسم کیا پڑے گی؟

عرفان علی۔ باتیں نہ بناؤ۔ جا کر پانی لاؤ۔

ڈاکٹر صاحب قیافہ شناس آدمی تھے۔ رات دن مجرموں سے سابقہ رہتا تھا۔ ورگا اگرچہ زبان سے دلیرانہ باتیں کر رہا تھا۔ پر اس کے دل میں خوف سمایا ہوا تھا۔ وہ اپنے جھونپڑے میں آیا۔ لیکن لوٹے میں پانی لے کر پھر جانے کی اس کی ہمت نہ ہوئی۔ اس کے ہاتھ تھرتھرانے لگے۔ کئی ایسے واقعے یاد آ گئے۔ جب کہ جھوٹی گنگا اٹھانے والوں پر آسمانی بلائیں نازل ہو گئی تھیں بھگوان کے حاضر و ناظر ہونے کا ایسا یقین آج تک اُسے نہ ہوا تھا۔ اُس نے فیصلہ کیا کہ میں جھوٹی گنگا نہ اٹھاؤں گا۔ یہی ہو گا نا۔ کہ برخاست ہو جاؤں گا۔ کچھ جرمانہ ہو جائے گا۔ یہ منظور ہے۔ نوکری بھی کہیں نہ کہیں مل ہی جائے گی اور نوکری بھی نہ ملے۔ تو مزدوری تو کہیں نہیں گئی ہے۔ کدال بھی چلاؤں گا تو چار پانچ آنے روز پا جاؤں گا۔

وہ آہستہ آہستہ خالی ہاتھ ڈاکٹر صاحب کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔

ڈاکٹر صاحب نے تند لہجہ میں کہا۔ "پانی لاؤ"۔

ورگا۔ میں گنگا نہ اٹھاؤں گا۔

ڈاکٹر۔ تو ثابت ہو گیا کہ تم نے ضرور آم توڑے۔

ورگا۔ اب سرکار جو چاہیں سمجھیں۔ مان لیجئے میں نے ہی توڑ لئے تو آپ کا غلام ہوں۔ رات دن تابے داری کرتا ہوں۔ بال بچے آموں کے لئے روئیں تو کہاں جاؤں۔ اب کے جان بخشی کی جائے۔ پھر ایسی خطا نہ ہو گی۔

ڈاکٹر صاحب اتنے فیاض نہ تھے۔ انہوں نے یہی احسان کیا کہ ورگا کو پولیس کے سپرد نہ کیا۔ اور نہ اسے ہنٹر لگائے۔ اس کے مذہبی اعتقاد نے انہیں

دیکھ کر کہا۔ ہجور ابھی میں بجار گیا ہوں تو آم جوں کے توں تھے۔ اتنی دیر میں کوئی توڑ لے گیا ہو۔ تو میں نہیں کہہ سکتا۔"

عرفان علی۔ تمہارا کس پر شبہ ہے؟

مالی۔ ہجور اب میں کسے بتاؤں؟ اتنے نوکر چاکر ہیں۔ نہ جانے کس کی نیت بگڑی ہو۔

عرفان علی۔ مگر میرا شبہ تمہارے ہی اوپر ہے۔ اگر توڑ کر رکھے ہوں۔ تو لاکر دے دو۔ یا صاف صاف کہہ دو۔ کہ میں نے توڑے ہیں۔ ورنہ میں بری طرح پیش آؤں گا۔

چور محض سزا سے نہیں بچنا چاہتا۔ وہ بدنامی سے بھی بچنا چاہتا ہے۔ وہ سزا سے اتنا نہیں ڈرتا۔ جتنا بدنامی سے۔ جب اسے سزا سے بچنے کی ساری امید منقطع ہو جاتی ہے۔ اس وقت بھی وہ اپنے جرم کا اقبال نہیں کرتا۔ درگا اس وقت اپنے فعل کا اعتراف کر کے سزا سے بچ سکتا تھا۔ پر اس نے کہا۔ "ہجور مالک ہیں۔ جو چاہیں کریں۔ پر میں نے آم نہیں توڑے۔ سرکار ہی بتا دیں کہ اتنے دن آپ کی تابے داری کرتے ہو گئے۔ کبھی ایک ٹہنی بھی چھوئی ہے؟"

عرفان علی۔ "تم قسم کھا سکتے ہو"؟

درگا۔ ہجور گنگا کی کسم جو میں نے آموں میں ہاتھ بھی لگایا ہو۔

عرفان علی۔ اس قسم کی سند نہیں۔ تم لوٹے میں پانی لاؤ۔ اس میں تلسی کے پتے رکھو۔ اور تب قسم کھا کر کہو۔ کہ اگر میں نے آم توڑے ہوں تو میرا لڑکا میرے کام نہ آئے۔ تب مجھے تمہارے اوپر اعتماد ہو گا۔

درگا۔ ہجور سانچ کو آنچ کیا۔ جیسے کہئے کسم کھا جاؤں۔ جب میں نے

راہ لی۔ انہیں ڈاکٹر صاحب کے نقصان عظیم کا مطلق احساس نہ ہوا۔ مگر ڈاکٹر صاحب وہیں حوض کے کنارے ڈنڈا ہاتھ میں لئے مالی کے انتظار میں قطب ازجانمے جلبند بنے بیٹھے رہے۔

(۲)

درگا شام کو بازار سے لوٹا۔ وہ چوکنی نظروں سے اِدھر اُدھر تاکتا آتا تھا۔ جونہی اس نے ڈاکٹر کو حوض کے کنارے ڈنڈا ہاتھ میں لئے بیٹھے دیکھا۔ اس کے ہوش اُڑ گئے۔ سمجھ گیا۔ کہ چوری پکڑ لی گئی۔ اس خوف سے آج اس نے آنے میں عمداً دیر کی تھی۔ اس نے سمجھا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کہیں سیر کرنے گئے ہونگے میں کٹھل کے درخت کے نیچے اپنے جھونپڑے میں چپکے سے جا بیٹھوں گا۔ صبح کو پوچھ پاچھ ہوئی بھی تو مجھے صفائی دینے کا موقعہ رہے گا۔ سرکار میری تلاشی لے لیں۔ اس طرح معاملہ دب جائے گا۔ چور وقت کو اپنی برئیت کی بہترین دلیل سمجھتا ہے۔ ایک ایک لمحہ اسے دلیر بناتا جاتا ہے۔ لیکن رنگے ہوئے ہاتھوں پکڑے جانا۔ اس کے لئے قہر ہے۔ وہ بے زبان ہو جاتا ہے۔ اس کی سینہ زوری سلب ہو جاتی ہے۔ خون کے سوکھے رنگ کے داغ بن سکتے ہیں۔ لیکن تازہ خون آپ ہی آپ پکارتا ہے۔ اس میں زبان ہوتی ہے۔ درگا کے پیر تھم گئے۔ سینہ دھڑکنے لگا۔ ڈاکٹر صاحب کی نگاہ اس پر پڑ گئی تھی۔ اب واپسی کا ارادہ بے کار تھا۔ ڈاکٹر صاحب دور سے دیکھتے ہی اُٹھے کہ چل کر خوب مرمت کروں۔ لیکن بیرسٹر تھے۔ خیال آگیا کہ اس کا بیان لینا ضروری ہے۔ اشارہ سے قریب بلایا۔ اور پوچھا "سفیدہ میں کئی پھل لگے ہوئے تھے۔ ان میں ایک بھی نظر نہیں آتا۔ کیا ہوئے؟ درگا نے معصومانہ انداز سے

کر سکتا۔ ایسے خوش ذائقہ۔ خوش رنگ۔ خوشنما پھل میں نے اپنی زندگی میں نہ دیکھے تھے۔ ان کے یوں تلف ہونے کا مجھے بے انتہا قلق ہے۔"

یہ کہتے ہوئے وہ ایک انداز شہادت سے کرسی پر بیٹھ گئے۔ احباب نے کہا "جناب آپ ہم لوگوں کی تکلیف کا خیال نہ فرمائیں۔ وہ نہ سہی۔ دوسرے پھل سہی"۔ ایک رنگین طبع صاحب بولے "جناب مجھے تو سب آم ایک ہی سے لگتے ہیں۔ سفیدے۔ موہن بھوگ۔ لنگڑے۔ بمبئی۔ فجری۔ سہری۔ اس میں کوئی فرق نہیں معلوم ہوتا۔ معلوم نہیں کیونکر آپ لوگوں کو ان کی لذتوں میں امتیاز معلوم ہوتا ہے۔"

دوسرے صاحب نے فرمایا "یہاں بھی وہی کیفیت ہے۔ اس وقت جو موجود ہوں وہی منگوائیے! جو گئے۔ ان کا افسوس بے سود ہے۔"

عرفان علی۔ حضنت آموں کی کیا کمی ہے۔ سارا باغ بھرا ہوا ہے۔ خوب شوق سے کھائیے۔ مگر وہ لطافت اور نزاکت کہاں؟ آپ کو یقین نہ آئے گا۔ واللہ سفیدوں پر ایسا نکھار تھا کہ بالکل سیب معلوم ہوتے تھے۔ سیب خوشنما ضرور ہوتا ہے۔ مگر اس میں وہ رغبت انگیز لطافت کہاں؟ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شجر آرزو میں وصال کے پھل لگے ہوئے ہیں۔ واللہ سخت افسوس ہے۔ کمال افسوس ہے۔ اس مالی نے آج وہ حرکت کی ہے کہ جی چاہتا ہے۔ نمک حرام کو گولی مار دوں۔ اس وقت سامنے آجائے۔ تو آدھ موا کر دوں" (مسکرا کر) اگر خدانخواستہ کل مجھ پر ضرب شدید کا کوئی استغاثہ ہو۔ تو آپ لوگ شاہد رہئے گا کہ مجھے کس قدر روحانی اشتعال ہوا ہے۔

مالی کا پتہ نہ تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے سائیس سے آم تڑوائے۔ دوستوں نے آم کھائے۔ دودھ پیا۔ ڈاکٹر صاحب کا شکریہ ادا کرکے اپنے اپنے گھر کی

ذائقہ سے محروم کردینگے۔

شام کا وقت تھا۔ چیت کا مہینہ۔ احباب باغیچہ میں آکر حوض کے کنارے کرسیوں پر بیٹھے برف اور دودھ کا انتظام پہلے ہی سے کرلیا گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب پہلے پھلوں کو درخت میں لگے ہوئے دکھلا کر تب انہیں تڑوانا چاہتے تھے۔ تاکہ کسی کو یہ شک کرنے کا موقع نہ ملے۔ کہ پھل اس باغ کے نہیں ہیں۔ جب سب حضرات جمع ہو گئے۔ تو انہوں نے کہا "آپ لوگوں کو تکلیف تو ہوگی۔ مگر ذرا چل کر پھلوں کو درخت میں لٹکے ہوئے ملاحظہ فرمایئے۔ کتنے خوشنما معلوم ہوتے ہیں۔ گلاب میں بھی ایسی دلاویز سرخی نہ ہوگی۔ رنگ سے ملاحت ٹپکی پڑتی ہے۔ ان کی رنگت اور صورت اس درجہ رغبت انگیز ہے کہ تعریف نہیں ہوسکتی۔ میں نے یہ قلم خاص ملیح آباد سے منگوایا تھا اور اس کی خاص طور پر نگہداشت کی گئی ہے۔"

احباب اٹھے۔ ڈاکٹر صاحب میزبان کی حیثیت سے آگے آگے چلے۔ روشوں کے دونوں طرف گلاب کے تختے تھے۔ ان کی بہار دکھلاتے ہوئے وہ بالآخر سفیدہ کے درخت کے سامنے آ گئے۔ مگر وہاں ایک پھل بھی نہ تھا۔ انہوں نے خیال کیا۔ شاید یہ درخت نہیں ہے۔ دو قدم اور آگے چلے۔ دوسرا درخت مل گیا۔ اور آگے بڑھے۔ کٹھل کا درخت آ گیا۔ پھر پیچھے لوٹے اور تعجب کرتے ہوئے سفیدہ کے درخت کے سامنے رک گئے۔ پھل کیا ہوئے؟ درخت تو یہی ہے۔ اس میں مطلق شبہ نہیں۔ مگر پھل کہاں گئے؟ دوستوں کی طرف خشا وارانہ انداز سے دیکھا۔ اور معافی طلب لہجہ میں بولے "ضرور مالی کی شرارت ہے۔ دیکھئے میں کم بخت کو ابھی بلاتا ہوں۔ میں حد درجہ نادم ہوں کہ آپ صاحبوں کو ناحق تکلیف ہوئی۔ واللہ مجھے اس وقت جتنا ملال ہے۔ اس کا اظہار نہیں

آتا تھا۔ اس نے کئی بار ڈاکٹر صاحب سے اضافہ تنخواہ کی التجا کی تھی۔ مگر ڈاکٹر صاحب کے ذہن میں اضافہ کی کوئی معقول وجہ نہ آتی تھی۔ وہ صاف کہہ دیا کرتے تھے۔ ”بھئی میں تمہیں جبراً تو نہیں روکتا۔ تمہارا یہاں نباہ نہیں ہوتا۔ کہیں اور تلاش کرو۔ میرے لئے مالیوں کا قحط نہیں ہے“۔ درگاہی میں اتنی جرأت نہ تھی کہ وہ لگا ہوا روزگار چھوڑ کر دوسری نوکری ڈھونڈنے نکلتا۔ اس سے زیادہ تنخواہ ملنے کی اسے امید بھی کم تھی۔ اس لئے قہر درویش برجانِ درویش پڑا دن کاٹتا تھا۔ اور اپنی تقدیر کو روتا تھا۔

ڈاکٹر صاحب کو باغبانی کا خاص ذوق تھا۔ انواع و اقسام کے پھول پتے لگا رکھے تھے۔ اچھے اچھے پھلوں کے درخت ملیح آباد۔ سہارن پور۔ دربھنگہ وغیرہ مقامات سے منگوا کر لگائے تھے۔ درختوں کو پھل سے لدا ہوا دیکھ کر انہیں دلی مسرت ہوتی تھی۔ اپنے احباب کے یہاں اکثر گلدستے اور سبزیاں وغیرہ تحفتہً بھجواتے رہتے تھے۔ انہیں خود کھانے کا شوق نہ تھا۔ مگر کھلانے میں انہیں خاص لطف آتا تھا۔ ہر ایک پھل کے موسم میں دوستوں کی دعوت اشمار کرتے۔ پکنک پارٹیاں۔ ان کے مشغلہ تفریح کا ایک خاص جزو تھیں۔

ایک بار گرمیوں میں انہوں نے اپنے کئی ہم مشرب دوستوں کو آم کی دعوت دی۔ ایک ملیح آبادی سفیدے میں کئی پھل لگے ہوئے تھے۔ انہیں وہ روزانہ چہل قدمی کرتے ہوئے دیکھا کرتے تھے۔ اس خیال سے انہیں وہی خوشی ہوتی تھی۔ جو کسی پہلوان کو اپنے پٹھوں کے کرتب دکھانے سے ہوتی ہے۔ اتنے بڑے خوش رنگ پھل خود ان کی نگاہ سے کبھی نہ گزرے تھے۔ پھلوں کی شیرینی کا انہیں اتنا کامل یقین تھا کہ وہ چکھ کر اپنا اطمینان کرنا ضروری نہ سمجھتے تھے۔ بالخصوص اس لئے کہ اس خود پرورری سے وہ اپنے کسی ایک دوست کو لطف

اِصلاح

(۱)

درگا مالی ڈاکٹر عرفان علی بار ایٹ لا کے یہاں نوکر تھا۔ پانچ روپیہ تنخواہ تھی۔ گھر میں بیوی کے علاوہ دو تین چھوٹے بچے تھے۔ بیوی پڑوسیوں کے لیے گیہوں پیس دیا کرتی تھی۔ دو بچے جو ذرا ذی شعور تھے اِدھر اُدھر سے لکڑیاں اُپلے وغیرہ چُن لاتے تھے۔ مگر تاہم ان کی بڑی تکلیف سے بسر ہوتی تھی۔ درگا ڈاکٹر صاحب کی نظر بچا کر باغیچہ سے پھول چُن لیا کرتا۔ اور بازار میں پجاریوں کے ہاتھ بیچ دیتا تھا۔ کبھی کبھی اس کا دست غنیمت پھلوں پر بھی جا پڑتا تھا۔ یہ اس کی بالائی آمدنی تھی۔ اس سے روزانہ نمک تیل کا خرچ نکل

ہوئے صرف چار دن گزرے تھے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ برسوں کے بعد آئی ہوں۔ در و دیوار پر حسرت چھائی ہوئی تھی۔ میں نے گھر میں قدم رکھا۔ تو بے اختیار سعید کی متبسم صورت آنکھوں کے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔ وہی مردانہ حسن۔ وہی بانکپن۔ وہی نگاہ التجا۔ بے اختیار آنکھیں بھر آئیں۔ اور دل سے ایک آہ سرد نکل آئی۔ غم اس کا نہ تھا کہ سعید نے کیوں جان دے دی۔ نہیں اس کی مجرمانہ بے حسی اور مردانہ حسن پرستی کو میں قیامت تک نہ معاف کروں گی۔ غم یہ تھا کہ یہ سودا اس کے سر میں کیوں سمایا۔ اس وقت دل کی جو کیفیت ہے۔ اس سے قیاس کرتی ہوں کہ چند دنوں میں سعید کی بیوفائی اور بے رحمی کا زخم بھر جائے گا۔ اپنی ذلت کی یاد بھی شاید مٹ جائے۔ مگر اس کی چند روزہ محبت کا نقش باقی رہے گا۔ اور اب یہی میری زندگی کا سہارا ہے ۔۔

تھے۔ لطف اٹھانے کے لئے نہیں۔ حسینوں کو سنانے کے لئے۔ روئے سخن دوسری طرف تھا۔ نگاہ کسی دوسری طرف۔ بس بھانڈوں اور نقالوں کی مجلس تھی۔

دفعتہً سعید کی فٹن نظر آئی۔ میں اس پر بارہا سیر کر چکی تھی۔ سعید پر لطف لباس پہنے۔ اکڑا ہوا بیٹھا تھا۔ ایسا خوش وضع۔ ایسا بانکا وجیہہ جوان سارے شہر میں نہ تھا۔ بشرہ سے مردانہ پن برستا تھا۔ اس کی نگاہ ایک بار میرے بالاخانہ کی طرف اٹھی۔ اور نیچے جھک گئی۔ اس کے چہرے پر مُردنی سی چھا گئی۔ جیسے زہریلے سانپ نے کاٹ کھایا ہو۔ اس نے کوچبان سے کچھ کہا۔ دم زدن میں فٹن ہوا ہو گئی۔ اس وقت اسے دیکھ کر مجھے جو حاسدانہ مسرت ہوئی۔ اس کے سامنے اس دردِ جان گزا کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ میں نے ذلیل ہو کر اُسے ذلیل کر دیا۔ یہ کٹار مچھیوں سے کہیں زیادہ تیز تھی۔ اس کی جرأت نہ تھی کہ اب مجھ سے آنکھ ملا سکے۔ نہیں۔ میں نے اسے محبوس کر دیا۔ اسے قیدِ عمر میں ڈال دیا۔ اس قیدِ تنہائی سے اب اس کا نکلنا غیر ممکن تھا۔ کیونکہ اسے اپنی خاندانی وجاہت کا غرور تھا۔

دوسرے دن علی الصباح خبر ملی۔ کہ کسی قاتل نے مرزا سعید کا کام تمام کر دیا۔ اس کی لاش اسی باغیچہ کے گول کمرہ میں ملی۔ سینہ میں گولی لگ گئی تھی۔ نو بجے دوسری خبر سنائی دی۔ زرینہ کو بھی کسی نے رات کے وقت قتل کر ڈالا تھا۔ اس کا سر تن سے جدا کر دیا گیا تھا۔ بعد کو تحقیقات سے معلوم ہوا کہ یہ دونوں وارداتیں سعید ہی کے ہاتھوں وقوع میں آئیں۔ اس نے پہلے زرینہ کو اس کے مکان پر قتل کیا۔ اور تب اپنے گھر آ کر اپنے سینہ میں گولی ماری۔ اس مردانہ غیرت مندی نے سعید کی محبت میرے دل میں تازہ کر دی۔

شام کے وقت میں اپنے مکان پر پہنچ گئی۔ ابھی مجھے یہاں سے گئے

طور پر سعید سے اخلاقی انتقام لینے پر آمادہ ہوگئی ۔ رات بھر میں وہیں پڑی کبھی درد سے کراہتی اور کبھی انہیں خیالات میں الجھتی رہی ۔ یہ مہلک ارادہ لمحہ بہ لمحہ اور بھی مضبوط ہوتا جاتا تھا ۔ گھر میں میری کسی نے خبر نہ لی ۔ پو پھٹتے ہی میں باغیچہ سے باہر نکل آئی ۔ معلوم نہیں میرا حجاب کہاں غائب ہوگیا تھا جو شخص سمندر میں غوطہ کھا چکا ہو ۔ اُسے تال تلیوں کا کیا خوف ؟ میں جو در و دیوار سے شرماتی تھی ۔ اس وقت شہر کی گلیوں میں بے حجابانہ چلی جا رہی تھی ۔ اور کہاں ؟ وہیں جہاں ذلت کی قدر ہے ۔ جہاں کسی پر کوئی ہنسنے والا نہیں جہاں رسوائی کا بازار آراستہ ہے ۔ جہاں حیا بکتی ہے اور شرم لٹتی ہے!

اس کے تیسرے دن بازار حُسن کے ایک نمایاں حصہ میں ایک اونچے بالاخانہ پر بیٹھی ہوئی میں بازار کی سیر کر رہی تھی ۔ شام کا وقت تھا ۔ نیچے سڑک پر آدمیوں کا ایسا ہجوم تھا کہ شانے سے شانہ چھلتا تھا ۔ آج ساون کا میلہ تھا ۔ لوگ صاف ستھرے کپڑے پہنے جوق جوق دریا کی طرف جا رہے تھے ۔ ہمارے بازار کی بیش قیمت جنس بھی دریا کے کنارے آراستہ تھی ۔ کہیں حسینوں کے جھولے تھے ۔ کہیں ساون کے گیت ۔ لیکن مجھے اس بازار کی سیر کنار دریا سے پرلطف معلوم ہوتی تھی ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شہر کی اور سب شاہراہیں بند ہوگئی ہیں ۔ صرف یہی تنگ گلی کھلی ہوئی ہے ۔ اور سب کی نگاہیں بالاخانوں ہی کی طرف لگی تھیں ۔ گویا وہ زمین پر نہیں چل رہے ہیں ۔ ہوا میں اڑنا چاہتے ہیں ۔ ہاں تعلیم یافتہ آدمیوں کو میں نے اتنا بے باک نہیں پایا ۔ وہ بھی گھورتے تھے مگر کنکھیوں سے ۔ ادھیڑ عمر کے لوگ سب سے زیادہ بے باک معلوم ہوتے تھے ۔ شاید اُن کی منشاء جوش جوانی کی نمود تھی ۔ بازار کیا تھا ۔ ایک وسیع تھیٹر تھا ۔ لوگ بذلہ سنجیاں کرتے

(۴)

مجھے یوں خوار و تباہ کر کے تینوں ارواح خبیثہ وہاں سے رخصت ہو گئیں۔ سعید کے ملازم نے چلتے وقت میری رسّیاں کھول دیں۔ لیکن میں کہاں جاتی؟ اس گھر میں کیونکر قدم رکھتی۔

میرا سارا جسم ناسور ہو رہا تھا۔ لیکن دل کے آبلے اس سے کہیں جاں گزا تھے۔ سارا دل آبلوں سے پُر ہو گیا تھا۔ جذبات حسنہ کی جگہ بھی باقی نہ رہی تھی۔ اس وقت میں کسی اندھے کو کنوئیں میں گرتے دیکھتی تو مجھے ہنسی آتی۔ کسی یتیم کا گریہ دردناک سنتی۔ تو اس کا منہ چڑاتی۔ دل کی حالت میں ایک زبردست انقلاب ہو گیا تھا۔ مجھے غصہ نہ تھا۔ غم نہ تھا۔ موت کی آرزو نہ تھی۔ یہاں تک کہ جذبۂ انتقام بھی نہ تھا۔ اس انتہا کی ذلت نے انتقام کی خواہش کو بھی فنا کر دیا تھا۔ حالانکہ میں چاہتی تو قانوناً سعید کو شکنجہ میں لا سکتی تھی۔ لیکن یہ بے حرمتی۔ یہ بے آبروئی یہ پامالی انتقام کے دائرہ اثر سے خارج تھی۔ بس صرف ایک حس باقی تھا۔ اور وہ حسِّ ذلت تھا۔ میں ہمیشہ کے لئے ذلیل ہو گئی۔ کیا یہ داغ کسی طرح مٹ سکتا تھا؟ ہرگز نہیں۔ ہاں وہ چھپایا جا سکتا تھا۔ اور اس کی ایک ہی صورت تھی کہ ذلت کے قعرِ سیاہ میں گر پڑوں۔ تاکہ سارے پیرہن کی سیاہی اس داغ سیاہ کو چھپا دے۔ کیا اس گھر سے بیابان اچھا نہیں جس کی دیواریں مسمار ہو گئی ہوں۔ اس کشتی سے کیا سطح آب اچھی نہیں۔ جس کے پیندے میں ایک بڑا شگاف ہو گیا ہو؟ اس حالت میں یہی دلیل مجھ پر غالب آئی۔ میں نے اپنی تباہی کو اور بھی مکمل۔ اپنی ذلت کو اور بھی مرفع۔ اپنی روسیاہی کو اور بھی مطلاً کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ میں نادانستہ

پر حکم لگانے میں کتنی غلطی کرتے ہیں۔ ایسے دلفریب ظاہر کے پردہ میں اتنی شقاوت اور قساوت! کوئی شک نہیں۔ حسن قیافہ کا دشمن ہے۔ بولی: "اچھا تو اب آپ کو مجھ پر غصہ آنے لگا۔ کیوں نہ ہو۔ آخر منکوحہ بیگم ہی تو ہیں۔ میں تو حیا فروش کنبا ہی ٹھہری!"

سعید۔ تم طعنے دیتی ہو۔ اور مجھ سے یہ خون نہیں دیکھا جاتا۔

زرینہ۔ تو یہ قمچی ہاتھ میں لو۔ اور اسے پوری سو ضربیں لگاؤ۔ غصہ اتر جائے گا۔ اس کا یہی علاج ہے۔

سعید۔ پھر وہی مذاق!

زرینہ۔ نہیں میں مذاق نہیں کرتی۔

سعید نے قمچی لینے کو ہاتھ بڑھایا۔ مگر معلوم نہیں زرینہ کو کیا شبہ پیدا ہوا۔ اس نے سمجھا۔ شاید یہ قمچی کو توڑ کر پھینک دیں گے۔ قمچی ہٹالی۔ اور بولی۔ "اچھا مجھ سے یہ دغا! تو لو اب میں ہی ہاتھوں کی صفائی دکھاتی ہوں" یہ کہہ کر اس بے درد نے مجھے بے تحاشہ قمچیاں مارنا شروع کیں۔ میں کراب سے اینٹھ اینٹھ کر چیخ رہی تھی۔ اس کے پیروں پڑتی تھی۔ منتیں کرتی تھی۔ اپنے فعل پر نادم تھی۔ دعائیں دیتی تھی۔ پیر اور پیغمبر کا واسطہ دیتی تھی۔ پر اس قتالہ کو ذرا بھی رحم نہ آتا تھا۔ سعید کاٹھ کے پتلے کی طرح یہ نظارہ دردستم آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ اور اس کو جوش نہ آتا تھا۔ شاید میرا بڑے سے بڑا دشمن بھی میری گریہ وزاری پر ترس کھاتا۔ میری پیٹھ چھل کر لہولہان ہو گئی۔ زخم پڑتے تھے۔ ہر ایک ضرب آگ کے شعلے کی طرح بدن پر لگتی تھی۔ معلوم نہیں اس نے میرے کتنے دُرّے لگائے۔ یہاں تک کہ قمچی کو مجھ پر رحم آگیا۔ وہ پھٹ کر ٹوٹ گئی۔ لکڑی کا کلیجہ پھٹ گیا۔ مگر انسان کا دل نہ پگھلا۔

کی طرف چشم فریاد سے دیکھ کر نہایت عاجزی سے بولی "سعید۔ للہ۔ مجھے اس ظالم سے بچاؤ۔ میں تمہارے پیروں پڑتی ہوں۔ مجھے زہر دے دو۔ خنجر سے گردن کاٹ لو۔ لیکن یہ کرب سہنے کی مجھ میں تاب نہیں۔ ان دلجوئیوں کو یاد کرو۔ میری محبت کو یاد کرو۔ اسی کے صدقے۔ اس وقت مجھے اس عذاب سے بچاؤ۔ خدا تمہیں اس کا اجر دے گا"۔

سعید ان باتوں سے کچھ پگھلا۔ حسینہ کی طرف خائف نگاہوں سے دیکھ کر بولا "زرینہ میرے کہنے سے اب جانے دو۔ میری خاطر سے ان پر رحم کرو"۔

زرینہ تیور بدل کر بولی۔ "تمہاری خاطر سے سب کچھ کر سکتی ہوں۔ گالیاں نہیں برداشت کر سکتی"۔

سعید۔ کیا ابھی تمہارے خیال میں گالیوں کی کافی سزا نہیں ہوتی؟

زرینہ۔ تب تو آپ نے میری عزت کی خوب قدر کی۔ میں نے رانیوں سے جلیبیاں اٹھوائی ہیں۔ یہ بیگم صاحبہ ہیں۔ کس خیال میں۔ اسے اگر کند چھری سے کاٹوں۔ تب بھی ان کی بدزبانیوں کی کافی سزا نہ ہوگی۔

سعید۔ مجھ سے اب یہ ستم نہیں دیکھا جاتا۔

زرینہ۔ آنکھیں بند کر لو۔

سعید۔ زرینہ غصہ نہ دلاؤ۔ میں کہتا ہوں۔ اب انہیں معاف کرو۔

زرینہ نے سعید کو ایسی حقارت آمیز نگاہ سے دیکھا۔ گویا وہ اس کا غلام ہے۔ خدا جانے اس پر اس نے کیا منتر مار دیا تھا۔ کہ اس میں خاندانی غیرت اور وقار اور انسانی حمیت کا ذرا بھی حس باقی نہ رہا تھا۔ وہ شاید اسے غصہ جیسے مردانہ جذبہ کے قابل ہی نہ سمجھتی تھی۔ اہل قیافہ ظاہر سے باطن

دیتی ۔ تو کیا یہ نوبت نہ آتی! آتی اور ضرور آتی ۔ وہ کالی ناگن مجھے ڈسنے کا ارادہ کر کے چلی تھی ۔ اسی لئے اس نے دل آزار لہجہ میں گفتگو شروع کی تھی کہ میں غصہ میں آکر اُس کو لعن وطعن کروں ۔ اور اسے مجھے ذلیل کرنے کا بہانہ مل جائے۔

پانی زور سے برسنے لگا تھا ۔ بوچھاڑوں سے میرا سارا جسم تر ہو گیا تھا سامنے گہرا اندھیرا تھا ۔ میں کان لگائے سن رہی تھی ۔ کہ اندر کیا مسکوٹ ہو رہی ہے ۔ مگر مینہ کی سنسناہٹ کے باعث آوازیں صاف نہ سنائی دیتی تھیں ۔ اتنے میں لالٹین پھر کمرہ سے برآمدہ میں آئی ۔ اور تینوں ہیبت ناک صورتیں پھر سامنے آکر کھڑی ہو گئیں ۔ اب کی اس خونی پری کے ہاتھوں میں ایک پتلی سی قمچی تھی ۔ اس کے تیور دیکھ کر میرا خون سرد ہو گیا ۔ اس کی آنکھوں میں ایک خون آشام وحشت ۔ ایک سفاکانہ جنون نمودار تھا ۔ میری طرف شرارت آمیز نظروں سے دیکھ کر بولی "بیگم صاحبہ! میں تمہاری بدزبانیوں کا ایسا سبق دینا چاہتی ہوں ۔ جو تمہیں ساری عمر یاد رہے ۔ اور میرے مرشد نے بتلایا ہے کہ قمچی سے زیادہ دیرپا اور کوئی سبق نہیں ہوتا"۔

یہ کہہ کر اس ستم شعار نے میری پیٹھ پر ایک قمچی زور سے ماری ۔ میں تلملا گئی ۔ معلوم ہوا کہ کسی نے پیٹھ پر آگ کی چنگاری رکھ دی ۔ مجھ سے ضبط نہ ہو سکا ۔ والدین نے کبھی پھول کی چھڑی سے بھی نہ مارا تھا ۔ زور سے چیخیں مار مار کر رونے لگی ۔ خودداری کا غرور ۔ غیرت کا احساس سب غائب ہو گیا ۔ قمچی کی خوفناک اور روشن حقیقت کے سامنے سب جذبات فنا ہو گئے ان ہندو دیویوں کے جگر شاید آہن کے ہوتے ہوں گے جو اپنی آن پر آگ میں کود پڑتی تھیں ۔ میرے دل پر تو اس وقت یہی خیال مسلط تھا کہ اس عذاب سے کیونکر نجات ہو ۔ سعید خاموش صورت تصویر کھڑا تھا ۔ میں اس

کافی نہیں ۔

میں یہ باتیں کہہ ہی رہی تھی ۔ کہ یکایک سعید کے قوی ہیکل ملازم نے میری دونوں باہیں پکڑ لیں ۔ اور دم زدن میں حسینہ نے جھولے کی رسیاں اتار کر مجھے برآمدے کے ایک آہنی ستون سے باندھ دیا ۔

اس وقت میرے دل میں کیا خیالات آرہے تھے وہ یاد نہیں ۔ پر میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ تینوں انسان نہیں جہنم کے فرشتے ہیں ۔ غصہ کی جگہ دل میں ایک ہیبت سما گئی تھی ۔ اس وقت اگر کوئی غیبی طاقت میری بندشوں کو کاٹ دیتی ۔ میرے ہاتھوں میں آب دار خنجر دے دیتی ۔ تو بھی میں زمین پر بیٹھ کر اپنی ذلت اور بے کسی پر آنسو بہانے کے سوا اور کچھ نہ کر سکتی تھی ۔ مجھے خیال آتا تھا ۔ شاید خدا کی طرف سے مجھ پر یہ قہر نازل ہوا ہے ۔ شاید میری بے نمازی اور بے دینی کی یہ سزا مل رہی ہے ۔ میں اپنی گذشتہ زندگی پر نگاہ ڈال رہی تھی کہ مجھ سے کون سی خطا سرزد ہوئی ہے ۔ جس کی یہ پاداش ہے ۔

مجھے اسی حالت میں چھوڑ کر تینوں صورتیں کمرہ میں چلی گئیں ۔ میں نے سمجھا ۔ میری سزا ختم ہوئی ۔ لیکن کیا یہ سب مجھے یوں ہی بندھا رکھیں گے کنیزیں مجھے اس ہیئت کذائی میں دیکھ لیں تو کیا کہیں ؟ نہیں اب میں اس گھر میں رہنے کے قابل ہی نہیں ۔ میں سوچ رہی تھی کہ رسیاں کیونکر کھولوں ۔ مگر افسوس ! مجھے نہ معلوم تھا کہ ابھی تک میری جو گت ہوئی ہے ۔ وہ آنے والی بے رحمیوں کا صرف بیعانہ ہے ۔ میں اب تک نہ جانتی تھی کہ نوع خفیف کتنا سفاک ۔ کتنا قاتل ہے ۔ میں اپنے دل سے بحث کر رہی تھی کہ اپنی تحقیر کا الزام مجھ پر کہاں تک ہے ۔ اگر میں حسینہ کی ان جگر خراش باتوں کا جواب نہ

وہ زیادہ تر اپنے کمرے میں آرام کرسی پر لیٹے ہوئے اخبار اور کتابیں دیکھا کرتے۔ میری کچھ سمجھ میں نہ آتا۔ کہ کیا معاملہ ہے۔

ایک دن انہیں شدت سے بخار آیا۔ وہ دن بھر بے ہوش پڑے رہے لیکن مجھے ان کے پاس بیٹھتے ہوئے ایک وحشت ہوتی تھی۔ میری طبیعت ایک ناول میں لگی ہوئی تھی۔ ان کے پاس جاتی اور ایک منٹ کے بعد لوٹ آتی۔ ٹینس کا وقت آیا۔ تو میں پس وپیش میں پڑی۔ کہ جاؤں یا نہ جاؤں۔ بہت دیر تک دل میں یہی کشاکش ہوتی رہی۔ آخر میں نے فیصلہ کیا۔ میرے یہاں رہنے سے یہ اچھے تو ہوئے نہیں جاتے۔ اس لئے یہاں بیٹھے رہنا فضول ہے۔ میں نے اچھے سے اچھے کپڑے پہنے۔ اور ریکٹ لے کر کلب گھر جا پہنچی۔ وہاں میں نے مسز داس، اور مسز باگڑا سے بابو جی کا حال بیان کیا اور آنکھوں میں آنسو بھرے خاموش بیٹھی رہی۔ جب سب لوگ کورٹ میں جانے لگے اور مسٹر داس نے مجھ سے چلنے کے لئے کہا۔ تو میں ایک آہ سرد بھر کے کورٹ میں جا پہنچی اور کھیلنے میں مصروف ہو گئی۔

آج سے تین سال پہلے ایک دن اسی طرح بابو جی کو بخار آ گیا تھا۔ میں ساری رات بیٹھی انہیں پنکھا جھلتی رہی۔ ایسا جی چاہتا تھا کہ ان کے بدلے کا مجھے بخار آ جائے۔ لیکن یہ اُٹھ بیٹھیں۔ مگر اب دل نمائش کا خوگر ہو گیا تھا۔ اکیلے رونے کی قابلیت مجھ میں باقی نہ رہی تھی۔ میں حسب معمول رات کو نو بجے لوٹی۔ بابو جی کی طبیعت ہلکی تھی۔ انہوں نے مجھے صرف دبی نگاہ سے دیکھا۔ کروٹ بدل لی۔ لیکن میں لیٹی۔ تو میرا دل بہت دیر تک اس خود غرضی و خود پروری پر مجھے کوستا رہا۔

مجھے اب انگریزی ناولوں کے سمجھنے کی استعداد ہو گئی تھی۔ ہماری گفتگو زیادہ تنقید آمیز ہوتی تھی۔ ہمارا معیار تہذیب اب بدرجہا اونچا ہو گیا تھا۔ ہم کو اب اپنے طبقہ سے باہر کسی سے ملنے میں عار ہوتا تھا۔ ہم اب اپنے سے کم رتبہ۔ کم حیثیت آدمیوں سے بولنا کسر شان سمجھتے تھے۔ نوکروں سے بات کرنے میں ہمارا لہجہ بہت تحکمانہ ہوتا تھا۔ ہم انہیں اپنا نوکر سمجھتے تھے۔

اور بس۔ ہم کو ان کے ذاتی معاملات سے کوئی سروکار نہ تھا۔ ہم ان سے الگ تھلگ رہ کر ان پر اپنا رعب قائم کرنا چاہتے تھے۔ ہم چاہتے تھے کہ وہ ہم لوگوں کو صاحب سمجھیں۔ ہندوستانی عورتوں کو دیکھ کر مجھے اُن سے نفرت ہوتی تھی۔ وہ مجھے انسانیت سے گری ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ خیر بابو جی کی طبیعت دوسرے دن بھی نہ سنبھلی۔ میں کلب، نہ گئی۔ لیکن جب متواتر تین دن انہیں بخار آتا گیا۔ اور مسز داس نے مجھ سے بار بار اصرار کیا کہ ایک نرس بلا لو۔ تو میں راضی ہو گئی۔ اُس دن تیمار داری کے بار سے سبکدوش ہو کر مجھے بے حد مسرت ہوئی۔ اگرچہ دو دن میں کلب نہ گئی تھی۔ لیکن میرا دل وہیں رہتا تھا۔ بلکہ اپنی اس بزدلانہ نفس کشی پر غصّہ آتا تھا۔

ایک دن سہ پہر کے وقت میں آرام کرسی پر لیٹی ہوئی ایک انگریزی کتاب پڑھ رہی تھی۔ مجھے خیال آیا۔ کہیں بابو جی کا بخار مہلک ثابت ہوا ہو تو؟ لیکن اس خیال سے مجھے ذرا بھی دہشت نہ ہوئی۔ میں اس ملال تخیل کا مزہ اٹھانے لگی۔ مسز داس، مسز نائڈو، مسز سرلواستو، مس کھرے، مسز شرما، مس گھوش ضرور تعزیت کرنے آئیں گی۔ انہیں دیکھتے ہی میں آنکھوں میں آنسو بھرے اٹھوں گی۔ اور کہوں گی "بہنو! میں لُٹ گئی! ہاں میں لُٹ گئی۔ اب میری زندگی اندھیری رات ہے۔ یا ہولناک جنگل یا شمع مزار! لیکن میری حالت پر غم کا اظہار مت کرو۔ مجھ پر جو کچھ گزرے گی۔ میں اس کامل انسان کی نجات کے خیال سے بخوشی سہ لوں گی"۔ میں نے ایک طولانی ماتمی تقریر کا مسودہ دل میں تیار کیا۔ یہاں تک کہ میں نے اس ماتمی لباس کا بھی فیصلہ کر لیا۔ جو میں پہنے ہوئے جنازے کے ساتھ جاؤں گی اس سانحے کا سارے شہر میں چرچا ہو جائے گا۔ سارے کنٹونمنٹ کے لوگ تعزیت کے خطوط بھیجیں گے۔ تب میں اخباروں میں ایک خط چھپوا دوں گی کہ میں فرداً فرداً اپنے ہمدردوں کے تعزیت ناموں کا جواب دینے سے معذور ہوں۔ دل پارہ پارہ ہو گیا ہے۔ اُسے رونے کے سوا اور کسی کام کی فرصت نہیں ہے۔ میں اس ہمدردی کے لئے ان کی تہ دل سے مشکور ہوں اور

ان سے التجا کرتی ہوں کہ وہ مرنے والے کے حق میں دعائے مغفرت کریں۔"

میں انہی خیالات میں محو تھی۔ کہ نرس نے آکر کہا کہ آپ کو صاحب یاد کرتے ہیں۔ یہ میرے کلب جانے کا وقت تھا۔ مجھے ان کا بلانا ناگوار گزرا۔ لیکن طوعاً وکرہاً گئی۔ بابو صاحب کو بیمار ہوئے ایک ماہ کے قریب ہو گیا تھا۔ وہ بہت نحیف ہو رہے تھے۔ انہوں نے میری طرف التجا کی نگاہ سے دیکھا۔ اس میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ مجھے ان پر رحم آگیا۔ بیٹھ گئی۔ اور ہمدردانہ انداز سے بولی "کیا کروں؟ کوئی دوسرا ڈاکٹر بلاؤں؟

بابو صاحب نے آنکھیں نیچی کرکے نہایت مستمندانہ انداز سے کہا "میں یہاں ہرگز اچھا نہ ہوں گا۔ مجھے اماں کے پاس پہنچا دو۔"

میں نے کہا "کیا آپ سمجھتے ہیں کہ وہاں آپ کا علاج یہاں سے اچھا ہوگا؟"

بابو جی بولے "کیا جانے کیوں میرا جی اماں کو دیکھنے کو چاہتا ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں وہاں بلا دوا کے اچھا ہو جاؤں گا۔"

میں۔ "یہ آپ کا محض خیال ہے۔"

بابو جی "شاید خیال ہی ہو۔ لیکن میری عرض قبول کرو۔ میں اس بیماری سے نہیں اس زندگی سے بیزار ہوں۔ مجھے اب معلوم ہو رہا ہے کہ میں جس درخشاں لہراتے ہوئے تختۂ آب کی طرف دوڑا جاتا تھا۔ وہ اصل میں سراب ہے۔ وہ جھلسی ہوئی ریگ کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ میں اس معاشرت کے ظاہری لوازمات پر شیدا تھا۔ لیکن اب مجھے اس کی اصلی صورت نظر آ رہی ہے۔ ان دو سالوں میں میں نے اس باغیچے کی خوب سیر کی اور اسے اول سے آخر تک خارزار پایا۔ یہاں نہ اطمینانِ قلب ہے نہ روحانی مسرت۔ یہ ایک ہیجان ہے، ہلچل۔ ذلت۔ غلامی۔ بے رحمی۔ خود غرضی۔ ریاکاری۔ نقالی۔ خود ستائی اور تن پروری کی زندگی ہے۔ یہاں نہ اخلاق ہے نہ مذہب۔ نہ ہمدردی۔ نہ شرافت۔ پرماتما کے لئے مجھے اس آگ سے بچاؤ۔ اگر اور کچھ نہ ہو سکے تو اماں کے پاس ایک خط لکھ دو۔ وہ ضرور آئیں گی۔ اپنے بدنصیب لڑکے

کی مصیبت ان سے نہ دیکھی جائے گی۔ انہیں ابھی اس معاشرت کی ہوا نہیں لگی ہے۔ وہ مادرانہ شفقت سے بھری ہوئی نگاہ۔ ان کی محبت آمیز دل جوئی و تیمارداری میرے لئے سو دواؤں کا کام کرے گی۔ ان کے چہرے پہ وہ نور نظر آئے گا جس کے لئے میری آنکھیں ترس رہی ہیں۔ ان کے دل میں محبت ہے۔ ایمان ہے۔ عقیدت ہے۔ ان کی آغوش میں میں مر بھی جاؤں گا تو میری روح کو تسکین ہوگی۔"

میں نے سمجھا۔ یہ بخار کا ہذیان ہے۔ نرس سے بولی "ذرا ان کا ٹمپریچر تو لو۔ میں ابھی ڈاکٹر کے پاس جاتی ہوں" میرا دل ایک نامعلوم خوف سے کانپنے لگا۔ نرس نے تھرمامیٹر نکالا۔ لیکن جوں ہی وہ بابو جی کے قریب گئی۔ انہوں نے اس کے ہاتھ سے وہ آلہ چھین کر زمین پر پٹک دیا۔ اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ اور میری طرف ملامت آمیز انداز سے دیکھ کر کہا "صاف صاف کیوں نہیں کہتی ہو کہ میں کلب گھر جا رہی ہوں۔ جس کے لئے تم نے یہ لباس زیب تن کیا ہے اور گاڑی تیار کرائی ہے۔ لیکن اگر ادھر سے گھومتی ہوئی ڈاکٹر کے جاؤ۔ تو کہہ دینا۔ کہ یہاں حرارت اس نقطے پر ہے جہاں آگ لگ جاتی ہے۔"

میرا خوف اور بھی زیادہ ہو گیا اور دل پر ایک رقت سی طاری ہو گئی۔ گلا بھر آیا۔ بابو جی نے آنکھیں بند کر لی تھیں اور ان کی سانس زور سے چل رہی تھی۔ میں دروازے کی طرف چلی۔ کہ کسی کو ڈاکٹر کے پاس بھیجوں۔ یہ لتاڑ سن کر خود کیسے جاتی۔ کہ بابو جی اٹھ بیٹھے اور منت آمیز انداز سے بولے "شیاما! میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ دو ہفتوں سے ارادہ کر رہا ہوں کہ کہوں۔ لیکن ہمت نہیں پڑتی۔ پر آج میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ کہہ ہی ڈالوں۔ میں اب پھر اپنے گھر جا کر وہی پہلے کی سی زندگی بسر کرنی چاہتا ہوں۔ مجھے اب اس زندگی سے نفرت ہو گئی ہے۔ اور یہی میری بیماری کا خاص سبب ہے میرا عارضہ جسمانی نہیں روحانی ہے۔ میں پھر تمہیں وہی پہلے کی سی شرمیلی نیچا سر کر کے چلنے والی۔ پوجا کرنے والی۔ رامائن پڑھنے والی۔ گھر کے کام کاج کرنے والی۔ ایشور سے

ڈرنے والی۔ حیادار عورت دیکھنا چاہتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ تم مجھے مایوس نہ کروگی میں تمہیں سولھوں آنہ اپنا بنانا چاہتا ہوں۔ اور سولھوں آنہ تمہارا بننا چاہتا ہوں۔ مجھے معلوم ہوگیا کہ اسی سادہ۔ پاک اور بے تکلف زندگی میں میری نجات ہے۔ بولو منظور ہے؟ تم نے ہمیشہ میری باتیں مانی ہیں۔ اس وقت مایوس نہ کرنا۔ اگر تمہیں میری جان پیاری ہے تو ضرور ماننا۔ ورنہ معلوم نہیں۔ اس کوفت اور کلفت کا کیا انجام ہو۔"

میں یکایک کوئی جواب نہ دے سکی۔ سوچنے لگی۔ اس آزاد زندگی میں کتنا لطف تھا یہ دل چسپیاں وہاں کہاں؟ کیا اتنے دنوں آزادی سے ہوا میں اُڑنے کے بعد پھر اسی قفس میں جاؤں۔ وہی لونڈی بن کر رہوں؟ کیوں؟ مجھے اس وقت بابو جی سے ہمدردی نہ ہوئی۔ ان پر طبیعت جھنجلائی۔ یہ تلون طبعی کیوں؟ انہیں نے مجھے برسوں آزادی کا سبق پڑھایا۔ برسوں تک دیوتاؤں کی۔ رامائن کی۔ گنگا کی۔ پوجا پاٹ کی۔ برت کی ہجو کی ہنسی اُڑائی اور اب جب کہ میں ان باتوں کو بھول گئی انہیں وہم باطل سمجھنے لگی۔ تو پھر مجھے اس ظلمات خانے میں دھکیلنا چاہتے ہیں۔ کیوں؟ میں انہیں کی مرضی پر چلتی ہوں۔ اس دائرہ میں دوسری عورتیں جو کچھ کرتی ہیں۔ وہی میں کرتی ہوں۔ پھر شکایت کا کیا موقع؟ لیکن بابو جی کے چہرے پر ایسی ترحم انگیز لجاجت تھی کہ میں علانیہ انکار نہ کرسکی۔ بولی "آخر آپ کو یہاں کیا تکلیف ہے؟" میں ان کے دل کی بات جاننا۔ ان کے خیالات کے مخزن کا پتہ لگانا چاہتی تھی۔

بابو جی پھر اٹھ بیٹھے اور میری طرف تیز نگاہوں سے دیکھ کر بولے "بہتر ہوتا کہ تم یہ سوال مجھ سے پوچھنے کے بدلے اپنے دل سے پوچھتیں۔ کیا اب میں تمہارے لئے وہی ہوں جو آج سے تین سال قبل تھا؟ جب میں تم سے زیادہ تعلیم یافتہ۔ زیادہ سمجھ دار۔ زیادہ واقف کار ہوکر تمہارے لئے وہ نہیں رہا۔ جو پہلے تھا۔ تم نے اسے چاہے محسوس نہ کیا ہو۔ لیکن میں خود سمجھ رہا ہوں۔ تو میں یہ کیونکر باور کروں کہ وہی اثرات تمہارے دل

پر نہ غالب آ سکے ہونگے۔ نہیں۔ بلکہ علامات ظاہر کر رہی ہیں کہ تمہارے دل پہ یہ اثر اور بھی زیادہ ہوا ہے۔ تم نے اپنے تئیں نمائش تکلّف، اور خود پرستی کے بھنور میں ڈال دیا ہے اور اپنے انجام سے بالکل بے خبر ہو۔ اب مجھے معلوم ہو گیا کہ مہذب آزادی کا بھوت عورت کے کمزور دل پر زیادہ آسانی سے غالب آ سکتا ہے۔ کیا ممکن تھا کہ تین سال قبل بھی تم مجھے اس حالت میں چھوڑ کر کسی پڑوسی کے گھر گانے بجانے چلی جاتیں میں بستر پر پڑا کراہا کرتا۔ اور تم کسی کے گھر جا کر خوش گپیاں کرتیں۔ عورت کی طبیعت انتہا پسند واقع ہوئی ہے۔ لیکن اس نئی انتہا کی بہ نسبت مجھے وہ پرانی انتہا بدرجہا بہتر نظر آتی ہے۔ اُس انتہا کا نتیجہ ہے روحانی و جسمانی نشو و نما اور قلب کی صفائی۔ اس انتہا کا نتیجہ ہے۔ چھچھورا پن۔ بے شرمی۔ بے حیائی اور خود روی۔ اس وقت اگر تم مسٹر داس کے روبرو یوں بے باکی سے ہنستیں۔ تو میں یا تو تمہیں مار ڈالتا۔ یا خود زہر کھا لیتا۔ لیکن بے غیرتی اس زندگی کا خاص عنصر ہے۔ میں سب کچھ دیکھتا ہوں اور برداشت کرتا ہوں اور غالباً سہے جاتا۔ اگر اس بیماری نے میری آنکھیں نہ کھول دی ہوتیں۔ اب اگر تم یہاں بیٹھی رہو۔ تو مجھے تسکین نہ ہو گی۔ کیونکہ مجھے یہ خیال ستاتا رہے گا کہ تمہارا دل یہاں نہیں ہے۔ میں نے اپنے تئیں اس طلسم سے نکالنے کا فیصلہ کر لیا ہے جہاں دولت کا نام عزّت ہے۔ تکلّف کا نام تہذیب ہے اور نخوت کا نام شرافت! بولو منظور ہے؟"

میرے دل پر ایک بجلی سی کوند گئی۔ بابو جی کا منشا ذہن میں آ گیا۔ ابھی دل میں کچھ پرانی غیرت باقی تھی۔ بے شرمی کا الزام قوت تحمل سے باہر تھا۔ حیا کا احساس زندہ ہو گیا۔ نگاہ باطن کی طرف گئی۔ اس پر پردہ تھا۔ مگر غنیمت۔ دل نے کہا۔ بے شک! میں اب وہ نہیں ہوں۔ جو پہلے تھی۔ اس وقت یہ میری نگاہوں میں دیوتا تھے۔ میں ان کی مرضی کو مقدم سمجھتی تھی۔ اب یہ میری نگاہوں میں ایک بہت معمولی درجہ کے انسان

ہیں"۔ مسز گراس کی تصویر نگاہ کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔ آہ! کل اس ظالم کی باتوں سے میرے دل پر کیسا نشہ چھا گیا تھا۔ یہ یاد کر کے میری آنکھیں ندامت سے جھک گئیں بابو جی کے دل پر جو کچھ گزر رہی تھی۔ ان کے چہرے سے صاف عیاں تھا۔ تمام خود غرضانہ خیالات میرے دل سے محو ہو گئے۔ اور وہاں یہ الفاظ جلی حروف میں لکھے ہوئے نظر آئے "تو نے فیشن اور لباس میں ضرور ترقی کی ہے۔ تجھ میں اپنے حقوق کا احساس زیادہ ہو گیا ہے۔ تجھ میں زندگی کی مسرتوں سے حظ اٹھانے کی قابلیت زیادہ ہو گئی ہے۔ تو اب زیادہ دلیر، زیادہ مستقل مزاج۔ زیادہ با علم ہو گئی ہے۔ لیکن تیری روحانی ہستی کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ کیونکہ تو اپنے فرائض بھول گئی ہے"۔

میں نے دونوں ہاتھ جوڑے اور بابو جی کے پیروں پر گر پڑی۔ میری زبان سے ایک لفظ نہ نکلا۔ آنسو کی جھڑی لگ گئی۔

(۵)

اب میں پھر اپنے گھر پر آگئی ہوں۔ اماں جان اب میری زیادہ عزت اور خاطر کرتی ہیں بابو جی اب بہت زیادہ مطمئن نظر آتے ہیں۔ وہ اب خود بھی روزانہ سندھیا کرتے ہیں۔ مسز داس کی چٹھیاں کبھی کبھی آتی ہیں۔ ان میں الہ آبادی سوسائٹی کے متعلق اتہام آمیز افواہیں اڑ رہی ہیں۔ میں ان خطوط کا جواب تو دے دیتی ہوں۔ پر چاہتی ہوں کہ وہ نہ آتے تو اچھا ہوتا۔ وہ ان دنوں کی یاد تازہ کر دیتے ہیں۔ جنہیں میں بھول جانا چاہتی ہوں۔

کل بابو جی نے بہت سی پرانی ردی جلائی۔ ان میں اسلی زولا اور آسکر وائلڈ کی کئی کتابیں تھیں۔ وہ اب انگریزی کتابیں کم پڑھتے ہیں۔ کارلائیل۔ رسکن اور ایمرسن کے سوا میں انہیں کوئی دوسری کتاب نہیں پڑھتے دیکھتی۔ اور مجھے تو اپنی رامائن اور مہابھارت میں پھر وہی لطف آنے لگا ہے۔

بُوڑھی کاکی

(۱)

بڑھاپا اکثر بچپن کا دورِ ثانی ہوا کرتا ہے۔ بوڑھی کاکی میں ذائقہ کے سوا اور کوئی حس باقی نہ تھی اور نہ اپنی شکایتوں کی طرف مخاطب کرنے کا رونے کے سوا کوئی دوسرا ذریعہ آنکھیں۔ ہاتھ، پیر سب جواب دے چکے تھے۔ زمین پر پڑی رہتیں اور جب گھر والے کوئی بات ان کی مرضی کے خلاف کرتے۔ کھانے کا وقت ٹل جاتا یا مقدار کافی نہ ہوتی یا بازار سے کوئی چیز آتی اور انہیں نہ ملتی۔ تو رونے لگتی تھیں اور ان کا رونا محض لبورنا نہ تھا۔ وہ بہ آوازِ بلند روتی تھیں۔ ان کے شوہر کو مرے ہوئے ایک زمانہ گذر گیا۔ سات

بیٹے جوان ہو ہو کر داغ دے گئے۔ اور اب ایک بھتیجے کے سوا دُنیا میں اُن کا اور کوئی نہ تھا۔ اسی بھتیجے کے نام انہوں نے اپنی ساری جائداد لکھ دی تھی۔ ان حضرت نے لکھاتے وقت تو خوب لمبے چوڑے وعدے کئے۔ لیکن وہ وعدے صرف تلی ڈپلو کے دلالوں کے سبز باغ تھے۔ اگرچہ اس جائداد کی سالانہ آمدنی ڈیڑھ دو سو روپے سالانہ سے کم نہ تھی۔ لیکن بوڑھی کاکی کو اب پیٹ بھر روکھا دانہ بھی مشکل سے ملتا تھا۔ اس میں پنڈت بدھ رام کی خطا تھی یا ان کی بیوی روپا کی۔ اس کا تصفیہ کرنا مشکل ہے۔ بدھ رام طبیعت کے نیک آدمی تھے۔ لیکن اسی وقت تک کہ ان کی جیب پر کوئی آنچ نہ آئے۔ روپا طبیعت کی تیز تھی۔ لیکن ایشور سے ڈرتی تھی۔ اس لئے بوڑھی کاکی پر اس کی تیزی اتنی نہ کھلتی تھی۔ جتنی بدھ رام کی نیکی۔

بدھ رام کو کبھی کبھی اپنی بے انصافی کا احساس ہوتا۔ وہ سوچتے کہ اسی جائداد کی بدولت میں اس وقت بھلا آدمی بنا بیٹھا ہوں اور اگر زبانی تسکین یا تشفی سے صورت حال میں کچھ اصلاح ہو سکتی۔ تو انہیں مطلق دریغ نہ ہوتا۔ لیکن مزید خرچ کا خوف ان کی نیکی کو دبائے رکھتا تھا۔ اس کے برعکس اگر دروازہ پر کوئی بھلا مانس بیٹھا ہوتا اور بوڑھی کاکی اپنا نغمہ بے ہنگام شروع کر دیتیں۔ تو وہ آگ ہو جاتے تھے اور گھر میں آکر انہیں زور سے ڈانٹتے تھے۔ لڑکے جنہیں بڈھوں سے ایک بغض للہ ہوتا ہے۔ والدین کا یہ رنگ دیکھ کر بوڑھی کاکی کو اور بھی دق کرتے۔ کوئی چٹکی لے کر بھاگتا۔ کوئی ان پر پانی کی کلی کر دیتا۔ کاکی چیخ مار کر روتیں۔ لیکن یہ تو مشہور ہی تھا کہ وہ صرف کھانے کے لئے روتی ہیں۔ اس لئے کوئی ان کے نالہ و فریاد پر دھیان نہ دیتا تھا۔ ہاں اگر کاکی کبھی غصہ میں آکر لڑکوں کو گالیاں دینے لگتیں تو روپا موقع واردات پر ضرور جاتی۔ اس خوف سے کاکی اپنی شمشیر زبانی کا شاذ ہی کبھی استعمال کرتی تھیں۔ حالانکہ رفع شر کی یہ تدبیر رونے سے زیادہ کارگر تھی۔

سارے گھر میں اگر کسی کو کاکی سے محبت تھی۔ تو وہ بدھ رام کی چھوٹی لڑکی لاڈلی

تھی۔ لاڈلی اپنے دونوں بھائیوں کے خوف سے اپنے حصے کی مٹھائی یا چبینا بوڑھی کاکی کے پاس بیٹھ کر کھایا کرتی تھی۔ یہی اس کا ملجا تھا۔ اور اگرچہ کاکی کی پناہ ان کی سائلانہ سرگرمی کے باعث بہت گراں پڑتی تھی۔ لیکن بھائیوں کے دست تطاول سے بدرجہا قابل ترجیح تھی۔ اس مناسبت اغراض نے ان دونوں میں محبت اور ہمدردی پیدا کر دی تھی۔

رات کا وقت تھا۔ بدھ رام کے دروازے پر شہنائی بج رہی تھی۔ اور گاؤں کے بچوں کا جم غفیر نگاہ حیرت سے گلنے کی داد دے رہا تھا۔ چارپائیوں پر مہمان لیٹے ہوئے نائیوں سے مکیاں لگوا رہے تھے۔ قریب ہی ایک بھاٹ کھڑا کبت سنا رہا تھا اور بعض سخن فہم مہمانوں کی واہ واہ سے ایسا خوش ہوتا تھا۔ گویا وہی اس داد کا مستحق ہے۔ دو ایک انگریزی پڑھے ہوئے نوجوان ان بیہودگیوں سے بیزار تھے۔ وہ اس دہقانی مجلس میں بولنا یا شریک ہونا اپنی شان کے خلاف سمجھتے۔ آج بدھ رام کے بڑے لڑکے سکھ رام کا تلک آیا ہے۔ یہ اسی کا جشن ہے۔ گھر میں مستورات گا رہی تھیں اور روپا مہمانوں کی دعوت کے سامان کرنے میں مصروف تھی۔ بھٹیوں پر کڑاہ چڑھے ہوئے تھے۔ ایک میں پوریاں کچوریاں نکل رہی تھیں۔ دوسرے میں سموسے اور پیڑاکیں بنتی تھیں۔ ایک بڑے ہنڈے میں مصالحے دار ترکاری پک رہی تھی۔ گھی اور مصالحے کی اشتہا انگیز خوشبو چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔

بوڑھی کاکی اپنی اندھیری کوٹھری میں خیال غم کی طرح بیٹھی ہوئی تھیں۔ یہ لذت آمیز خوشبو انہیں بے تاب کر رہی تھی۔ وہ دل میں سوچتی تھیں۔ شاید مجھے پوریاں نہ ملیں گی اتنی دیر ہو گئی۔ کوئی کھانا لے کر نہیں آیا۔ معلوم ہوتا ہے۔ لوگ سب کھا گئے ہیں۔ میرے لئے کچھ نہ بچا۔ یہ سوچکر انہیں بے اختیار رونا آیا۔ لیکن شگون کے خوف سے رو نہ سکیں۔

آہا! کیسی خوش بو ہے۔ اب مجھے کون پوچھتا ہے۔ جب روٹیوں ہی کے لالے ہیں تو ایسے نصیب کہاں کہ پوریاں پیٹ بھر ملیں۔ یہ سوچکر انہیں پھر بے اختیار رونا آیا۔

کلیجہ میں ایک ہوک سی اٹھنے لگی۔ لیکن رو پا کے خوف سے انہوں نے پھر ضبط کیا۔
بوڑھی کاکی دیر تک انہیں افسوسناک خیالوں میں ڈوبی رہیں۔ گھی اور مصالحے کی خوش بُو رہ رہ کر دل کو آپے سے باہر کئے دیتی تھی۔ منہ میں پانی بھر بھر آتا تھا۔ پوریوں کا ذائقہ یاد کر کے دل میں گدگدی ہونے لگتی تھی۔ "کسے پکاروں آج لاڈلی بھی نہیں آئی۔ دونوں لونڈے روز دق کیا کرتے ہیں۔ آج ان کا بھی کہیں پتہ نہیں کچھ معلوم ہوتا کہ کیا بن رہا ہے"۔

بوڑھی کاکی کی چشم خیال میں پوریوں کی تصویر ناچنے لگی۔ خوب لال لال پھولی پھولی نرم نرم ہونگی۔ رو پا نے خوب ماٹن دیا ہوگا۔ کچوریوں میں اجوائن اور الائچی کی مہک آ رہی ہوگی ایک پوری ملتی تو ذرا ہاتھ میں لے کر دیکھتی۔ کیوں نہ چل کر کڑاہ کے سامنے ہی بیٹھیں۔ پوریاں چھن چھن کر کے کڑاہ میں تیرتی ہوں گی۔ کڑاہ سے گرما گرم نکل کر کٹھوتے میں رکھی جاتی ہونگی۔ پھول ہم گھر میں بھی سونگھ سکتے ہیں۔ لیکن سیر باغ کا کچھ اور ہی لطف ہے۔

اس طرح فیصلہ کر کے بوڑھی کاکی اکڑوں بیٹھ کر ہاتھوں کے بل کھسکتی ہوئی بمشکل تمام چوکھٹ سے اتریں اور دھیرے دھیرے رینگتی ہوئی کڑاہ کے پاس جا بیٹھیں۔ یہاں انہیں کچھ ویسی ہی تسکین ہوئی جو کسی بھوکے کتے کو کھانے والے کے سامنے بیٹھنے میں ہوتی ہے۔
رو پا اس وقت ایک سراسیمگی کی حالت میں تھی۔ کبھی اس کمرے میں جاتی کبھی اس کمرے میں۔ کبھی کڑاہ کے پاس۔ کبھی کوٹھے پر۔ کسی نے باہر سے آ کر کہا۔ "مہراج ٹھنڈائی مانگ رہے ہیں"۔ ٹھنڈائی دینے لگی۔ اتنے میں پھر کسی نے آ کر کہا۔ بھاٹ آیا ہے۔ اُسے کچھ دے دو۔ بھاٹ کے لئے سیدھا نکال رہی تھی۔ کہ ایک تیسرے آدمی نے آ کر پوچھا۔ "ابھی کھانا تیار ہونے میں کتنی دیر ہے؟ ذرا ڈھول مجیرا اتار دو"۔ بیچاری اکیلی عورت۔ چاروں طرف دوڑتے دوڑتے حیران ہو رہی تھی۔ جھنجلاتی تھی۔ کڑھتی تھی۔ پر غصہ باہر نکلنے کا موقع نہ پاتا تھا۔ خوف ہوتا تھا۔ کہیں پڑوسنیں یہ نہ کہنے لگیں کہ اتنے ہی میں ابل پڑیں۔ پیاس

سے خود اس کا حلق سوکھا جاتا تھا۔ گرمی کے مارے پھُنکی جاتی تھی۔ لیکن اتنی فرصت کہاں کہ ذرا پانی پی لے یا پنکھا لے کر جھلے۔ یہ بھی اندیشہ تھا۔ کہ ذرا نگاہ ہٹی۔ اور چیزوں کی لوٹ مچی۔ اس کشمکش کے عالم میں اس نے بوڑھی کاکی کو کڑاہ کے پاس بیٹھے دیکھا۔ تو جل گئی۔ غصہ نہ رک سکا یہ خیال نہ رہا کہ پڑوسنیں بیٹھی ہوئی ہیں۔ دل میں کیا کہیں گی۔ مردانے میں لوگ سنیں گے۔ تو کیا کہیں گے۔ جیسے مینڈک کیچوے پر جھپٹتا ہے۔ اسی طرح وہ بوڑھی کاکی پر جھپٹی۔ اور انہیں دونوں ہاتھوں سے جھنجوڑ کر بولی ”ایسے پیٹ میں آگ لگے۔ پیٹ ہے کہ آگ کا کُنڈ ہے۔ کوٹھڑی میں بیٹھتے کیا دم گھٹتا تھا۔ ابھی مہمانوں نے نہیں کھایا۔ دیوتاؤں کا بھوگ تک نہیں لگا۔ تب تک صبر نہ ہوسکا۔ آکر چھاتی پر سوار ہوگئیں۔ نوج ایسی جیبھ۔ دن بھر کھاتی نہ رہتیں۔ تو نہ جانے کس کی ہانڈی میں منہ ڈالتیں۔ گاؤں دیکھے گا۔ تو کہے گا کہ بڑھیا بھر پیٹ کھانے کو نہیں پاتی۔ تب ہی تو اس طرح لوکھلاتی پھرتی ہے (اس خیال سے اس کا غصہ اور بھی تیز ہوگیا)۔ ڈائن نہ مرے۔ نہ ماچا چھوڑے۔ نام بیچنے پر لگی ہے۔ ناک کٹوا کے دم لے گی۔ اتنا ٹھونستی ہے۔ نہ جانے کہاں بھسم ہو جاتا ہے۔ لے بھلا چاہتی ہو تو جاکر کوٹھڑی میں بیٹھو۔ جب گھر کے لوگ کھانے لگیں گے تو تمہیں بھی ملے گا۔ تم کوئی دیوی نہیں ہو کہ چاہے کسی کے منہ میں پانی تک نہ جائے۔ لیکن پہلے تمہاری پوجا کر دے۔

بوڑھی کاکی نے سر نہ اٹھایا۔ نہ روئیں۔ نہ بولیں۔ چپ چاپ رینگتی ہوئی وہاں سے اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ صدمہ ایسا سخت تھا۔ کہ دل و دماغ کی ساری قوتیں۔ سارے جذبات ساری حسیات اسی طرف رجوع ہوگئی تھیں۔ جیسے ندی میں جب کراڑ کا کوئی بڑا ٹکڑا کٹ کر گرتا ہے تو آس پاس کا پانی چاروں طرف سے سمٹ کر اسی خلا کو پورا کرنے کے لیے دوڑتا ہے۔

(۲)

کھانا تیار ہوگیا۔ آنگن میں پتّل پڑ گئے۔ مہمان کھانے لگے۔ عورتوں نے جیونار گانا

شروع کیا۔ مہمانوں کے نائی اور خدمت گار بھی اسی جماعت کے ساتھ پر ذرا ہٹ کر کھانے بیٹھے ہوئے تھے۔ لیکن آداب مجلس کے مطابق جب تک سب کے سب کھانہ چکیں۔ کوئی اٹھ نہ سکتا تھا۔ دو ایک مہمان جو ذرا تعلیم یافتہ تھے۔ خدمت گاروں کی دیر خوری پر جھنجلا رہے تھے۔ وہ اس قید کو بے معنی و مہمل سمجھتے تھے۔

بوڑھی کاکی اپنی کوٹھڑی میں جاکر پچھتا رہی تھیں کہ کہاں سے کہاں گئی۔ انہیں روپا پر غصہ نہیں تھا۔ اپنی عجلت پر افسوس تھا۔ سچ تو ہے۔ جب تک مہمان لوگ کھانہ چکیں گے۔ گھر والے کیسے کھائیں گے۔ مجھ سے اتنی دیر بھی نہ رہا گیا۔ سب کے سامنے پانی اتر گیا۔ اب جب تک کوئی بلانے نہ آئے گا نہ جاؤں گی۔

دل میں یوں فیصلہ کر کے وہ خموشی سے بلاوے کا انتظار کرنے لگیں۔ لیکن گھی کی مرغوب خوشبو بہت صبر آزما ثابت ہو رہی تھی۔ انہیں ایک ایک لمحہ ایک ایک گھنٹہ معلوم ہوتا تھا۔ اب پتّل بچھ گئے ہونگے۔ اب مہمان آ گئے ہوں گے۔ لوگ ہاتھ پیر دھو رہے ہیں۔ نائی پانی دے رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ لوگ کھانے پر بیٹھ گئے۔ جیونار گایا جا رہا ہے۔ یہ سوچ کر بہلانے کے لئے لیٹ گئیں اور دھیرے دھیرے ایک گیت گنگنانے لگیں۔ انہیں معلوم ہوا کہ مجھے گاتے بہت دیر ہو گئی۔ کیا اتنی دیر تک لوگ کھا ہی رہے ہونگے۔ کسی کی بول چال نہیں سنائی نہیں دیتی۔ ضرور لوگ کھا پی کے چلے گئے۔ مجھے کوئی بلانے نہیں آیا۔ روپا چڑ گئی ہے۔ کیا جانے نہ بلائے۔ سوچتی ہو کہ آپ ہی آئیں گی۔ کوئی مہمان نہیں۔ کہ بُلاؤں۔

بوڑھی کاکی چلنے کے لئے تیار ہوئیں۔ یہ یقین کہ اب ایک لمحہ میں پوریاں اور مصالحے دار ترکاریاں سامنے آئیں گی۔ ان کے حِسّ ذائقہ کو گدگدانے لگا۔ انہوں نے دل میں طرح طرح کے منصوبے باندھے۔ پہلے ترکاری سے پوریاں کھاؤں گی۔ پھر دہی اور شکر سے۔ کچوریاں رائتے کے ساتھ مزے دار معلوم ہونگی۔ چاہے کوئی بُرا مانے یا بھلا۔ میں تو مانگ مانگ کر کھاؤنگی۔

بھی نہ لوگ کہیں گے۔ انہیں لحاظ نہیں ہے۔ کہا کریں۔ اتنے دنوں کے بعد پوریاں مل رہی ہیں تو منہ جھوٹا کرکے تھوڑے ہی اُٹھ آؤں گی۔"

وہ اکڑوں بیٹھ کر ہاتھوں کے بل کھسکتی ہوئی آنگن میں آئیں۔ مگر وائے قسمت! اشتیاق نے اپنی پرانی عادت کے مطابق وقت کا غلط اندازہ کیا تھا۔ مہمانوں کی جماعت ابھی بیٹھی ہوئی تھی۔ کوئی کھا کر انگلیاں چاٹتا تھا۔ اور کنکھیوں سے دیکھتا تھا کہ اور لوگ ابھی کھا رہے ہیں یا نہیں۔ کوئی اس فکر میں تھا کہ پتل پر پوریاں چھوٹی جاتی ہیں۔ کاش کسی طرح انہیں اندر رکھ لیتا۔ کوئی دہی کھا کے زبان چٹخارتا تھا۔ لیکن دوسرا سکورا مانگتے ہوئے شرماتا تھا کہ اتنے میں بوڑھی کاکی رینگتی ہوئی ان کے بیچ میں جا پہنچیں۔ کئی آدمی چونک کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ آوازیں آئیں۔ "ارے یہ کون بڑھیا ہے؟ یہ کہاں سے آگئی؟ دیکھو کسی کو چھو مت دے!"

پنڈت بدھو رام کاکی کو دیکھتے ہی غصہ سے تلملا گئے۔ پوریوں کا تھال لئے کھڑے تھے۔ تھال کو زمین پر پٹک دیا اور جس طرح بے رحم ساہوکار اپنے کسی نادہند مفرور اسامی کو دیکھتے ہی جھپٹ کر اس کا ٹیٹوا لیتا ہے۔ اسی طرح لپک کر انہوں نے بوڑھی کاکی کے دونوں شانے پکڑے اور گھسیٹتے ہوئے لا کر انہیں اس اندھیری کوٹھڑی میں دھم سے گرا دیا۔ آرزوؤں کا سبز باغ لو کے ایک ہی جھونکے میں ویران ہو گیا!

مہمانوں نے کھانا کھایا۔ گھر والوں نے کھایا۔ باجے والے دھوبی۔ چمار بھی کھا چکے لیکن بوڑھی کاکی کو کسی نے نہ پوچھا۔ بدھو رام اور روپا دونوں ہی انہیں ان کی بے حیائی کی سزا دینے کا تصفیہ کر چکے تھے۔ ان کے بڑھاپے پر۔ بے کسی پر فتور عقل پر کسی کو ترس نہیں آتا تھا۔ اکیلی لاڈلی ان کے لئے کڑھ رہی تھی۔

لاڈلی کو کاکی سے بہت اُنس تھا۔ بے چاری بھولی۔ سیدھی لڑکی تھی۔ طفلانہ شوخی اور شرارت کی اس میں بو تک نہ تھی۔ دونوں بار جب اس کے باپ اور ماں نے کاکی کو

بے رحمی سے گھسیٹا۔ تو لاڈلی کا کلیجہ اینٹھ کر رہ گیا۔ وہ جھنجلا رہی تھی۔ کہ یہ لوگ کاکی کو کیوں بہت سی پوریاں نہیں دے دیتے۔ کیا مہمان سب کی سب تھوڑے ہی کھا جائینگے۔ اور اگر کاکی نے مہمانوں سے پہلے ہی کھا لیا تو کیا بگڑ جائے گا؟ وہ کاکی کے پاس جا کر انہیں تشفی دینا چاہتی تھی۔ لیکن ماں کے خوف سے نہ جاتی تھی۔ اس نے اپنے حصے کی پوریاں مطلق نہ کھائی تھیں۔ اپنی گڑیوں کی پٹاری میں بند کر رکھی تھیں۔ وہ یہ پوریاں کاکی کے پاس لے جانا چاہتی تھی۔ اس کا دل بے قرار ہو رہا تھا۔ بوڑھی کاکی میری آواز سنتے ہی اٹھ بیٹھیں گی۔ پوریاں دیکھ کر کیسی خوش ہوں گی۔ مجھے خوب پیار کریں گی۔

رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ روپا آنگن میں پڑی سو رہی تھی۔ لاڈلی کی آنکھوں میں نیند نہ آتی تھی۔ کاکی کو پوریاں کھلانے کی خوشی اسے سونے نہ دیتی تھی۔ اس نے گڑیوں کی پٹاری سامنے ہی رکھی۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ اماں غافل سو رہی ہیں تو وہ چپکے سے اٹھی اور سوچنے لگی۔ کہ کیسے چلوں۔ چاروں طرف اندھیرا تھا۔ صرف چولھوں میں آگ چمک رہی تھی اور چولھوں کے پاس ایک کتا لیٹا ہوا تھا۔ لاڈلی کی نگاہ دروازے والے نیم کے درخت کی طرف گئی۔ اسے معلوم ہوا۔ کہ اس پر ہنومان جی بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان کی دم۔ ان کی گدا سب صاف نظر آتی تھی۔ مارے خوف کے اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اتنے میں کتا اٹھ بیٹھا۔ لاڈلی کو ڈھارس ہوئی۔ کئی سوتے ہوئے آدمیوں کی نسبت ایک جاگتا ہوا کتا اس کے لئے زیادہ تقویت کا باعث ہوا۔ اس نے پٹاری اٹھائی۔ اور بوڑھی کاکی کی کوٹھڑی کی طرف چلی۔

(۳)

بوڑھی کاکی کو محض اتنا یاد تھا کہ کسی نے میرے شانے پکڑے۔ پھر انہیں ایسا معلوم ہوا۔ جیسے کوئی پہاڑ پر اڑائے لئے جاتا ہے۔ ان کے پیر بار بار پتھروں سے

ٹکرائے۔ تب کسی نے انہیں پہاڑ پر سے پٹک دیا۔ وہ بے ہوش ہوگئیں۔

جب ان کے ہوش بجا ہوئے۔ تو کسی کی ذرا بھی آہٹ نہ ملتی تھی۔ سمجھ گئیں۔ کہ سب لوگ کھاپی کر سو گئے۔ اور ان کے ساتھ میری تقدیر بھی سو گئی۔ رات کیسے کٹے گی۔ رام! کیا کھاؤں؟ پیٹ میں آگ جل رہی ہے۔ ہا! کسی نے میری سدھ نہ لی۔ کیا میرا ہی پیٹ کاٹنے سے دھن ہو جائے گا؟ ان لوگوں کو اتنی دیا بھی نہیں آتی کہ بڑھیا نہ جانے کب مر جائے۔ اس کا رویاں کیوں دکھائیں۔ میں پیٹ کی روٹیاں ہی کھاتی ہوں کہ اور کچھ۔ اس پر یہ حال۔ میں اندھی اپاہج ٹھہری۔ نہ کچھ سوجھے نہ بوجھے۔ اگر آنگن میں چلی گئی۔ تو کیا بدھ رام سے اتنا کہتے نہ بنتا تھا کہ کاکی ابھی لوگ کھا رہے ہیں۔ پھر آنا؟ مجھے گھسیٹا۔ پٹکا۔ انہیں پوریوں کے لئے روپا نے سب کے سامنے گالیاں دیں۔ انہیں پوریوں کے لئے اور اتنی درگت کر کے بھی ان کا پتھر کا کلیجہ نہ پسیجا۔ سب کو کھلایا میری بات نہ پوچھی۔ جب تب ہی نہ دیا۔ تو اب کیا دیں گی یہ سوچ کر بابو سانہ صبر کے ساتھ لیٹ گئیں۔ رقت سے گلا بھر بھر آتا تھا۔ لیکن مہمانوں کے لحاظ سے روتی نہ تھیں۔

یکایک ان کے کان میں آواز آئی۔ "کاکی اُٹھو۔ میں پوریاں لائی ہوں"۔

کاکی نے لاڈلی کی آواز پہچانی۔ چٹ پٹ اٹھ بیٹھیں۔ دونوں ہاتھوں سے لاڈلی کو ٹٹولا۔ اور اسے گود میں بٹھا لیا۔ لاڈلی نے پوریاں نکال کر دیں۔ کاکی نے پوچھا۔ "کیا تمہاری اماں نے دی ہیں؟"

لاڈلی نے فخر سے کہا۔ "نہیں یہ میرے حصّے کی ہیں"۔

کاکی پوریوں پر ٹوٹ پڑیں۔ پانچ منٹ میں پٹاری خالی ہوگئی۔ لاڈلی نے پوچھا۔ کاکی پیٹ بھر گیا"؟

جیسے تھوڑی سی بارش ٹھنڈک کی جگہ اور بھی ہمس پیدا کر دیتی ہے۔ اسی طرح

ان چند پوریوں نے کاکی کی اشتہا اور رغبت کو اور بھی تیز کر دیا تھا۔ بولیں۔ نہیں بیٹی! جا کے اماں سے اور مانگ لاؤ۔"

لاڈلی۔ "اماں سوتی ہیں۔ جگاؤں گی۔ تو ماریں گی"

کاکی نے پٹاری کو پھر ٹٹولا۔ اس میں چند ریزے گرے تھے۔ انہیں نکال کر کھا گئیں۔ بار بار ہونٹ چاٹتی تھیں۔ چٹخارے بھرتی تھیں۔ دل مسوس رہا تھا۔ کہ اور پوریاں کیسے پاؤں؟ صبر کا باندھ جب ٹوٹ جاتا ہے تو خواہش کا بہاؤ قابو سے باہر ہو جاتا ہے۔ مستوں کو سرود کی یاد دلانا انہیں دیوانہ بنانا ہے۔ کاکی کا بیتاب دل خواہش کے اس بہاؤ میں بہ گیا۔ حلال حرام کی تمیز نہ رہی۔ وہ کچھ دیر تک اس خواہش کو روکتی رہیں۔ یکایک لاڈلی سے بولیں۔ میرا ہاتھ پکڑ کر وہاں لے چلو۔ جہاں مہمانوں نے بیٹھ کر کھانا کھایا تھا۔

لاڈلی اس کا منشا نہ سمجھ سکی۔ اس نے کاکی کا ہاتھ پکڑا اور انہیں لا کر جھوٹے پتلوں کے پاس بٹھا دیا اور غریب بھوک کی ماری۔ فاتر العقل بڑھیا پتلوں سے پوریوں کے ٹکڑے چن چن کر کھانے لگی۔ دہی کتنا لذیذ تھا۔ سالن کتنا مزہ دار۔ کچوریاں کتنی سلونی سموسے کتنے خستہ اور نرم؟

کاکی فتور عقل کے باوجود جانتی تھیں کہ میں وہ کر رہی ہوں جو مجھے نہ کرنا چاہیئے۔ میں دوسروں کے جھوٹے پتل چاٹ رہی ہوں۔ لیکن بڑھاپے کی حرص مرض کا آخری دور ہے۔ جب سارے حواس ایک ہی مرکز پر آ کر جمع ہو جاتے ہیں۔ بوڑھی کاکی میں یہ مرکز ان کا حس ذائقہ تھا۔

عین اسی وقت روپا کی آنکھ کھلی۔ اسے معلوم ہوا کہ لاڈلی میرے پاس نہیں ہے چونکی چارپائی کے اِدھر اُدھر تاکنے لگی۔ کہ کہیں لڑکی نیچے تو نہیں گر پڑی۔ اُسے وہاں نہ پا کر وہ اٹھ بیٹھی۔ تو کیا دیکھتی ہے کہ لاڈلی جھوٹے پتلوں کے پاس چپ چاپ کھڑی ہے

اور بوڑھی کاکی پتلوں پر سے پوریوں کے ٹکڑے اٹھا اٹھا کر کھا رہی ہیں۔ روپا کا کلیجہ سن سے ہو گیا۔ کسی گائے کی گردن پر چھری چلتے دیکھ کر اس کے دل کی جو حالت ہوتی۔ وہی اس وقت ہوئی۔ ایک براہمنی دوسروں کا جھوٹا پتل ٹٹولے۔ اس سے زیادہ عبرتناک نظارہ ناممکن تھا۔ پوریوں کے چند لقموں کے لئے اس کی چچیری ساس ایسا رکیک اور حقیر فعل کر رہی ہے یہ وہ نظارہ تھا۔ جس سے دیکھنے والوں کے دل کانپ اٹھتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زمین رک گئی ہے۔ آسمان چکر کھا رہا ہے۔ دنیا پر کوئی نئی آفت آنے والی ہے۔ روپا کو غصہ نہ آیا۔ عبرت کے سامنے غصے کا ذکر کیا؟ درد اور خوف سے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس ادھرم اور پاپ کا الزام کس پر ہے؟ اس نے صدق دل سے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "پرماتما! میرے بچوں پر رحم کرنا۔ اس ادھرم کی سزا مجھے مت دینا۔ ہمارا ستیاناس ہو جائے گا۔"

روپا کو اپنی خود غرضی اور بے انصافی آج تک کبھی اتنی صفائی سے نظر نہ آتی تھی۔ ہائے میں کتنی بے رحم ہوں۔ جس کی جائداد سے مجھے دو سو روپیہ سالی کی آمدنی ہو رہی ہے۔ اس کی یہ درگت اور میرے کارن! اے ایشور مجھ سے بڑا بھاری گناہ ہوا ہے۔ مجھے معاف کرو۔ آج میرے بیٹے کا تلک تھا۔ سیکڑوں آدمیوں نے کھانا کھایا۔ میں ان کے اشارے کی غلام بنی ہوئی تھی۔ اپنے نام کے لئے اپنی بڑائی کے لئے سیکڑوں روپے خرچ کر دیئے۔ لیکن جس کی بدولت ہزاروں روپے کھائے اسے اس تقریب کے دن بھی پیٹ بھر کھانا نہ دے سکی۔ محض اس لئے نہ کہ وہ بڑھیا ہے۔ بےکس ہے۔ "بے زبان"۔

اس نے چراغ جلایا۔ اپنے بھنڈارے کا دروازہ کھولا۔ اور ایک تھالی میں کھانے کی سب چیزیں سجا کر لئے ہوئے بوڑھی کاکی کی طرف چلی۔

آدھی رات ہو چکی تھی۔ آسمان پر تاروں کے تھال سجے ہوئے تھے اور ان پر بیٹھے ہوئے فرشتے بہشتی نعمتیں سجا رہے تھے۔ لیکن ان میں کسی کو وہ مسرت نہ حاصل ہو

سکتی تھی - جو بوڑھی کاکی کو اپنے سامنے تھال دیکھ کر ہوئی - روپا نے رقت آمیز لہجہ میں کہا "کاکی! اٹھو کھانا کھا لو - مجھ سے آج بڑی بھول ہوئی - اس کا برا نہ ماننا - پرماتما سے دعا کرو - کہ وہ میری خطا معاف کر دے"۔

بھولے بھالے بچے کی طرح جو مٹھائیاں پاکر مار اور گھڑکیاں سب بھول جاتا ہے بوڑھی کاکی بیٹھی ہوئی کھانا کھا رہی تھیں - ان کے ایک ایک روئیں سے سچی دعائیں نکل رہی تھیں - اور روپا بیٹھی یہ روحانی نظارہ دیکھ رہی تھی۔

بینک کا دیوالہ

(۱)

لکھنؤ انڈسٹریل بینک کے وسیع دفتر میں لالہ سائیں داس آرام کرسی پر لیٹے ہوئے
انوسٹرس ریویو کا مطالعہ کر رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ اب کے معاملہ داروں کو منافع کہاں
سے دیا جائے گا۔ چائے۔ کوئلہ یا جوٹ کے حصے خریدنے یا چاندی سونے اور روئی
کا سٹہ کرنے کا ارادہ کرتے۔ مگر نقصان کا اندیشہ کوئی فیصلہ قائم نہ ہونے دیتا تھا۔ غلہ
کے کاروبار میں اب کے بڑا خسارہ رہا۔ حصہ داروں کی تشفی و اطمینان کے لئے فرضی
حسابات تیار کرنا پڑے اور منافع اصل روپیہ سے دینا پڑا۔ اس وجہ سے پھر غلہ
کے کام میں ہاتھ ڈالتے ہوئے روح کانپتی تھی۔

مگر روپے کا بے کار رکھنا غیر ممکن تھا۔ دو ایک روز میں اس کے استعمال کی کوئی نہ کوئی صورت نکالنی لازمی تھی۔ کیونکہ ڈائرکٹروں کا سہ ماہی اجلاس ایک ہی ہفتہ میں ہونے والا تھا۔ اور اگر اس وقت تک کوئی فیصلہ نہ ہوسکا تو پھر آئندہ تین ماہ تک کچھ نہ ہوسکے گا۔ اور ششماہی تقسیم منافع کے موقع پر پھر وہی فرضی کارروائی کرنا پڑے گی۔ جس کا متواتر متحمل ہونا بینک کے لئے دشوار تھا۔ بہت دیر تک اس خلجان میں پڑے رہنے کے بعد سائیں داس نے گھنٹی بجائی۔ اور بغل کے دوسرے کمرے سے ایک بنگالی بابو نے سر نکال کر جھانکا۔

سائیں داس۔ ٹاٹا اسٹیل کمپنی کو ایک خط لکھ دیجئے۔ کہ وہ اپنا حال کا بیلنس شیٹ بھیج دیں۔

بابو۔" ان لوگوں کو روپیہ کا گرج نہیں۔ چھٹی کا جباب نہیں دیتا۔"

سائیں داس۔" اچھا ناگپور کے سودیشی مل کو لکھیئے۔"

بابو۔" اس کا کاروبار اچھا نہیں ہے۔ ابھی اس کے مجوروں نے ہڑتال کیا تھا۔ دو مہینہ تک مل بند رہا۔"

سائیں داس۔" اجی تو کہیں لکھو بھی۔ تمہارے خیال میں تو ساری دُنیا بے ایمانوں سے بھری ہوئی ہے۔"

بابو۔ بابا لکھنے کو تو ہم سب جگہ لکھ دیں۔ مگر کھالی لکھ دینے سے کچھ فائدہ تو نہیں ہوتا۔"

لالہ سائیں داس اپنے خاندانی رسوخ کے باعث بینک کے مینجنگ ڈائرکٹر ہوگئے تھے۔ مگر کاروباری دُنیا سے بہت واقفیت نہ رکھتے تھے۔ یہی بنگالی بابو ان کے مشیرِ خاص تھے۔ اور بابو صاحب کو کسی کارخانہ یا کمپنی پر اعتماد نہ تھا۔ انہیں کی بزدلانہ احتیاط کے باعث پچھلے سال بینک کا روپیہ صندوق سے باہر نہ نکل سکا

تھا۔ اور اب وہی صورت درپیش تھی۔ سائیں داس کو اس مشکل سے عہدہ برآ ہونے کی کوئی تدبیر نہ سوجھی تھی اور نہ اتنی ہمت تھی کہ اپنی ذمہ داری پر کسی کاروبار میں بے خوف ہو کر کود پڑیں۔ پریشانی کے عالم میں اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگے کہ دربان نے آ کر خبر دی۔ کہ "برہل کی رانی صاحبہ کی سواری آئی ہے"۔

(۲)

لالہ سائیں داس چونک پڑے۔ برہل کی رانی صاحبہ کو لکھنؤ آئے تین چار دن ہوئے تھے اور ہر ایک زبان پر انہیں کے چرچے تھے۔ کوئی ان کی سادگی اور نفاست پر قربان تھا۔ کوئی ان کے حسن صورت پر کوئی ان کی آزادروی پر۔ یہاں تک کہ اُن کی کنیزیں۔ باڈی گارڈ سپاہی وغیرہ بھی اس عام توجہ کے شریک تھے۔ رائل ہوٹل کے دروازے پر تماشائیوں کا ایک ہجوم سا لگا رہتا۔ کتنے ہی دیدہ باز بے فکرے لوگ عطرفروش۔ بزاز۔ تمباکوگر کا روپ بھر بھر کے ان کی خدمت میں باریاب ہو چکے تھے۔ جس طرف سے رانی صاحبہ کی سواری نکل جاتی۔ تماشائیوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ کھڑے ہو جاتے تھے۔ واللہ کیا شان ہے! ایسی عراقی جوڑی لاٹ صاحب کے سوا اور کسی راجہ رئیس کے ہاں تو شاید ہی نکلے۔ اور کیا سجاوٹ ہے! سبحان اللہ۔ بھئی ایسے گورے چٹے آدمی تو یہاں کبھی نظر نہیں آتے۔ یہاں تو روساء بیضۂ مرغ اور کشتۂ شنگرف اور ماءاللحم اور خدا جانے کیا کیا خاک بلا کھاتے رہتے ہیں۔ پر کسی کے چہرے پر سُرخی یا تازگی کا نام نہیں۔ یہ لوگ نہ جانے کیا کھاتے ہیں اور کس کنوئیں کا پانی پیتے ہیں کہ جسے دیکھئے تازہ سیب بنا ہوا ہے۔ یہ سب آب و ہوا کی برکت ہے۔

برہل شمال کی طرف نیپال کے قریب انگریزی عملداری میں ایک ریاست تھی اور اگرچہ اس کے محاصل کی نسبت عوام میں مبالغہ آمیز روایتیں مشہور تھیں۔ مگر

فی الواقع اس ریاست کی آمدنی دو لاکھ سالانہ سے زائد نہ تھی۔ ہاں اس کا رقبہ بہت وسیع تھا۔ زیادہ تر زمین غیر آباد تھی۔ آباد حصہ بھی کوہستانی اور کم زراعت تھا اور زمین بہت سستی اٹھتی تھی۔

لالہ سائیں داس نے فوراً الگنی سے اتار کر ریشمی سوٹ پہن لیا اور میز پر آکر اس شان سے بیٹھ گئے۔ گویا راجہ رانیوں کا یہاں آنا غیر معمولی بات نہیں ہے۔ دفتر کے کلرک بھی ہوشیار ہو گئے۔ سارے بینک میں وہ خاموش ہلچل پیدا ہو گئی۔ جو ہمیشہ غیر معمولی آمدول کا پیش خیمہ ہوا کرتی ہے۔ دربان نے پگڑی سنبھالی۔ چوکی دار نے تلوار نکالی اور اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا۔ پنکھا قلی بھی خواب خرگوش سے چونکا اور بنگالی بابو رانی صاحبہ کی پیشوائی کے لئے دفتر سے باہر نکلے۔

سائیں داس نے بے نیازی کی شان تو بنا رکھی تھی۔ مگر دل امید وبیم سے کانپ رہا تھا۔ ایک والئے ملک سے معاملہ کرنے کا یہ پہلا سابقہ تھا۔ گھبراتے تھے کہ بات کرتے بنے یا نہ بنے رئیسوں کا مزاج عرش پر ہوتا ہے معلوم نہیں میری کون سی بات ناگوار گزرے۔ انہیں اس وقت اپنے میں ایک خامی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ والیانِ ملک کے آداب مجلس سے واقف نہ تھے۔ ان کی تعظیم کس انداز سے ہونی چاہئے۔ ان سے ہم کلام ہونے میں کس قسم کا لحاظ کرنا چاہئے۔ ان کے حفظِ مراتب کے لئے کس حد تک انکسار مناسب ہے۔ اس قسم کے سوالات سے انہیں سخت تشویش ہو رہی تھی۔ اور جی چاہتا تھا کہ کسی طرح اس امتحان سے جلد نجات ہو جائے۔ تاجروں اور معمولی زمین داروں یا رئیسوں سے معاملہ کرنے میں وہ بے رعایت صفائی کا برتاؤ کیا کرتے تھے۔ اور تعلیم یافتہ معزز آدمیوں سے اخلاق اور شرافت کا ان موقعوں پر انہیں کسی مزید احتیاط کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن اس وقت انہیں وہ پریشانی ہو رہی تھی۔ جو لنکا کے کسی باشندے کو تبت میں ہو۔ جہاں کے رسم و رواج۔ رفتار و

گفتار کا اسے علم نہ ہو۔

دفعتاً ان کی نگاہ گھڑی پر پڑی۔ سہ پہر کے چار بج چکے تھے۔ پر گھڑی ابھی قیلولہ کر رہی تھی۔ تاریخ کی سوئی نے تیز روی میں وقت کو مات کر دیا تھا۔ وہ جلدی سے اٹھے۔ کہ گھڑی کو ٹھیک کر دیں کہ اتنے میں رانی صاحبہ نے کمرے میں قدم رکھا۔ سائیں داس نے گھڑی کو چھوڑا۔ اور رانی صاحبہ کے قریب پہلو میں کھڑے ہو گئے۔ تصفیہ نہ کر سکے۔ کہ ہاتھ ملاؤں۔ اس فروگذاشت کا اثر ایک اضطراب کی صورت میں ان کے چہرے پر نمودار ہو گیا۔ بارے رانی صاحبہ نے خود ہاتھ بڑھا کر انھیں اس الجھن سے نجات دی۔

رانی صاحبہ کا لباس بہت سادہ تھا۔ جثہ نحیف۔ اس رعب اور تحکم کا شائبہ بھی نہ تھا۔ جو ثروت کے ساتھ مخصوص ہے۔ ان کی بڑی بڑی آنکھوں سے ایک بیکسی کی سی جھلکتی تھی۔ چہرہ درد اور التجا کی تصویر تھا۔ اور اس پر حسرت کا وہ شوخ رنگ تھا۔ جو دوسروں کو جبراً رعایت۔ احسان۔ اعانت پر مائل کرتا تھا۔ کوئی انسان جس کے پہلو میں دل ہو۔ اس کے جادو سے بے اثر نہ رہ سکتا تھا۔ ایک پیکر تالیف تھا جس پر حزن و یاس کی تاثیر منقوش تھی۔ شام غم تھی۔ خاموش۔ زرد اور بے ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا زمانہ کے جور و ستم نے اس میں شکوۂ ستم کی آرزو بھی نہیں باقی رکھی۔ جذباتِ دل فنا ہو گئے۔ اور تسلیم و توکل کے سوا اور کوئی سہارا باقی نہیں رہا۔

جب لوگ کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ تو رانی کے پرائیویٹ سکرٹری نے معاملہ کی بات چیت شروع کی۔ پہلے برہل کی پرانی عظمت کا قصہ کہنے کے بعد اس نے ان ترقیوں کا ذکر کیا۔ جو رانی صاحبہ کی ذات سے عمل میں آئیں۔ چنانچہ فی الحال نہروں کی ایک شاخ نکالنے کے لئے دس لاکھ روپیہ کی ضرورت درپیش تھی۔ اور باوجودیکہ رانی صاحبہ کسی انگریزی بینک سے معاملہ کر سکتی تھیں۔ مگر انہوں نے ایک ہندوستانی بینک کے حق کو مرجح سمجھا۔ اب یہ فیصلہ انڈسٹریل بینک کے اختیار میں تھا۔ کہ وہ اس موقعہ سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے

یا نہیں۔

بنگالی بابو۔" ہم روپیہ دے سکتا ہے۔ مگر کاگد پتر دیکھے بنا کچھ نہیں کر سکتا۔"

سکرٹری۔" آپ کوئی ضمانت چاہتے ہیں"؟

سائیں داس " فیاضانہ انداز سے بولے۔" جناب ضمانت کے لئے آپ کی زبان کافی ہے۔"

بنگالی بابو۔" آپ کے پاس ریاست کا کوئی حساب کتاب ہے"؟

لالہ سائیں داس کو اپنے ہیڈ کلرک کی یہ دنیاداری سخت گیری ناگوار گذری۔ وہ اس وقت فیاضی کے نشہ میں مخمور تھے۔ رانی صاحبہ کی صورت التجا کافی ضمانت تھی۔ ان کے سامنے کاغذ اور حساب کا ذکر کرنا نابیناپن معلوم ہوتا تھا۔ جس سے بے اعتباری کی بُو آتی ہے۔ انہیں اس وقت حساب کتاب کا ذکر سفلہ پن معلوم ہو رہا تھا۔ صنف لطیف کے سامنے ہم فیاضی اور شرافت کے پتلے بن جاتے ہیں۔ بنگالی بابو کی طرف کڑی نگاہ سے دیکھ کر بولے۔" کاغذات کی جانچ کوئی لازمی امر نہیں ہے۔ شرط صرف ہمارا اطمینان ہے۔"

بنگالی بابو۔" ڈائرکٹر لوگ کبھی نہ مانے گا۔"

سائیں داس" ہم کو اس کی پروا نہیں۔ ہم اپنی ذمہ داری پر روپے دے سکتے ہیں۔"

رانی نے سائیں داس کی طرف نگاہ تشکر سے دیکھا۔ ان کے ہونٹوں پر ایک خفیف سا تبسم نظر آیا۔ اس میں کچھ کامیابی کی مسرت تھی۔ کچھ صیاد کی سفاکی اور کچھ سودائے خام کی حقارت۔

(۳)

مگر ڈائرکٹروں نے حساب کتاب۔ آمدنی اور خرچ دیکھنا ضروری سمجھا اور یہ کام

لالہ سائیں داس کے سپرد ہوا۔ کیونکہ اور کسی کو اپنے کاموں سے اتنی فرصت نہ تھی۔ کہ ایک پورے دفتر کا معائنہ کرتا۔ سائیں داس نے ضابطہ کی پابندی کی۔ تین چار دن تک کاغذات جانچتے رہے اور اپنے اطمینان کی رپورٹ پیش کی۔ معاملہ طے ہو گیا۔ دستاویز مرتب ہوئی۔ روپیہ دیا گیا۔ شرح سود نو فی صدی قرار پایا۔

تین سال تک بینک کے کاروبار کو خوب فروغ ہوا۔ چھٹے مہینے بے طلب و تقاضا پینتالیس ہزار کی رقم یک مشت دفتر میں آ جاتی تھی۔ معاملہ داروں کو پانچ فیصدی منافع دے دیا جاتا تھا۔ حصہ داروں کو سات فی صدی۔ اس طرح اس منفع کی کسر پوری ہو جاتی تھی۔ جو دوسرے وسائل سے حاصل ہوتا تھا۔ سائیں داس سے سب لوگ خوش تھے۔ سب ان کی معاملہ فہمی کے مداح۔ یہاں تک کہ بنگالی بابو بھی رفتہ رفتہ ان کے قائل ہوتے جاتے تھے۔ سائیں داس ان سے کہا کرتے۔ "بابو جی! اعتبار دنیا سے کبھی عنقا نہ ہوا ہے اور نہ ہو گا۔ نیکی پر عقیدہ رکھنا ہر ایک انسان کا فرض ہے۔ جس شخص کے دل سے یہ عقیدہ اٹھ جاتا ہے اسے زندہ درگور سمجھنا چاہیئے۔ اُسے معلوم ہوتا ہے کہ میں چاروں طرف سے دشمنوں سے گھرا ہوں۔ بڑے سے بڑا کامل فقیر اُسے رنگا ہوا یار معلوم ہوتا ہے۔ سچے سے سچا محبِ وطن اسے بندۂ شہرت نظر آتا ہے۔ اُسے دُنیا دغا اور فریب سے پُر دکھائی دیتی ہے۔ یہاں تک کہ اُس کے دل سے پرماتما کی عزت اور عظمت غائب ہو جاتی ہے۔ ایک مشہور فلاسفر کا قول ہے کہ ہر ایک انسان کو شریف سمجھو۔ تاوقتیکہ اس کے خلاف کوئی صریح ثبوت نہ ہو۔ موجودہ قوانین سیاست اسی معرکۃ الآرا اصول پر قائم ہیں اور نفرت تو کسی سے کرنی ہی نہ چاہیئے۔ ہماری روحیں پاک ہیں۔ ان سے نفرت کرنا پرماتما سے نفرت کرنے کے برابر ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ دنیا میں دغا اور فریب نہیں ہے۔ اور بہت کثرت سے ہے۔ مگر اس کا علاج بدگمانی نہیں۔ قیافہ شناسی ہے اور یہ خاص عطیہ ہے۔ جو ایشور کے دربار سے خاص خاص آدمیوں کو عطا ہوتا ہے۔ میں اس کا

دعوے نہیں کرتا۔ پر مجھے یقین ہے کہ انسان کی صورت دیکھ کر میں اس کے ضمیر کی تہ تک پہنچ جاتا ہوں۔ کوئی کتنا ہی بھیس بدلے۔ رنگ روپ بھرے۔ پر میری نگاہ باطن کو دھوکا نہیں دے سکتا۔ یہ بھی خیال رکھیئے کہ اعتبار سے اعتبار پیدا ہوتا ہے۔ اور بے اعتباری سے بے اعتباری۔ یہ فطرت کا قانون ہے۔ جس شخص کو ابتدا ہی سے شاطر۔ حریف۔ فتنہ باز سمجھ لیں گے۔ وہ کبھی آپ سے صفائی اور خوش معاملگی نہ برتے گا۔ وہ ضداً آپ کو زک دینے کی کوشش کرے گا۔ اس کے برعکس آپ ایک چور پر بھی اعتماد کریں۔ تو وہ آپ کا غلام ہو جائے گا۔ ساری دنیا کو لُوٹے پر آپ کو دغا نہ دیگا وہ کتنا ہی بدکار۔ سیاہ کار۔ حرام کار کیوں نہ ہو۔ پر آپ اس کے گلے میں اعتبار کی زنجیر ڈال کر اسے جس طرف چاہیں لے جا سکتے ہیں۔ حتےٰ کہ وہ آپ کے ہاتھوں میں نیکی کا آلہ بن سکتا ہے"۔

بنگالی بابو کے پاس ان فلسفیانہ دلیلوں کا کوئی جواب نہ تھا۔

(۴)

چوتھے سال کی پہلی ششماہی کی آخری تاریخ تھی۔ لالہ سائیں داس بینک کے دفتر میں بیٹھے ہوئے ڈاکئے کی راہ دیکھ رہے تھے۔ آج بریل سے پینتالیس ہزار روپیہ آئیں گے۔ اس لئے ششماہی منافع کا تخمینہ مرتب کر چکے تھے۔ اب کے ان کا ارادہ تھا کہ کچھ فرنیچر اور خرید لیں۔ اب تک بینک میں ٹیلی فون نہیں تھا۔ اس کا تخمینہ بھی طلب کر لیا تھا۔ اُمید کی مسرت چہرہ پر جھلک رہی تھی۔ مذاقاً کبھی بنگالی بابو سے کہتے۔ اس تاریخ کو میرے ہاتھوں میں خواہ مخواہ کھجلی ہونے لگتی ہے۔ آج بھی ہتھیلی کھجلا رہی ہے۔ کبھی دفتری سے کہتے۔ ارے میاں شفقت ذرا استخارہ تو کرو۔ محض سُود ہی سُود آ رہا ہے۔ یا دفتر والوں کے لئے کچھ نذرانہ شکرانہ بھی ہے۔ امید کا اثر شاید درو دیوار پر بھی ہوتا ہے

بینک آج شگفتہ نظر آتا تھا۔
ڈاکیہ عین وقت پر آیا۔ سائیں داس نے ایک شانِ استغنا سے اس کی طرف دیکھا اس نے اپنے تھیلے سے کئی رجسٹرڈ لفافے نکالے۔ سائیں داس نے ان لفافوں کو اڑتی ہوئی نگاہ سے دیکھا۔ برہل کا کوئی لفافہ نہ تھا۔ نہ بیمہ۔ نہ مہر نہ وہ تحریر۔ کچھ مایوسی سی ہوئی۔ جی میں آیا ڈاکیئے سے پوچھیں۔ کوئی اور رجسٹری رہ تو نہیں گئی۔ پر ضبط کیا۔ دفتر کے کلرکوں کے روبرو اتنی بے صبری شان کے خلاف تھی۔ مگر جب ڈاکیہ چلنے لگا۔ تو ان سے نہ رہا گیا۔ پوچھ ہی بیٹھے ہمارے بھی کوئی بیمہ شدہ لفافہ رہ تو نہیں گیا۔ آج اسے آنا چاہئے تھا۔ ڈاکیئے نے کہا۔ سرکار بھلا ایسی بات ہے اور کہیں بھول چوک ہو جائے پر حضور کے کام میں ایسی بھول ہو سکتی ہے؟
سائیں داس کا چہرہ اتر گیا۔ جیسے کچے رنگ پر پانی پڑ جائے۔ ڈاکیہ چلا گیا تو بنگالی بابو کی طرف خطاوار نگاہوں سے دیکھ کر بولے۔ یہ دیر کیوں ہوئی؟ پہلے تو کبھی ایسا نہ ہوتا تھا"
بنگالی بابو نے ناہمدردانہ انداز سے جواب دیا "کسی سبب دیری ہو گیا ہوگا۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے"۔
مایوسی محال کو ممکن بنا دیتی ہے۔ سائیں داس کو اس وقت یہ خیال ہوا کہ شاید پارسل سے روپے آتے ہوں۔ ہو سکتا ہے۔ تین ہزار اشرفیوں کا پارسل کر دیا ہو اگرچہ وہ کسی سے اس خیال کو ظاہر کرنے کی جرأت نہ کر سکے۔ پر انہیں یہ امید اس وقت تک لگی رہی۔ جب تک کہ پارسل والا پوسٹ مین واپس نہ گیا۔ آخر شام کو وہ ایک پریشانی کی حالت میں اٹھ کر گھر چلے گئے۔ اب خط یا تار کا انتظار تھا۔ دو تین بار جھنجلا کر اٹھے۔ کہ ڈانٹ کر ایک خط لکھوں اور صاف صاف کہہ دوں کہ ایسے معاملات میں وعدہ خلافی سخت معاملگی کا ثبوت دیتی ہے۔ ایک دن کی تاخیر بھی بینک کے لئے مہلک ہو

سکتی ہے۔ امید ہے کہ آئندہ ایسی شکایت کا موقعہ نہ ملے گا۔ مگر پھر کچھ سوچ کر نہ لکھا۔

شام ہوگئی تھی۔ کئی احباب آ گئے۔ گپ شپ ہونے لگی کہ پوسٹ مین نے آکر شام کی ڈاک سامنے رکھ دی۔ یوں وہ پہلے اخبار کو کھولا کرتے تھے۔ پر آج چٹھیاں کھولیں۔ مگر برہل کا کوئی خط نہ تھا۔ تب بے دلی کے ساتھ ایک انگریزی اخبار کھولا۔ اور پہلے ہی تار کا عنوان دیکھ کر ان کا خون سرد ہو گیا۔

کل شام کو رانی صاحبہ برہل نے تین دن کی بیماری کے بعد وفات پائی۔

اس کے آگے ایک مختصر نوٹ میں یہ مضمون درج تھا:۔

" رانی صاحبہ برہل کی مرگِ بے ہنگام صرف اس ریاست کے لئے نہیں بلکہ کل صوبے کے لئے ایک افسوس ناک سانحہ ہے۔ حکماء حاذق مرض کی تشخیص بھی نہ کر سکے تھے کہ موت نے قصہ تمام کر دیا۔ رانی صاحبہ کو اپنی ریاست کی بہتری کا خیال ہمیشہ مدنظر رہتا تھا۔ ان کے مختصر دورانِ حکومت میں ان کی ذات سے ریاست کو جو فیوض حاصل ہوئے ہیں۔ وہ عرصہ تک یادگار رہیں گے۔ اگرچہ یہ مسلّمہ امر تھا کہ ریاست ان کے بعد دوسرے ہاتھوں میں جائے گی۔ مگر یہ خیال رانی صاحبہ کے ادائے فرض میں کبھی مخل نہیں ہوا۔ قانوناً انہیں ریاست کی کفالت پر کسی قسم کے مالی معاملہ کرنے کا مجاز نہ تھا۔ مگر رعایا کے فلاح و اصلاح نے کئی موقعوں پر اس پابندی کو نظر انداز کرنے پر مجبور کیا۔ ہم کو یقین ہے کہ اگر ان کی زندگی نے چند سال اور وفا کی ہوتی۔ تو ریاست ان کفولیتوں سے سبکدوش ہو جاتی۔ انہیں شب و روز اس کی فکر تھی۔ قانونی پیچیدگیوں سے مغالطہ دینے کا گمان بھی انہیں کبھی نہیں ہوا۔ مگر بے وقت موت نے اب یہ فیصلہ دوسرے ہاتھوں میں دے دیا ہے۔ دیکھنا چاہئے۔ ان کفولیتوں کا کیا حشر ہوتا ہے۔ ہمیں معتبر وسائل سے معلوم ہوا ہے کہ نئے راجہ صاحب نے جو آج کل لکھنؤ

میں رونق افروز ہیں۔ اپنے وکلاء کے مشورے کے مطابق مرحومہ کے مالی مواخذات سے انکار کر دیا ہے۔ ہمیں خوف ہے کہ عنقریب لکھنؤ کے مالی حلقے میں ایک زبردست ہلچل پیدا ہوگی۔ اور کتنے ہی اصحاب زر کو سبق مل جائے گا کہ سود کی ہوس حزم و احتیاط کی قیدوں سے آزاد ہوکر کتنی مضرت کا باعث ہوتی ہے۔"

لالہ سائیں داس نے اخبار میز پر رکھ دیا۔ اور آسمان کی طرف تاکا۔ بابوسی کا آخری سہارا ہے۔ دوسرے احباب نے یہ خبر پڑھی۔ باہم اس مسئلہ کے قانونی پہلو پر گفتگو ہونے لگی۔ نوبت تکرار و حجت تک پہنچی۔ سائیں داس پر چاروں طرف سے بوچھاڑ پڑنے لگی۔ سارا الزام اس کے سر منڈھا گیا۔ اور ان کی ایک مدت کی کاروانی۔ معاملہ فہمی اور مآل اندیشی خاک میں مل گئی۔ بینک کے لیئے اتنا زبردست نقصان برداشت کرنا غیر ممکن تھا۔ اور اب یہ مسئلہ درپیش تھا کہ اس کا وجود کیونکر قائم رہے۔

(۵)

اس کے بعد ہفتوں تک متواتر صبح سے شام تک بینک میں بازکش معاملہ داروں کا تانتا لگا رہا۔ جن لوگوں کی رقمیں بغیر مدت کی قید کے جمع تھیں وہ ان کی واپسی پر بہ ضد تھے۔ اور کوئی عذر نہ سنتے تھے۔ معلوم نہیں یہ اسی اخبار کے نوٹ کا اثر تھا۔ یا رقیبوں کی خفیہ ریشہ دوانیوں کا۔ کہ انڈسٹریل بینک کے خلاف سارے شہر میں بدگمانی پھیلی ہوئی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ اگر لوگ صبر سے کام لیتے تو ایسی صورتیں پیدا ہو جاتیں۔ کہ بینک اس صدمہ سے جاں بر ہو جاتا۔ مگر شورش اور طوفان میں کون سی کشتی ساکت رہ سکتی ہے؟ آخر خزانچی نے انکاری جواب دینے شروع کر دیئے۔ بینک کی رگوں سے خون کی اتنی دھاریں نکلیں۔ کہ وہ بے جان ہو گیا۔

دو ماہ گزر گئے تھے۔ احاطہ میں ہزاروں سوداگران بینک جمع تھے۔ مگر مرنے والے کی آنکھیں بند تھیں۔ نبض ساکت۔ زبان خاموش۔ آہ دُکھا کی دل دوز صدائیں اٹھ رہی تھیں۔ پر یہ صدائے ماتم اس کے کانوں تک نہ پہنچتی تھی۔ بینک کے دروازے پر مسلح سپاہیوں کا پہرہ تھا۔ دم دم پر طرح طرح کی افواہیں اڑتی تھیں اور ہر ایک افواہ اس مجمع کثیر کو ہمہ تن گوش و ہمہ تن چشم بنا دیتی تھی۔ کبھی خبر اڑتی تھی کہ لالہ سائیں داس نے زہر کھا لیا۔ کوئی ان کی گرفتاری کی خبر لاتا تھا۔ کوئی کہتا تھا کہ ڈائرکٹر صاحبان زیر حراست ہو گئے۔

اور یہ کیفیت احاطہ ہی تک محدود نہ تھی۔ شہر میں کہرام مچا ہوا تھا۔ رونے والوں سے زیادہ دردناک حالت ان کی تھی۔ جن کی آنکھیں شرمندۂ غم نہ ہو سکتی تھیں۔ جنہیں خاندانی وقار خودداری پر مجبور کئے ہوئے تھا۔

آفتاب غروب ہو گیا۔ صبر میں انتظار کی طاقت نہ رہی۔ ڈوبنے والے آفتاب کی طرح وہ بھی مایوسی کی تاریکی میں ڈوب گیا۔ مجمع رفتہ رفتہ کم ہونے لگا۔ دفعتہً سڑک پر سے ایک موٹر نکلا۔ اور بینک کے سامنے آ کر رک گیا۔ کسی نے کہا۔ برہل کے راجہ صاحب کا موٹر ہے۔ اتنا سنتے ہی سیکڑوں آدمی وحشت کے عالم میں موٹر کی طرف دوڑے مگر شکوۂ بے داد کے لئے نہیں۔ صرف اس شخص کی صورت دیکھنے کے لئے جو ان کی کشتِ امید کا شرر تھا۔ جس کے ہاتھوں ان کی قسمتیں پامال ہو رہی تھیں۔

نوجوان کنور جگدیش سنگھ رانی صاحبہ کی وفات کے بعد وکیلوں سے قانونی مشورہ لینے کے لئے لکھنؤ آئے ہوئے تھے۔ رئیسانہ لوازمات کی خرید بھی ضروری تھی۔ وہ آرزوئیں جو ایک مدت سے اسی موقع کی منتظر تھیں۔ اب بندھے ہوئے پانی کی طرح راہ پا کر ابلی پڑتی تھیں۔ یہ موٹر آج ہی لیا تھا۔ شہر میں ایک بنگلہ کے متعلق بات چیت ہو رہی تھی۔ بیش قیمت فرنیچر اور شیشہ آلات کی ایک گاڑی برہل روانہ ہو چکی تھی۔

انگریزی جوہری بھی ان کی قدردانیوں سے محروم نہ تھے۔ ارباب نشاط کی مجلسیں روزانہ آراستہ ہوتیں۔ یہاں سے فرصت ملتی تو تھیٹر کی باری آتی۔ چڑیا قفس سے آزاد ہوکر ہر ایک ڈالی پر چہکتی پھرتی تھی۔ یہ مجمع دیکھا تو خیال کیا کہ کوئی نیا تماشا ہونے والا ہے۔ موٹر روک دیا کہ اتنے میں صدہا آدمیوں نے آکر موٹر کو گھیر لیا۔

کنور صاحب نے پوچھا "یہاں آپ لوگ کیسے جمع ہیں؟ کوئی تماشا ہونے والا ہے کیا؟"

ایک صاحب جو وضع سے کوئی بگڑے رئیس معلوم ہوتے تھے۔ بولے "جی ہاں! بڑا دلچسپ تماشا ہے۔"

کنور "کس کا تماشا ہے؟"۔

"قسمت کا"

کنور صاحب کو اس جواب پر حیرت تو ہوئی۔ مگر سنتے آئے تھے کہ لکھنؤ والے بات بات میں شاعری کیا کرتے ہیں۔ اس لئے اسی انداز سے جواب دینا بھی ضروری معلوم ہوا۔ بولے "قسمت کا تماشا دیکھنے کے لئے یہاں آنا تو ضروری نہیں"۔

لکھنوی حضرت نے فرمایا۔ جناب کا فرمانا بجا ہے۔ مگر دوسری جگہ یہ لطف کہاں؟ یہاں آج صبح سے شام تک قسمت نے کتنوں ہی کو امیر سے غریب اور کتنوں ہی کو غریب سے فقیر بنا دیا۔ صبح کو جو لوگ محلوں میں بیٹھے تھے۔ اس وقت انہیں درخت کی چھاؤں بھی میسر نہیں۔ جن کے دروازے پر زکوٰۃ بٹتی تھی۔ اس وقت روٹیوں کو محتاج ہیں۔ ابھی ایک ہفتہ قبل جو لوگ شکوۂ روزگار اور نیرنگیٔ تقدیر اور جورِ فلک کو شاعرانہ استعارات سمجھا کرتے تھے۔ اس وقت ان کی آہ وزاری نالۂ عشق کو بھی شرمندہ کر رہی ہے ایسے عبرت خیز تماشے اور کہاں دیکھنے میں آئیں گے"

کنور صاحب اب اپنی حیرت کو نہ چھپا سکے۔ پوچھا "جناب آپ نے تو معمّے

کو اور بھی پیچیدہ کر دیا۔ میں دہقانی آدمی ہوں۔ مجھ سے نثر میں بات کیجئے۔"

اس پر ایک جنٹلمین نے فرمایا "حضرت! یہ انڈسٹریل بینک ہے۔ اس کا دیوالہ ہو گیا ہے۔ آداب عرض ہے۔ بندہ کو پہچانا؟" کنور صاحب نے ان کی طرف دیکھا تو موٹر سے اُچھل پڑے اور نیچے آکر ان سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولے "ارے مسٹر نسیم؟ تم یہاں کہاں؟ یار تم سے مل کر روح تازہ ہو گئی۔"

مسٹر نسیم کنور صاحب کے ساتھ ڈیرہ دون کالج میں پڑھتے تھے۔ دونوں ساتھ ساتھ ڈیرہ دون کی پہاڑیوں کی سیر کرنے جایا کرتے۔ مگر جب سے کنور صاحب نے خاندانی حالات سے مجبور ہو کر کالج چھوڑا۔ دونوں دوستوں میں ملاقات نہ ہوتی تھی۔ نسیم بھی اُن کے آنے کے تھوڑے ہی دنوں بعد اپنے وطن لکھنؤ چلے آئے تھے۔

نسیم نے جواب دیا "شکر ہے۔ آپ نے پہچانا تو۔ کہئے اب تو پو بارہ ہیں۔ کچھ دوستوں کی بھی خبر ہے؟"

کنور۔ "یار مبالغہ نہیں۔ تمہاری یاد ہمیشہ آیا کرتی تھی۔ کہو آرام سے تو ہو؟ میں رائل ہوٹل میں ٹھیرا ہوا ہوں۔ آج آؤ۔ تو اطمینان سے باتیں ہوں۔"

نسیم۔ "جناب اطمینان تو انڈسٹریل بینک کے ساتھ رخصت ہوا۔ اب تو فکرِ معاش سر پر سوار ہے۔ جو کچھ جمع جتھا تھی وہ آپ کے نذر ہوئی۔ اس دیوالہ نے فقیر بنا دیا۔ اب آپ کے آستانوں پر آکر دھرنا دونگا۔"

کنور۔ "یار تمہارا گھر ہے۔ بے تکلف آؤ۔ میرے ساتھ ہی کیوں نہ چلو؟ کیا بتاؤں مجھے مطلق معلوم نہ تھا کہ میری دست کشی کا یہ اثر ہوگا۔ معلوم ہوتا ہے۔ بینک نے بہتیروں کو تباہ کر دیا۔"

نسیم۔ "گھر گھر کہرام مچا ہوا ہے۔ میرے پاس اس جسم پر کے کپڑوں کے سوا اور کچھ نہیں رہا۔"

اتنے میں ایک تلک دھاری پنڈت جی آ گئے۔ اور بولے "مہاراج! آپ کے جسم پر کپڑے تو ہیں۔ یہاں تو دھرتی آکاش کہیں ٹھکانا نہیں ہے۔ میں راگھو جی پاٹ سالا کا ادھیاپک ہوں۔ پاٹ سالا کا سب روپیہ اسی بینک میں جمع تھا۔ پچاس ودیارتھی اس کی بدولت سنسکرت پڑھتے تھے۔ اور بھوجن پاتے تھے۔ کل سے پاٹ سالہ بند ہو جائے گا۔ دور دور کے ودیارتھی ہیں۔ وہ اپنے گھر کیسے پہنچیں گے۔ یہ ایشور ہی جانے۔"

ایک صاحب جن کے سر پر پنجابی وضع کی پگڑی تھی۔ گاڑھے کا کوٹ اور چمرودھا جوتا پہنے ہوئے تھے۔ آگے بڑھ آئے اور ایک شان نیابت سے بولے۔ "جناب اس بینک کے فیلیور نے کتنے ہی انسٹی ٹیوشنوں کا خاتمہ کر دیا۔ لالہ دینا ناتھ کا یتیم خانہ اب ایک دن بھی نہیں چل سکتا۔ اس کا ایک لاکھ روپیہ ڈوب گیا۔ ابھی پندرہ دن ہوئے ہیں۔ ڈیپوٹیشن سے لوٹا۔ تو پندرہ ہزار روپے یتیم خانے کے فنڈ میں جمع کئے تھے۔ مگر اب کہیں کوڑی کا بھی ٹھکانا نہیں۔"

ایک کہن سال بوڑھے نے کہا "صاحب میری تو عمر بھر کی کمائی مٹی میں مل گئی۔ اب کفن کا بھی بھروسہ نہیں۔"

رفتہ رفتہ اور لوگ جمع ہو گئے۔ اور عام گفتگو ہونے لگی۔ ہر شخص اپنے قریب کے آدمی کو اپنی مصیبت کی داستان سنانے لگا۔ کنور صاحب آدھ گھنٹہ تک نسیم کے ساتھ کھڑے یہ فسانۂ غم سنتے رہے۔ جوں ہی موٹر پر بیٹھے اور ہوٹل کی طرف چلنے کا حکم دیا۔ ان کی نگاہ ایک خستہ حال آدمی کی طرف گئی۔ جو زمین پر سر جھکائے بیٹھا تھا۔ یہ ایک اہیر تھا۔ کنور صاحب کے ساتھ بچپن میں کھیلا تھا۔ اس وقت ان میں رتبہ کی یہ تمیز نہ تھی۔ کنور صاحب نے بار بار اس کی دھولیں کھائی تھیں۔ اس کی گالیاں سنی تھیں۔ دونوں ساتھ کبڈی کھیلتے تھے۔ ساتھ پیڑوں پر چڑھ کر چڑیوں کے بچے چراتے تھے۔ جب کنور صاحب ڈیرہ دون پڑھنے گئے۔ تو یہ اہیر کا لڑکا شیو داس اپنے باپ کے ساتھ

لکھنؤ چلا آیا۔ جس نے یہاں ایک دودھ کی دکان کھول لی تھی۔ کنور صاحب نے اُسے پہچانا۔ اور زور سے پکارا ۔" ارے شیو داس! ادھر دیکھو"۔ شیو داس نے آواز سنی مگر سر اُوپر نہ اٹھایا۔ وہ اپنی جگہ پر بیٹھا ہوا کنور صاحب کو دیکھ رہا تھا۔ بچپنے کے وہ دن یاد آرہے تھے۔ جب وہ جگدیش کے ساتھ گلی ڈنڈا کھیلتا تھا۔ جب دونوں بُڈھے غفور میاں کا منہ چڑا کر گھر میں چُھپ جاتے تھے۔ جب وہ اشارے سے جگدیش کو ماسٹر کے پاس سے بُلا لیا کرتا۔ اور دونوں رام لیلا دیکھنے چلے جاتے۔ اسے یقین تھا کہ کنور صاحب مجھے بھُول گئے ہوں گے۔ وہ بچپن کی باتیں اب کہاں۔ کہاں میں اور کہاں وہ ۔ لیکن جب کنور صاحب نے اس کا نام لے کر پکارا تو بجائے اس کے کہ وہ خوش ہو کر ان سے ملے۔ اس نے اور بھی سر جھکا لیا۔ اور وہاں سے سرک جانا چاہا۔ کنور صاحب کا اخلاق اب اس خلیج پر حاوی نہیں ہو سکتا تھا۔ جو ان کے اور اس کے درمیان حائل تھی۔ مگر کنور صاحب اسے کھسکتے دیکھ کر موٹر سے اُتر کر اس کے پاس آگئے اور اس کا ہاتھ پکڑ کر بولے ۔" ارے شیو داس کیا مجھے بھول گئے؟"

شیو داس کو اس آواز میں پُرانی بے تکلفی کا احساس ہوا۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ کنور صاحب کے گلے سے لپٹ گیا۔ اور بولا۔" بھُولا تو نہیں۔ پر آپ کے سامنے آتے ہوئے شرم آتی ہے"۔

کنور ۔ یہاں دُودھ کی دکان کرتے ہو کیا؟ مجھے معلوم ہی نہ تھا۔ نہیں تو ایک ہفتہ سے پانی پیتے پیتے زکام کیوں ہوتا؟ آؤ اس موٹر پر بیٹھ جاؤ۔ میرے ساتھ ہوٹل تک چلو۔ تم سے باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے۔ تمہیں بریلی لے چلوں گا۔ اور ایک بار پھر گلی ڈنڈے کھیلیں گے"۔

شیو داس ۔" ایسا نہ کیجئے۔ نہیں تو دیکھنے والے ہنسیں گے۔ میں ہوٹل میں آجاؤں گا دس حضرت گنج والے ہوٹل میں ٹھیرے ہیں نہ"۔

کنور۔ "ضرور آؤ گے نہ؟"
شیوداس "آپ بلائیں گے اور میں نہ آؤں گا؟"
کنور۔ "یہاں کیسے بیٹھے ہو۔ دکان تو چل رہی ہے نہ؟"
شیوداس "آج صبح تک تو چلتی تھی۔ پر آگے کا حال نہیں معلوم؟"
کنور "تمہارے روپے بھی بینک میں جمع تھے کیا؟"
شیوداس "اب آؤں گا تو بتاؤں گا"۔
کنور صاحب موٹر پر آ بیٹھے۔ اور شوفر سے کہا۔ "ہوٹل کی طرف چلو"۔
شوفر۔ "حضور نے وہائٹ وے کمپنی کی دکان پر چلنے کا حکم دیا تھا"۔
کنور۔ "اب اُدھر نہ جاؤں گا"۔
شوفر۔ "جیکب صاحب بالسٹر کے یہاں بھی نہ چلوں"؟
کنور۔ (جھنجلاکر) "نہیں کہیں مت چلو۔ مجھے سیدھے ہوٹل پہنچا دو"۔
یاس و درد کے ان نظاروں نے جگدیش سنگھ کے دل میں سوال پیدا کر دیا تھا۔
"اب میرا کیا فرض ہے"؟

(۶)

آج سے سات برس پہلے جب برہل کے راجہ صاحب نے عین عالم شباب میں گھوڑے سے گر کر وفات پائی۔ اور وراثت کا مسئلہ پیش ہوا۔ تو راجہ صاحب کے کوئی اولاد نہ تھی۔ خاندانی سلسلہ میں ان کے حقیقی چچا زاد بھائی ٹھاکر رام سنگھ کو وراثت کا حق پہنچتا تھا۔ انہوں نے دعوےٰ کیا۔ مگر عدالتوں نے راجہ صاحب کی بیوی کے حق میں فیصلہ کیا۔ ٹھاکر صاحب نے اپیلیں کیں۔ پریوی کونسل تک گئے۔ مگر کامیاب نہ ہوئے۔ مقدمہ بازی میں لاکھوں روپے صرف ہو گئے۔ اپنے حصہ کی جائداد

بھی ہاتھ سے نکل گئی۔ مگر مقدمہ ہارنے پر بھی وہ اطمینان سے نہیں بیٹھے۔ ہمیشہ بیوہ رانی صاحبہ کو چھیڑتے رہتے۔ کبھی اسامیوں کو بھڑکاتے۔ کبھی حکام کو رانی صاحبہ سے بدظن کرتے۔ کبھی فرضی مقدمات میں پھنسانے کی کوشش کرتے۔ مگر رانی صاحبہ بھی بڑے جیوٹ کی عورت تھیں۔ وہ ٹھاکر صاحب کے ہر ایک وار کا دندان شکن جواب دیتیں۔ ہاں اس کشمکش میں انہیں کثیر رقمیں خرچ کرنا پڑتیں۔ اسامیوں سے روپے نہ وصول ہونے اس لئے بار بار قرض لینے پڑتے تھے۔ مگر چونکہ قانوناً وہ ریاست کی کفولیت پر قرض لینے کی مجاز نہ تھیں۔ اس لئے انہیں یا تو اس قانونی پیچیدگی کو چھپانا پڑتا تھا۔ یا سود کی بہت اونچی شرح قبول کرنا پڑتی تھی۔

کنور جگدیش سنگھ کا زمانہ طفولیت تو ناز و نعمت میں کٹا تھا۔ مگر جب ٹھاکر رام سنگھ ان مقدمہ بازیوں سے بہت زیر بار ہو گئے۔ اور یہ اندیشہ بھی ہوا کہ کہیں رانی صاحبہ کی سازشوں سے کنور صاحب کی جان خطرہ میں نہ پڑ جائے تو انہوں نے مجبور ہو کر کنور صاحب کو ڈیرہ دون بھیجدیا۔ کنور صاحب وہاں دو سال تک آرام سے رہے۔ لیکن جونہی وہ کالج کی پہلی جماعت میں داخل ہوئے۔ ٹھاکر صاحب راہی ملک عدم ہو گئے۔ کنور صاحب کو سلسلۂ تعلیم قطع کرنا پڑا۔ بریل چلے آئے۔ سر پر خاندان کی پرورش اور رانی صاحبہ سے پرانی عداوت نبھانے کا بار آپڑا۔ اس وقت سے رانی صاحبہ کی وفات تک ان کی حالت بہت ابتر رہی۔ آمدنی کا ذریعہ یا تو قرض تھا یا مستورات کے زیور۔ اس پر خاندانی وقار کے قائم رکھنے کی فکر۔ یہ تین سال ان کے لئے سخت آزمائش کے دن تھے۔ ساہوکاروں سے آئے دن سابقہ رہتا تھا۔ ان کے تیر ستم سے جگر میں ناسور پڑ گیا تھا۔ حکام کی سخت گیریاں اور بدعتیں بھی برداشت کرنا پڑتیں۔ مگر سب سے دل خراش اپنے عزیزوں اور یگانوں کا برتاؤ تھا۔ جو سامنے وار نہ کر کے بغلی چوٹیں کرتے تھے۔ دوستی اور یگانگت کے پردہ میں دغا کے ہاتھ چلاتے تھے۔ ان تجربات تلخ نے کنور صاحب

کو اختیار اور ثروت اور دولت کا جانی دشمن بنا دیا تھا۔ وہ نہایت ذکی الحس آدمی تھے۔ اور یگانوں کی بے مہریاں اور ابنائے وطن کی بے وفائیاں ان کے دل پر داغ سیاہ بنتی جاتی تھیں۔ ادبیات کے ذوق نے انہیں انسانی فطرت کے مطالعہ کا خوگر بنا دیا تھا اور یہ مطالعہ جہاں انہیں روز بروز مہذب طبقہ سے دور لئے جاتا تھا۔ وہاں ان کے دل میں جمہوریت اور غریب دوستی کے خیالات راسخ کرتا جاتا تھا۔ ان پر روشن ہو گیا تھا کہ سچی انسانیت اگر زندہ ہے تو جھونپڑوں میں اور افلاس میں یہیں اس مصیبت کے زمانے میں جب چاروں طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ انہیں کبھی کبھی سچی ہمدردی اور خلوص کی روشنی نظر آجاتی تھی۔ اسی طبقہ میں وفادار اور غم گسار دوست ملتے تھے۔ دولت اور ثروت ان کی نگاہ میں ظاہرداری اور تکلف کا مترادف تھی۔ وہ اسے نعمت عظمیٰ کے بجائے قہر الہٰی سمجھتے تھے۔ جو انسان کے دل سے انسانیت اور محبت کے جذبات کو مٹا دیتی ہے۔ وہ ابر سیاہ ہے جو دل کے روشن تاروں پر چھا جاتی ہے۔

مگر رانی صاحبہ کی وفات کے بعد جونہی دولت اور ثروت نے ان پر وار کیا۔ فلسفیانہ خیالات کی یہ سپر پاش پاش ہوگئی۔ دل پر ایک خود فراموشی کا نشہ چھا گیا۔ تحقیق باطن کی قوت زائل ہوگئی۔ وہ لوگ دوست ہو گئے جنہیں وہ دشمن سمجھتے تھے۔ اور جو سچے ہمدرد اور دوست تھے۔ وہ تغافل اور سرد مہری کی زد میں آگئے۔ جمہوریت کے دلائل میں حیرت انگیز ترمیم شروع ہوئی۔ ایک متحملانہ رواداری کا احساس رونما ہوا۔ فلسفہ یاس نے فلسفہ امید کو جگہ دی۔ حفظ وقار اور مناسبت حال کی زنجیر گلے میں پڑی۔ شعلۂ درد انگیز قفس بلوریں میں روپوش ہوا۔ دولت اور ثروت کے مینار بلند نے افلاس کے جھونپڑوں کو نظر سے پوشیدہ کر دیا۔ آئین و مراسم نے زبان پر مہر احتیاط لگا دی۔ وہ ارباب اختیار جنہیں دیکھ کر ان کے تیور بدل جاتے تھے۔ اب ان کے مشیر ہو گئے۔ بے نوائی اور برہنگی اور قناعت جو ان کی دلسوزیوں کی منظور نظر تھی۔ اب اسے دیکھ

کہ اُن کی آنکھیں جھک جاتی تھیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ کنور صاحب اب بھی جمہوریت کے قائل تھے۔ مگر ان کے اظہار میں وہ پہلے کی سی آزادی نہ تھی۔ قول اب فعل سے قریب تر ہو جانے کے باعث باہر نکلتے ہوئے ڈرتا تھا۔ وہ پہلے کی سی طرّار و تیز شمشیر برہنہ نہ تھی۔ اس میں اب زنگ لگ گیا تھا۔ قول کے عملی پہلو کو اب وہ نظرانداز نہ کر سکتے تھے اور میدانِ عمل انہیں دشواریوں سے پُر نظر آتا تھا۔ بیگار کے وہ جانی دشمن تھے۔ مگر بیگار کو بند کرنا مشکل معلوم ہوتا تھا۔ صحت و صفائی کے زبردست موید تھے۔ مگر اب خرچ سے قطع نظر باشندوں ہی کی طرف سے انحراف کا گمان ہوتا تھا۔ اسامیوں کے ساتھ لگان کے لئے سختی و جبر کو وہ شرک سمجھتے تھے۔ مگر اب وہ ضروری نظر آتی تھی۔ غرض کتنے ہی اصول جو پہلے جزو ایمان بن چکے تھے۔ اب دائرہ عمل سے خارج ہونے جاتے تھے۔

مگر آج بینک کے احاطہ میں جو دردناک نظارے ان کی نگاہ سے گذرے۔ ان کے خفیہ جذبات درد کے لئے بانگ سحر کا کام کر گئے۔ بےکسی اور مجبوری کے وہ دلفگار نالے گوشۂ جگر میں چبھ گئے۔ اس شخص کی سی حالت ہو گئی۔ جو کشتی پر بیٹھا دریا کے پُر فضا ساحل کی سیر کرتا ہوا یکایک مرگھٹ کے سامنے آ جائے۔ چتا پر لاشیں جلتے ہوئے دیکھے سوگواروں کی آہ و زاریاں سُنے۔ اور کشتی سے اتر کر سوگواروں کے ماتم میں شریک ہو جائے۔

رات کے دس بج گئے تھے۔ کنور صاحب پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے۔ احاطہ بینک کا منظر آنکھوں کے سامنے پھر رہا تھا۔ وہی صدائیں کانوں میں گونج رہی تھیں دل میں سوال ہو رہا تھا۔ کیا اس تباہی و بربادی کا باعث میں ہوں؟ میں نے وہی کیا۔ جس کا مجھے قانوناً اور اخلاقاً پورا مجاز تھا۔ یہ بینک کے کارکن لوگوں کی غلطی ہے کہ انہوں نے بغیر کافی ضمانت کے اتنی بڑی رقم قرض دے دی۔ معاملہ داروں کو انہیں کی گردن پکڑنی

چاہئے۔ میں کوئی خدائی فوجدار نہیں ہوں کہ دوسروں کی حماقتوں کا خمیازہ اُٹھاؤں۔ ناحق اس ہوٹل میں ٹھہرا۔ چالیس روپیہ روز دینے پڑینگے۔ کوئی چار سو روپے کے متھے جائے گی۔ اتنا سامان بھی بیکار لیا۔ کیا ضرورت تھی مخملی گدے کی کرسیوں سے یا شیشہ آلات کی سجاوٹ سے میری حقیقی شان نہیں بڑھ سکتی۔ کوئی معمولی مکان پانچ روپیہ روزانہ پر لے لیتا۔ تو کیا کام نہ چلتا۔ میں اور ساتھ کے سب آدمی آسائش سے رہتے۔ یہی ہوتا نا؟ کہ لوگ بدنام کرتے۔ اس کی کیا پروا۔ جن لوگوں کے ملنے پر ٹھاٹ کر رہا ہوں وہ غریب تو روٹیوں کو بھی محتاج ہیں۔ یہ دس بارہ ہزار روپے لگا کر اگر کنوئیں بنوا دیتا تو ہزاروں غریبوں کا بھلا ہو جاتا۔ اب آئندہ سے لوگوں کے چکمے میں نہ آؤں گا۔ یہ موٹر کار بالکل فضول ہے۔ میرا وقت اتنا قیمتی نہیں ہے کہ گھنٹہ آدھ گھنٹہ کی کفایت کی خاطر دو سو روپیہ مہینہ خرچ بڑھا لوں۔ فاقہ کش آسامیوں کے سامنے موٹر دوڑانا ان کی چھاتیوں پر مونگ دلنا ہے۔ مانا کہ وہ رعب میں آجائینگے جدھر سے نکل جاؤں گا۔ سینکڑوں بچے اور عورتیں تماشا دیکھنے کے لئے گھروں سے نکل آئیں گی۔ پر محض اتنی سی تسکین نخوت کے لئے اتنا خرچ بڑھانا حماقت ہے۔ اگر دوسرے رئوساء ایسا کرتے ہیں۔ تو کریں۔ میں ان کی ریس کیوں کروں۔ اب تک دو ہزار روپیہ سالانہ میں میرا گزر ہو جاتا تھا۔ اب دو کے بدلے چار ہزار بہت ہیں اور پھر مجھے دوسروں کی کمائی کی یوں اڑانے کا مجاز ہی کیا ہے؟ میں کوئی محنت نہیں کرتا کوئی تجارت کوئی کاروبار نہیں کرتا۔ جس کا یہ نفع ہو۔ اگر میرے بزرگوں نے اپنی ہٹ دھرمی اور زبردستی سے کچھ علاقہ اپنے قبضہ میں کر لیا۔ تو مجھے ان کے مال غنیمت میں شریک ہونے کا کیا حق ہے؟ جو لوگ محنت کرتے ہیں۔ انہیں اپنی محنت کا پورا ثمرہ ملنا چاہئے۔ سلطنت انہیں صرف دوسروں کی دست بُرد سے بچاتی ہے۔ اس خدمت کا اسے مناسب معاوضہ ملنا چاہئے۔ بس۔ میں تو سلطنت کی طرف سے یہ

معاوضہ وصول کرنے کے لئے مامور ہوں ۔ اس کے سوا میرا ان غریبوں کی کمائی میں اور کوئی حق نہیں ہے ۔ یہ بے چارے مفلس ہیں ۔ جاہل ہیں ۔ بے زبان ہیں ۔ اس لئے فی الحال ہم انہیں جتنا چاہیں ستالیں ۔ انہیں اپنے حقوق کی خبر نہیں ۔ اپنی اہمیت کو نہیں سمجھتے ۔ ہم انہیں جتنا چاہیں پامال کرلیں ۔ پر ایک دن ضرور آئیگا جب ان کے منہ میں بھی زبان ہو گی ۔ اپنے حقوق سمجھیں گے اور تب وائے بر حال ما ۔ یہ تکلفات مجھے اپنی اسامیوں سے دور کئے دیتے ہیں ۔ میری شان اسی میں ہے کہ انہیں میں رہوں ۔ انہیں کی معاشرت اختیار کروں اور ان کی مدد کروں ۔

ہاں تو اس بینک کو کیا کروں ؟ کوئی چھوٹا موٹا معاملہ ہوتا ۔ تو کہتا لاؤ ۔ جہاں اور سر پر بہت سے بوجھ ہیں ۔ وہاں اتنا اور سہی ۔ پر دس لاکھ بہت ہوتے ہیں ۔ پچاس ہزار سود کے الگ ہوئے اور پھر مہاجنوں کے بھی تو تین لاکھ روپے آتے ہیں ۔ ریاست کی آمدنی ڈیڑھ دو لاکھ روپیہ سالانہ سے زیادہ نہیں ہے ۔ میں اتنا بڑا حوصلہ کروں بھی تو کس برتے پر ؟ ہاں اگر فقیری اختیار کرلوں تو البتہ شاید میری زندگی میں (بشرطیکہ ناگہانی موت نہ آجائے) یہ قضیہ پاک ہو سکے ۔ آرزوؤں کو خاکستر کرنا ہے ۔ آہ ! اس دن کے انتظار میں ہم نے کیا کیا مصیبتیں نہیں جھیلیں ۔ والد صاحب نے اسی کوفت میں جان دی ۔ یہ روز سعید ہمارے ایام تاریک کی دور افتادہ مشعل تھی ۔ ہم اسی کے سہارے زندہ تھے ۔ سوتے جاگتے ہمیشہ اسی کے چرچے رہتے تھے ۔ اس سے دل کو کتنی تقویت ، کتنا غرور تھا ۔ فاقہ کشی میں بھی ہمارے تیور نہ میلے ہوتے تھے ۔ جب صبر و انتظار کے بعد ایام نیک آئے ۔ تو میں اس سے بے رخی کیونکر کروں زندگی کی تمناؤں پر پانی کیونکر پھیروں ؟ اور کچھ اپنی ذاتی تمناؤں تک تو خاتمہ نہیں ۔ ریاست کی ترقی اور اصلاح کی کتنی تجویزیں دل میں قائم کر چکا ہوں ۔ کیا اپنی تمناؤں کے ساتھ ان تجویزوں کو بھی ڈبو دوں ؟ اس کم بخت رانی نے مجھے بری طرح پھانسا ہے

جب تک زندہ رہی۔ کبھی چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ مری تو تباہی کا سامان کر گئی۔ مگر میں افلاس سے اتنا ڈرتا کیوں ہوں؟ افلاس کوئی گناہ نہیں ہے۔ اگر میری آرزوؤں کا خون۔ اگر میری زندگی کی قربانی ہزاروں خاندانوں کو تباہی اور خستہ حالی سے بچالے تو مجھے اس قربانی سے دریغ نہ ہونا چاہیے۔ آسائش سے زندگی بسر کرنا ہی تو ہماری زندگی کا مقصد نہیں ہے۔ کیا یہ تسکین کا باعث نہیں ہے کہ میری خانہ ویرانی صدہا گھروں کی آبادی کا وسیلہ ہو؟ ہماری عزت اور شہرت اور یادگار ہماری تن آسانیوں سے نہیں ہوا کرتی۔ محلوں میں رہنے والے اور دنیا کی نعمتوں کا لطف اٹھانے والے رانا پرتاپ کو کون جانتا؟ یہ اس کی تکلیفیں۔ اس کی قربانیاں۔ اس کی فاقہ کشیاں ہیں۔ جنہوں نے اُسے ہماری قوم کا آفتاب بنا دیا ہے۔ رامچندر نے اگر اپنی زندگی عیش و عشرت میں بسر کی ہوتی۔ تو آج ہم ان کا نام بھی نہ جانتے۔ ان کی قربانیوں ہی نے انہیں زندہ جاوید بنا دیا ہے۔ ہماری عظمت ہماری دولت اور ہمارے سامانِ عیش سے بے نیاز ہے۔ میں موٹر پر سوار ہوا۔ تو کیا۔ اور ٹٹو پر سوار ہوا۔ تو کیا؟ ہوٹل میں ٹھیرا تو کیا۔ اور کسی معمولی مکان میں ٹھیرا تو کیا؟ بہت ہو گا۔ تو میرے تعلقہ دار بھائی مجھ سے کنارہ کش رہیں گے۔ میرے حوالی موالی مجھ سے الگ ہو جائیں۔ اس کی مجھے پروا نہیں ہے۔ میں تو دل سے چاہتا ہوں کہ ان لوگوں سے الگ تھلگ رہوں۔ اگر محض اپنی تکلیف سے صدہا خاندانوں کا بھلا ہو جائے۔ تو میں انسان نہیں ہوں۔ اگر اسے شوق سے قبول نہ کر دوں۔ اگر اپنے گھوڑے اور فٹن۔ سیر و شکار۔ نوکر چاکر اور زمانہ ساز اعزہ و آتش خواروں سے محروم ہو کر میں ہزاروں امیر و غریب خاندانوں کا۔ بیواؤں کا۔ یتیموں کا بھلا کر سکوں۔ تو مجھے اس میں مطلق تامل نہ ہونا چاہیے۔ ہزاروں خاندانوں کی قسمت اس وقت میری مٹھی میں ہے۔ میری تن پروری ان کا زہر قاتل اور میری نفس کشی ان کا آبِ حیات ہے۔ میں آبِ حیات بن سکتا ہوں تو زہر قاتل کیوں بنوں اور پھر اسے نفس کشی سمجھنا بھی میری زیادتی ہے۔ یہ بالکل

ناانصافی امر ہے کہ میں آج اس جائداد پر قابض ہوں ۔ میں نے اسے کمایا نہیں ۔ حاصل نہیں کیا ۔ اس کے لئے خون نہیں گرایا ۔ پسینہ نہیں بہایا ۔ اگر مجھے یہ جائداد نہ ملتی ۔ تو آج اپنے لاکھوں بھائیوں کی طرح میں بھی فکر معاش میں مصروف ہوتا ۔ میں کیوں نہ بھول جاؤں کہ میں اس ریاست کا مالک ہوں ۔ ایسی ہی آزمائشوں میں انسانیت کی پہچان ہوتی ہے ۔ میں نے برسوں کتب بینی کی ۔ برسوں انسانی فلاح کے اصول کا قائل رہا ۔ یقیناً یہ میری انتہا درجہ کی بزدلی نفس پرستی ہے ۔ اگر اس موقعہ پر میں ان تمام اصولوں کو بھلادوں ۔ خودغرضی کو انسانیت اور اخلاق پر غالب آجانے دوں ۔ خودغرضی کا سبق سیکھنے کے لئے مجھے گیتا اور مل اور انسیں اور ارسطو کے شاگرد بننے کی کیا ضرورت تھی ۔ یہ سبق تو مجھے اپنے دوسرے بھائیوں سے مفت مل جاتا ۔ عام رواج سے بہتر اور کون اُستاد تھا ؟ عام آدمیوں کی طرح میں بھی خودغرضی اور ہوس پرستی کے آگے سر جھکا دوں تو پھر خصوصیت کہاں رہی ؟ نہیں میں کنونشن (رواج) کی غلامی نہ کروں گا ۔ جہاں ثواب کر سکتا ہوں ۔ عذاب نہ کروں گا ۔ جہاں دعا مل سکتی ہے ۔ آہ نہ لوں گا ۔ ایشور تم میری مدد کرو ۔ تم نے مجھے راجپوت کے گھر پیدا کیا ہے ۔ میری ذات سے اس جانباز قوم کو شرمندہ مت کرو ۔ نہیں ہرگز نہیں ۔ یہ گردن خودغرضی کے آگے نہیں جھکے گی ۔ میں رام اور بھیشم اور پرتاپ کا جانشین ہوں ۔ تن پروری کا غلام نہ بنوں گا ۔ نفس کی اطاعت نہ کروں گا ۔

کنور جگدیش سنگھ کو اس وقت ایسا احساس ہوا ۔ گویا وہ کسی اُونچے مینار پر چڑھ گئے ہیں ۔ دل میں امنگ آگئی ۔ آنکھیں روشن ہوگئیں ۔ مگر ایک ہی لمحہ کے بعد اس اُمنگ کا اتار ہونے لگا ۔ اونچے مینار سے نیچے کی طرف آنکھیں گئیں ۔ سارا جسم کانپ اٹھا ۔ سر میں چکر سا آگیا ۔ اس آدمی کی سی حالت ہوئی ۔ جو کسی ندی کے کنارے بیٹھا ہوا اس میں کودنے کا ارادہ کر رہا ہو ۔

انہوں نے سوچا۔ کیا میرے گھر کے لوگ مجھ سے متفق ہوں گے؟ اور اگر وہ میری خاطر سے متفق ہو بھی جائیں تو مجھے مجاز ہے کہ اپنے ساتھ ان کی تمناؤں کا بھی خون کروں؟ اور نواور ماتاجی کبھی نہ مانیں گی۔ اور غالباً بھائی لوگ بھی گریز کریں۔ ریاست کی حیثیت کے لحاظ سے وہ کم سے کم دس ہزار سالانہ کے مستحق ہیں۔ اور ان کے حق کو میں کسی طرح نظرانداز نہیں کر سکتا۔ میں صرف اپنی ذات کا مختار ہوں۔ مگر میں بھی تو تنہا نہیں ہوں۔ ساوتری آپ، چاہے میرے ساتھ آگ میں کودنے کو تیار ہو جائے۔ مگر اپنے پیارے لختِ جگر کو کبھی اس آنچ کے قریب نہ آنے دے گی۔

کنور صاحب نہایت خطرناک زمین پر قدم رکھ رہے تھے اور ہر ایک قدم انہیں بلاتا تھا کہ آگے مت بڑھو۔ انہوں نے اپنے چھوٹے بچے کو بڑے ناز و نعمت سے پالا تھا۔ نکبت و ادبار کے زمانہ میں بھی اس کی پرورش میں کوئی کمی نہ ہونے پائی تھی۔ کنور صاحب خود چاہے بیل گاڑیوں پر بیٹھنے کے لئے مجبور ہوں۔ مگر یہ نوبت کبھی نہیں آئی۔ کہ لڑکے کی سواری میں ٹانگن نہ رہا ہو۔ امارت و ریاست کا غرور اس کے دل میں کوٹ کوٹ کر بھرا گیا تھا۔ ساوتری اُسے ہمیشہ راجہ صاحب کہا کرتی۔ چار سال کا نادان بچہ غرور اور تمکنت کا پتلا بن گیا تھا۔ اس کی پیشانی سے اقبال کا نور جھلکتا تھا۔ اس کے انداز میں ایک تحکم اور باتوں سے ایک خودسری کی شان ٹپکتی تھی۔ کیا باغ ریاست کی اس زینت کو بادِ حوادث کا نشانہ بننے دوں؟ کون سامنہ لے کر ساوتری سے یہ باتیں کہوں گا۔ جب سے شادی ہوئی ہے۔ اس غریب کو کبھی آرام نہ نصیب ہوا۔ اب تک یہ امید تھی کہ شبِ غم کی کبھی نہ کبھی سحر ہو گی۔ اور جب کہ سحر ہو گئی۔ سوئی ہوئی خواہشیں بیدار ہوئیں۔ خوشیوں نے چہکنا شروع کیا۔ تو یہ کتنا بڑا ستم ہے کہ وہ سحر شبِ غم سے بھی زیادہ تاریک ہو۔ جہاں امید کے ستارے بھی نہیں چمکتے۔ جہاں وہ رات کی ٹھنڈک نہیں شبنم نہیں۔ وہ جاں بخش نیند نہیں۔ وہ پُرمزہ خواب نہیں۔ وہ کیفیت انگیز سکوت

نہیں - یہ ستم ہے - قہر ہے -

کنور صاحب اور زیادہ نہ سوچ سکے - وہ ایک سراسیمگی کی حالت میں پلنگ پر سے اٹھ بیٹھے اور کمرے میں ٹہلنے لگے - ذرا دیر کے بعد انہوں نے جنگلے سے باہر کی طرف جھانکا - اور دروازہ کھول کر باہر نکل آئے - چاروں طرف اندھیرا تھا - ان کی پریشانیوں کی طرح بے انتہا اور عمیق - سامنے گومتی ندی بہتی تھی - وہ آہستہ آہستہ ندی کے کنارے چلے گئے اور دیر تک وہاں ٹہلتے رہے - دل مضطر کو امواج دریا سے کوئی مناسبت ہے شاید اس لئے کہ لہریں بھی مضطرب ہیں -

انہوں نے اپنے بھٹکتے ہوئے خیالات کو پھر مجتمع کیا - اگر ریاست کی خالص آمدنی سے یہ وثیقے دیئے جائیں گے - تو قرض کا سود نکلنا بھی دشوار ہو جائے گا - اصل کا ذکر ہی کیا - کیا آمدنی میں اضافہ نہیں ہو سکتا ؟ ابھی اصطبل میں بیس گھوڑے ہیں - میرے لئے ایک کافی ہے - ملازموں کی تعداد سو سے کم نہ ہو گی - میرے لئے دو کافی سے زیادہ ہو سکتے ہیں - یہ انسانیت سے بعید ہے کہ اپنے ہی بھائیوں سے ذلیل خدمتیں کرائی جائیں - ان آدمیوں کو میں اپنی سیر کی زمین دے دوں گا - آرام سے کھیتی کریں گے - اور مجھے دعائیں گے - باغیچوں کے پھل اب تک ڈالیوں اور تحفوں کی نذر ہو جاتے تھے - اب انہیں فروخت کر دوں گا اور سب سے بڑی رقم تو بیجائی کی ہے - صرف مہیش گنج کے بازار سے دس ہزار روپے وصول ہوتے ہیں - یہ سب رقم مہنت جی ہضم کر جاتے ہیں - ان کے لئے ایک ہزار روپے سال کافی ہونے چاہئیں - اب کی اس بازار کا ٹھیکہ کر دوں گا - آٹھ ہزار سے کم نہ ملیں گے - ان مدوں سے پچیس ہزار سالانہ کی نکاسی ہو سکتی ہے - ساوتری اور للا (لڑکا) کے لئے ایک ہزار روپیہ ماہوار بہت ہے - میں ساوتری سے صاف صاف کہہ دوں گا کہ یا تو ایک ہزار روپیہ ماہوار لو - اور میرے ساتھ رہو - یا ریاست کی نصف آمدنی لے لو - اور مجھے چھوڑ دو - رانی بننے کی ہوس

ہے۔ تو شوق سے رانی بنو۔ مگر میں راجہ نہ بنوں گا۔

دفعتہً کنور صاحب کے کانوں میں آواز آئی "رام نام ستہ ہے"۔ انہوں نے چونک کر پیچھے کی طرف دیکھا۔ کئی آدمی سڑک پر ایک لاش لئے آتے تھے۔ ان لوگوں نے ندی کے کنارے چتا بنائی اور آگ لگادی۔ دو عورتیں بین کر کے رو رہی تھیں۔ اس بین کا کنور صاحب کے دل پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ دل میں شرمندہ ہو رہے تھے کہ میں کتنا سنگ دل ہوں۔ ایک غریب آدمی کی لاش جل رہی ہے۔ عورتیں رو رہی ہیں اور میرا دل ذرا بھی نہیں پسیجا۔ پتھر کی مورت کی طرح کھڑا دیکھ رہا ہوں۔ یکایک ایک عورت نے روتے ہوئے کہا "ہائے میرے راجہ! تمہیں بس کیسے میٹھا لگا"۔ یہ دل خراش بین سنتے ہی کنور صاحب کے جگر میں ایک ٹھیس سی لگ گئی۔ بے اثری کا برت پھٹ گیا۔ رقت امڈ آئی۔ اور آنکھیں آب گوں ہوگئیں۔ غالباً اس غریب نے زہر کھا کر جان دی ہے۔ ہائے اسے زہر کیسے میٹھا لگا۔ اس میں کتنا درد ہے۔ کتنی حسرت کتنی حیرت! زہر تو کڑوی چیز ہے۔ وہ کیونکر میٹھی ہو گئی؟ زہر تلخ کے بدلے جس شخص نے جان شیریں دے دی۔ اس پر کوئی بڑا سانحہ آیا ہوگا۔ ایسی ہی حالت میں زہر میٹھا ہو سکتا ہے۔ ان چند لفظوں میں تاثیر درد کا ایسا جادو بھرا ہوا تھا۔ کہ کنور صاحب تڑپ گئے۔ یہی صدائیں بار بار ان کے تار جگر میں گونجتی تھیں۔ ان میں انہیں معنی و جذبات کا ایک دفتر چھپا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اب ان سے وہاں کھڑا نہ رہا گیا۔ وہ آہستہ آہستہ ان سوگواروں کے پاس آئے۔ اور ایک آدمی سے پوچھا۔ کیا بہت دنوں سے بیمار تھے اس آدمی نے کنور صاحب کی طرف ایک حسرت ناک انداز سے دیکھا۔ اور بولا۔ نہیں صاحب کہاں کی بیماری ابھی آج شام تک مزے میں باتیں کر رہے تھے۔ معلوم نہیں شام کو کیا کھا لیا کہ خون کی قئے آنے لگی۔ جب تک حکیم صاحب کے یہاں جائیں۔ تب تک آنکھیں الٹ گئیں۔ نبض چھوٹ گئی۔ حکیم صاحب نے آکر دیکھا۔ تو کہا۔ اب

کیا ہو سکتا ہے۔ اس نے زہر کھا لیا۔ بس صاحب گھر میں رونا پیٹنا ہونے لگا۔ ابھی کل بائیس تیئیس سال کی عمر تھی۔ ایسا پٹھا سارے لکھنؤ میں نہیں تھا۔

کنور۔ کچھ معلوم نہیں ہوا۔ زہر کیوں کھایا؟

اس آدمی نے مشتبہ نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ صاحب اور تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ جب سے یہ ٹرامبنک ٹوٹا ہے بہت اداس رہتے تھے۔ کئی ہزار روپے بینک میں جمع کئے تھے۔ گھی دودھ ملائی کی بڑی دکان تھی۔ برادری میں مان تھا۔ وہ ساری جمع ڈوب گئی۔ ہم لوگ منع کرتے تھے۔ کہ بینک میں روپیہ نہ رکھو۔ مگر صاحب ہونہار تو یہ تھی کہ کسی کی نہیں سُنی۔ آج صبح کو بیوی سے گہنے مانگتے تھے کہ گرو رکھ کر اہیروں کو دودھ کا دام دیں۔ اس سے باتوں باتوں میں تکرار ہو گئی۔ بس صاحب نہ جانے کہاں سے زہر لاکے کھا لیا۔

کنور صاحب کے جگر میں ایک رعشہ سا آگیا۔ معاً خیال گزرا۔ شیوداس تو نہیں ہے؟ پوچھا۔ کیا ان کا نام شیوداس تو نہیں تھا؟ اس آدمی نے حیرت سے دیکھ کر کہا۔ ہاں صاحب یہی نام تھا۔ آپ سے جان پہچان تھی کیا؟

کنور۔ "ہاں ہم اور وہ بہت دنوں تک بریلی میں ساتھ ساتھ کھیلے تھے۔ آج شام کو وہ ہم سے بینک گھر کے احاطے میں ملے تھے۔ مگر انہوں نے مجھ سے ذرا بھی ذکر کیا ہوتا۔ تو میں حتی الامکان ان کی مدد کرتا۔ افسوس"!

اس آدمی نے اب کنور صاحب کو غور سے دیکھا۔ اور جا کر عورتوں سے بولا۔ چُپ ہو جاؤ۔ بریلی کے راجہ صاحب آئے ہیں۔ اتنا سنتے ہی شیوداس کی ماں نے زور زور سے سر پیٹا۔ اور روتی ہوئی آکر کنور صاحب کے پیروں پر گر پڑی۔ اس کی زبان سے صرف یہ الفاظ نکلے۔ "بیٹا! بچپن میں تم سے بھیا کہا کرتے تھے ...."!

اور گلا پھنس گیا۔ کنور صاحب کی آنکھوں سے بھی آنسو جاری تھے۔ شیوداس کی تصویر

ان کے سامنے کھڑی تھی۔ مگر اس کے چہرے پر دوستانہ بے تکلفی اور خلوص کی جگہ ایک شکوۂ بے کس تھا۔ جو زبانِ حال سے کہہ رہا تھا۔ "تم نے دوست ہو کر میری جان لی!"

(۷)

صبح ہو گئی۔ مگر کنور صاحب کی آنکھیں خواب سے آشنا نہ ہوئیں۔ جب سے وہ گومتی کے کنارے سے لوٹے تھے۔ ان کے دل پر ایک ویراگ سا چھایا ہوا تھا۔ وہ رقت انگیز نظارہ نفس کی خود غرضانہ دلیلوں کے لئے دیوار آہن بنا ہوا تھا۔ اس نے تزلزل کو استحکام کی صورت میں تبدیل کر دیا تھا۔ ساوتری کی دل شکنی للا کی مایوسانہ ضد اور ماں کی زبان جیسے ارادہ شکن اسلحہ اس دیوار آہن سے سر ٹکرا کر ناکام چلے جاتے تھے۔ ساوتری کڑھے گی۔ کڑھے۔ للا کو کشمکش حیات میں کودنا پڑے گا۔ کوئی مضائقہ نہیں۔ اماں جان دینے پر آ جائیں گی۔ بہتر ہے۔ میں اپنے زن و فرزند۔ خویش و برادر کے لئے ہزاروں خاندانوں کا خون نہ کروں گا۔ آہ! شیو داس کو زندہ دیکھنے کے لئے میں ایسی ایسی کئی ریاستیں نثار کر سکتا ہوں۔ ساوتری کو فاقہ کرنا پڑے۔ للا کو مزدوری کرنا پڑے۔ مجھے دربدر بھیک مانگنا پڑے۔ تب بھی دوسروں کا گلا نہ دباؤں گا۔ اب دیر کرنے کا موقعہ نہیں۔ معلوم نہیں۔ آج کل میں یہ خانہ بربادیاں کون سے پہلو اختیار کریں۔ کیا کیا ستم ڈھائیں۔ . . . . . . مجھے اتنا پس و پیش کیوں ہو رہا ہے۔ محض نفس کی کمزوری ہے۔ ورنہ کوئی ایسا بڑا کام نہیں۔ جو کسی نے نہ کیا ہو۔ آئے دن لوگ لاکھوں روپے خیرات کرتے رہتے ہیں۔ ابھی ابھی بہار کے ایک راجہ نے اپنی بارہ لاکھ سالانہ نفع کی جائداد تعلیم نسواں کے لئے وقف کر دی ہے۔ میں اتنا پست ہمت کیوں ہو جاؤں۔ میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ اس سے کیوں منہ موڑوں۔ جو کچھ ہو جانا ہے سر پر جو کچھ پڑے۔ اس کی کیا فکر ہے؟ (گھنٹی بجاتی) ایک لمحہ میں اردلی آنکھیں ملتا ہوا

حاضر ہوا۔

کنور صاحب بولے "ابھی حبیب صاحب بالسٹر کے پاس جاکر میرا سلام دو۔ جاگ گئے ہونگے۔ کہنا نہایت ضروری کام ہے۔ نہیں۔ یہ رقعہ لیتے جاؤ۔ موٹر تیار کرالو۔"

(۸)

مسٹر حبیب نے کنور صاحب کو بہت سمجھایا۔ کہ آپ اس دلدل میں قدم نہ رکھیئے۔ ورنہ نکلنا محال ہو جائے گا۔ معلوم نہیں ابھی اور کتنی ایسی رقمیں ہیں جن کی آپ کو خبر نہیں ہے۔ آپ کی جانب سے اعلان ہوتے ہی سب اپنے اپنے دعوے پیش کرینگے۔ اور آپ کو سبھی دعوے تسلیم کرنے پڑینگے۔ اس وقت آپ کسی کو مستثنیٰ کرنے کے مجاز نہ ہوں گے۔ مگر دل میں قائم ہونے والا فیصلہ چونے کا فرش ہے جسے فہمائش کے تھپیڑے کمزور کرنے کے بجائے اور بھی مضبوط کر دیتے ہیں۔ کنور صاحب اپنے فیصلے پر قائم رہے اور دوسرے دن اخباروں میں اعلان کر دیا۔ کہ ہم برہل کی رانی صاحبہ مرحومہ کی کل مالی ذمہ داریوں کو تسلیم کرتے ہیں اور میعاد وعدہ کے اندر انہیں ادا کر دینگے۔

اس اعلان کے شائع ہوتے ہی سارے لکھنؤ میں ہلچل ہو گئی۔ باخبر لوگوں کی رائے میں یہ کنور صاحب کی صریح حماقت تھی اور جو لوگ قانون سے بے خبر تھے۔ انہوں نے خیال کیا کہ اس میں ضرور کوئی نہ کوئی راز ہے۔ ایسے بہت کم آدمی تھے۔ جنہوں نے کنور صاحب کی نیت کی صفائی اور اخلاقی احساس کی داد دی ہو۔ مگر داد چاہے نہ ملی ہو۔ دعاؤں کی کمی نہ تھی۔ بینک کے ہزاروں غریب معاملہ دار سچے دل سے کنور صاحب کو دعائیں دے رہے تھے۔

ایک ہفتہ تک کنور صاحب کو سر اٹھانے کی فرصت نہیں ملی۔ مسٹر حبیب کا خیال درست نکلا۔ مطالبات کی فہرست روز بروز بڑھتی جاتی تھی۔ کتنے ہی پرونوٹ ایسے

ملے۔ جن کا انہیں مطلق علم نہ تھا۔ جوہریوں اور دوسرے بڑے بڑے دکان داروں کی
یافتنی بھی کم نہ تھی۔ تخمینہ تیرہ چودہ لاکھ کا تھا۔ میزان بیس لاکھ کے قریب جا پہنچا۔
کنور صاحب گھبرائے۔ اندیشہ ہوا کہ ایسا نہ ہو۔ مجھے اپنے بھائیوں کو بھی وثیقہ سے
محروم کرنا پڑے۔ جس کا انہیں کوئی مجاز نہیں تھا۔ یہاں تک کہ ساتویں دن انہوں نے
کئی دکان داروں کو سخت سست کہہ کر سامنے سے دور کر دیا۔ جہاں شرح سود زیادہ
تھی۔ اس کی تخفیف کروائی۔ اور انقضاء میعاد کی قید سے فائدہ اٹھانے میں مطلق
تامل نہ کیا۔ انہیں مہاجنوں کی سخت گیری پر غصہ آتا تھا۔ ان کے خیال میں مہاجنوں
کو ڈوبتی ہوئی رقم کا ایک حصہ مل جانے پر بھی اپنی تقدیر کا مشکور ہونا چاہیئے تھا۔
ان جزرسیوں کے باوجود کل مطالبات کی میزان انیس لاکھ سے کم نہ ہوگی۔

کنور صاحب ان کاموں سے فرصت پاکر ایک روز انڈسٹریل بینک کی طرف جا
نکلے۔ بینک کھلا ہوا تھا۔ تن مردہ میں جان آگئی تھی۔ اس کا تنفس جاری ہو گیا تھا۔
بازکش معاملہ داروں کا ہجوم تھا۔ لوگ خوش خوش واپس جا رہے تھے۔ کنور صاحب کو
دیکھتے ہی صدہا آدمی فرطِ عقیدت سے ان کی طرف دوڑے اور کسی نے رو کر۔ کسی نے
ان کے قدموں کو بوسہ دے کر۔ کسی نے زیادہ مہذب طریق سے ان کا شکریہ ادا کیا۔
وہ بینک کے عملوں سے بھی ملے۔ لوگوں نے کہا۔ کہ اس اعلان نے بینک کو زندہ کر
دیا۔ بنگالی بابو نے سابق منیجر لالہ سائیں داس پر گل افشانی شروع کی "وہ سمجھتا تھا۔ دنیا
میں سب آدمی بھلا مانس ہے۔ ہم کو نصیحت کرتا تھا۔ اب اس کا آنکھ کھل گیا ہے۔ اکیلا
گھر میں بیٹھا رہتا ہے۔ کسی کو منہ نہیں دکھاتا۔ ہم سنتا ہے۔ وہ یہاں سے بھاگ جانا
چاہتا تھا۔ پر بڑا صاحب بولا۔ تم بھاگے گا۔ تو ہم لوگ تمہارے اوپر وارنٹ جاری
کر دے گا"۔ اب سائیں داس کی جگہ بنگالی بابو منیجر ہو گئے تھے۔

اس کے بعد کنور صاحب برہل آئے۔ بھائیوں نے یہ قصہ سنا تو بگڑے۔ اور

قانونی چارہ جوئی کی دھمکی دی۔ ماتا جی کو ایسا صدمہ ہوا کہ وہ اسی دن بیمار ہوگئیں۔ اور ایک ہی ہفتہ میں مایوس و الم زدہ اس دنیاء اسباب سے رخصت ہوگئیں۔ ساوتری کو بھی چوٹ لگی۔ پر اس نے محض صبر ہی نہیں کیا۔ بلکہ شوہر کی فیاضی اور ایثار کی تعریف کی۔ رہ گئے لال صاحب۔ اس نے جب دیکھا کہ اصطبل سے گھوڑے نکلے جاتے ہیں ہاتھی مکن پور کے میلے میں بکنے کے لئے بھیج دئے گئے۔ کہار برخاست کئے جارہے ہیں۔ تو گھبرایا ہوا کنور صاحب کے پاس آکر بولا۔" بابو جی یہ سب آدمی گھوڑے ہاتھی کہاں جارہے ہیں؟

کنور صاحب زہر خند سے بولے۔" یہ ایک راجہ صاحب کے نوبد میں شریک ہونے جارہے ہیں۔"

لال صاحب۔" کون سے راجہ ہیں؟"

کنور۔" ان کا نام راجہ غریب سنگھ"۔

لال صاحب۔" کہاں رہتے ہیں"؟

کنور۔" بے کس گنج میں"۔

لال صاحب"۔ تو ہم بھی جائیں گے"۔

کنور۔"تمہیں بھی لے چلیں گے۔ مگر اس بارات میں پیدل چلنے والوں کی عزت سواروں سے زیادہ ہوگی"۔

لال صاحب۔" تو ہم بھی پیدل چلیں گے"۔

کنور۔" وہاں محنتی آدمی کی تعریف ہوتی ہے"۔

لال صاحب"۔ تو ہم خوب محنت کرینگے"

کنور صاحب کے دونوں بھائی پانچ پانچ ہزار روپیہ سالانہ وثیقہ لے کر الگ ہو گئے۔ کنور صاحب اپنے اور اپنے عیال کے لئے بمشکل تمام ایک ہزار روپیہ سالانہ کا انتظام

کر سکے۔ مگر یہ رقم ایک رئیس کی شان اور وقار کے لیے کسی طرح کافی نہیں ہے۔ حاجتمند لوگ آتے ہی رہتے ہیں۔ ان سب کی خاطر کرنی پڑتی ہے۔ بڑی مشکل سے گزر ہوتی ہے۔ ادھر ایک سال سے شیو داس کے خاندان کا بار بھی سر پر آ پڑا ہے۔ مگر کنور صاحب کبھی اپنے فیصلہ پر افسوس نہیں کرتے۔ انہیں کبھی کسی نے ملول نہیں دیکھا۔ ان کا چہرہ مردانہ قناعت اور غرور صادق سے منور نظر آتا ہے۔ ادبیات کا شوق پہلے ہی سے تھا۔ اب باغبانی سے الفت ہو گئی ہے۔ اپنے باغ میں صبح اور شام پودوں کی دیکھ بھال کیا کرتے ہیں اور لال صاحب تو پکے کسان ہوتے نظر آتے ہیں۔ ابھی نو دس سال سے زیادہ عمر نہیں ہے۔ لیکن منہ اندھیرے کھیتوں میں پہنچ جاتے ہیں۔ کھانے پینے کی بھی سُدھ نہیں رہتی۔ ان کا گھوڑا موجود ہے۔ مگر ہفتوں اس پر سوار نہیں ہوتے۔ ان کی یہ دُھن دیکھ کر کنور صاحب بہت خوش ہوتے ہیں اور کہا کرتے ہیں۔ اب میں ریاست کے مستقبل کی طرف سے مطمئن ہوں۔ لال صاحب اس سبق کو کبھی فراموش نہ کریں گے۔ گھر میں دولت رہتی۔ تو عیش اور شکار اور شرارت کے سوا اور کیا سوجھتی؟ دولت بیچ کر ہم نے محنت اور قناعت خریدلی اور یہ سودا برا نہیں ہے۔ مگر ساویتری اتنی قانع نہیں۔ وہ کنور صاحب کی ممانعت کے باوجود اسامیوں سے چھوٹے موٹے تحفے لے لیا کرتی ہے اور خاندان کے رعب میں فرق نہیں آنے دیتی +

زنجیرِ ہوس

(۱)

جری اور جوان بخت قاسم ملتان کی مہم سر کر کے بادہ غرور سے مخمور چلا آتا تھا۔ شام ہو گئی تھی۔ لشکر کے لوگ فرودگاہ کی تلاش میں نظریں دوڑاتے تھے۔ لیکن قاسم کو اپنے آقائے نامدار کی خدمت میں باریابی کا شوق اڑائے لئے آتا تھا۔ ان تیاریوں کا خیال کر کے جو اس کے استقبال کے لئے دلی میں کی گئی ہوں گی۔ اس کا دل امنگوں سے لبریز ہو رہا تھا۔ سڑکیں بیرقوں اور بندن واروں سے آراستہ ہوں گی۔ چوراہوں پر نوبت خانے اپنا سہانا راگ الاپیں گے۔ جونہی میں شہر پناہ کے اندر داخل ہونگا۔ سارے شہر میں ایک غلغلہ برپا ہو جائے گا۔ توپیں خیر مقدم کے پُر شور نالے بلند کریں گی۔ بالاخانوں پر

ماہرویان شہر پُر غور لگاہوں سے مجھے دیکھیں گے اور مجھ پر پھولوں کی بارش کریں گے، ارکین دربار جواہر نگار عماریوں میں بیٹھے ہوئے میری پیشوائی کو آئیں گے۔ اس شان سے دیوانِ خاص تک جانے کے بعد جب میں حضور انور کی خدمت میں پہنچوں گا تو وہ آغوش کھولے ہوئے مجھے سینہ سے لگانے کے لئے اٹھیں گے۔ اور میں فرط احترام سے ان کے قدموں کو بوسہ دونگا۔ آہ! وہ مبارک وقت کب آئے گا؟ قاسم متوالا ہوگیا۔ اس نے شوق بے خودی میں گھوڑے کو ایڑ لگائی۔

قاسم لشکر کے عقب میں تھا۔ گھوڑا ایڑ پاتے ہی آگے بڑھا۔ قیدیوں کا غول پیچھے چھوٹ گیا۔ زخمی سپاہیوں کی ڈولیاں پیچھے چھوٹیں۔ سواروں کا دستہ پیچھے رہا۔ سواروں کے آگے فرمانروائے ملتان کی بیگمات اور شہزادیوں کے محافے اور سکھپال تھے۔ ان سواروں کے پس و پیش مسلح خواجہ سراؤں کی ایک کثیر جماعت تھی۔ قاسم اپنے رو میں گھوڑا بڑھائے چلا آتا تھا۔ دفعتہً اسے ایک مکلف پالکی میں سے دو آنکھیں جھانکتی ہوئی نظر آئیں۔ قاسم ٹھٹک گیا۔ اسے معلوم ہوا کہ میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ اسے اپنے جگر میں ایک لرزش۔ دل میں ایک ضعف حواس میں ایک وحشت سی محسوس ہوئی۔ اس کا آسن خود بخود ڈھیلا پڑ گیا۔ تنی ہوئی گردن جھک گئی۔ نظریں نیچی ہوئیں۔ وہ دونوں آنکھیں وہ ذرّ رقصاں ستاروں کی طرح جن میں ساحرانہ کشش تھی۔ اس کے گوشۂ دل میں آبیٹھیں۔ وہ جدھر تاکتا تھا وہی دونوں جذبہ نور سے روشن تارے نظر آتے تھے۔ اسے برچھی نہیں لگی۔ کٹار نہیں لگی۔ کسی نے اس پر جادو نہیں کیا۔ تسخیر نہیں کی۔ نہیں اسے اپنے دل میں اس وقت ایک پُر مزہ رمیدگی۔ ایک مسرور لذت درد۔ ایک کیفیت بشریں۔ ایک دلاویز پر خلش رقت محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا رونے کو جی چاہتا تھا۔ کسی کا نعرۂ درد سن کر شاید وہ رو پڑتا۔ بے تاب ہو جاتا۔ اس کا احساس درد جاگ اٹھا تھا۔ جو عشق کی پہلی منزل ہے۔

ایک لمحہ کے بعد اس نے حکم دیا "آج ہمارا یہیں قیام ہوگا"

(۲)

آدھی رات گزر چکی تھی۔ لشکر کے آدمی میٹھی نیند سو رہے تھے۔ چاروں طرف مشعلیں جلتی تھیں، اور طلایہ کے جوان جا بجا بیٹھے جماہیاں لیتے تھے۔ لیکن قاسم کی آنکھوں میں نیند نہ تھی۔ وہ اپنے وسیع پُر لطف خیمہ میں بیٹھا ہوا سوچ رہا تھا۔ کیا اس نازنین کو ایک نظر دیکھ لینا کوئی بڑا گناہ ہے؟ مانا کہ وہ فرمانروائے ملتان کی شہزادی ہے اور میرے آقائے نامدار اپنے حرم کو اس سے روشن کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن میری آرزو تو صرف اتنی ہے کہ اسے صرف ایک نگاہ دیکھ لوں اور وہ بھی اس طرح کہ کسی کو خبر نہ ہو۔ بس اور بالفرض یہ گناہ بھی ہو۔ تو میں اس وقت یہ گناہ کروں گا۔ ابھی ہزاروں بے گناہوں کو انہیں ہاتھوں سے قتل کر آیا ہوں۔ کیا خدا کے دربار میں ان گناہوں کی معافی محض اس لئے ہو جائے گی۔ کہ وہ بادشاہ کے حکم سے کئے گئے کچھ بھی ہو۔ کسی نازنین کو ایک نظر دیکھ لینا کسی کی جان لینے سے بڑا گناہ نہیں کم سے کم میں ایسا نہیں سمجھتا۔

قاسم دین دار نوجوان تھا۔ وہ دیر تک اس فعل کے اخلاقی پہلو پر غور کرتا رہا۔ تسخیر ملتان کا ہیرو دیگر موانعات کو کیوں خیال میں لاتا۔

اس نے اپنے خیمے سے باہر نکل کر دیکھا۔ بیگمات کے خیمے تھوڑی ہی دور نصب تھے۔ قاسم نے قصداً اپنا خیمہ ان کے قریب لگایا تھا۔ ان خیموں کے چاروں طرف کئی مشعلیں جل رہی تھیں۔ اور پانچ حبشی خواجہ سرا برہنہ شمشیر لئے ٹہل رہے تھے۔ قاسم آکر مسند پر لیٹ گیا اور سوچنے لگا۔ ان کم بختوں کو کیا نیند نہ آئے گی۔ اور چاروں طرف اتنی مشعلیں کیوں جلا رکھی ہیں۔ ان مشعلوں کا گل ہونا ضروری ہے

اس لیٹے پکارا" مسرور!"

"حضور - ارشاد؟"

"مشعلیں بجھا دو - مجھے نیند نہیں آتی۔"

"حضور رات اندھیری ہے"۔

"کوئی خوف نہیں - طلایہ کے جوان ہوشیار ہیں۔"

"سب کی سب گل کر دی جائیں"؟

"ہاں!"

"جیسی مرضی والا"۔

خواجہ سرا چلا گیا - اور ایک لمحہ میں سب کی سب مشعلیں گل ہو گئیں - اندھیرا چھا گیا۔

تھوڑی دیر میں ایک عورت نے شہزادی کے خیمے سے نکل کر پوچھا" مسرور! سرکار پوچھتی ہیں - یہ مشعلیں کیوں بجھا دی گئیں"؟

مسرور بولا" سپہدار صاحب کی مرضی - تم لوگ ہوشیار رہنا - مجھے ان کی نیت صاف نہیں معلوم ہوتی"۔

(۳)

قاسم بے تابی اشتیاق کے عالم میں کبھی لیٹتا تھا - کبھی اٹھ بیٹھتا تھا - کبھی ٹہلنے لگتا تھا - بار بار دروازہ پر آ کر دیکھتا - لیکن پانچوں خواجہ سرا دیوؤں کی طرح کھڑے نظر آتے تھے - قاسم کو اس وقت یہی دھن تھی کہ شہزادی کا دیدار کیونکر ہو؟ انجام کی فکر ننگ و ناموس کا خوف اور عتاب شاہی کا خطرہ - اس پُر زور خواہش کے نیچے دب گیا تھا۔

گھڑیال نے ایک بجایا۔ قاسم یوں چونک پڑا۔ گویا کوئی ان ہونی بات ہو گئی جیسے کچہری میں بیٹھا ہوا مستغیث اپنے نام کی پکار سن کر چونک پڑتا ہے۔ اوہو۔ تین ہی گھنٹوں میں صبح ہو جائے گی۔ خیمے اکھڑ جائیں گے۔ لشکر کوچ کر دے گا۔ وقت تنگ ہے۔ اب تاخیر اور تامل کی گنجائش نہیں۔ کل دلی پہنچ جائیں گے۔ ارمان دل میں کیوں رہ جائے؟ کسی طرح ان حرام خور خواجہ سراؤں کو دم دینا چاہیئے۔ اس نے باہر نکل کر آواز دی۔ "مسرور!"

"حضور۔ ارشاد۔"

"ہوشیار ہو نہ"

"حضور پلک تک نہیں جھپکی۔"

"نیند تو آتی ہی ہو گی۔ کیسی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے۔"

"جب حضور ہی نے ابھی تک آرام نہیں فرمایا۔ تو غلاموں کو کیونکر نیند آتی۔"

"میں تمہیں کچھ تکلیف دینا چاہتا ہوں۔"

"ارشاد۔"

"تمہارے ساتھ پانچ آدمی ہیں۔ انہیں لے کر ذرا ایک بار لشکر کا چکر لگا آؤ۔ دیکھو۔ لوگ کیا کر رہے ہیں۔ اکثر سپاہی رات کو جوا کھیلتے ہیں۔ بعض قرب و جوار کے علاقوں میں جا کر خرمستی کیا کرتے ہیں۔ ذرا ہوشیاری سے کام کرنا۔

مسرور۔ "مگر یہاں میدان خالی ہو جائے گا۔"

قاسم۔ "میں تمہارے آنے تک خبردار رہوں گا۔"

مسرور۔ "جو مرضی والا"

قاسم۔ "میں نے تمہیں معتبر سمجھ کر یہ خدمت سپرد کی ہے۔ اس کا معاوضہ انشاءاللہ تمہیں سرکار سے عطا ہو گا۔"

مسرور نے دبی زبان سے کہا۔ "بندہ آپ کی یہ چالیں سب سمجھتا ہے۔ انشاءاللہ سرکار سے آپ کو کبھی ان کا صلہ ملے گا۔" اور تب بہ آواز بلند بولا۔ "یہ عین نوازش مخدومانہ ہے۔"

ایک لمحہ میں پانچوں خواجہ سرا لشکر کی طرف چلے۔ قاسم نے انہیں جاتے دیکھا مطلع صاف ہوگیا۔ اب وہ بے خوف خیمہ میں جاسکتا تھا۔ لیکن اب قاسم کو معلوم ہوا کہ اندر جانا اتنا آسان نہیں ہے جتنا وہ سمجھتا ہے۔ گناہ کا پہلو اس کی نظر سے غائب ہوگیا تھا۔ اب صرف ظاہری مشکلات پر نگاہ تھی۔

(۴)

قاسم دبے پاؤں شہزادی کے خیمہ کے پاس آیا۔ حالانکہ دبے پاؤں آنے کی ضرورت نہ تھی۔ اس سناٹے میں وہ اگر دوڑتا ہوا چلتا تو بھی کسی کو خبر نہ ہوتی۔ اس نے خیمہ سے کان لگا کر سنا۔ کسی کی آہٹ نہ ملی۔ اطمینان ہوگیا۔ تب اس نے کمر سے چاقو نکالا۔ اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے خیمہ کی دو تین رسیاں کاٹ ڈالیں۔ اندر جانے کا راستہ نکل آیا۔ اس نے اندر کی طرف جھانکا۔ ایک فتیلہ سوز جل رہا تھا۔ دو کنیزیں فرش پر لیٹی ہوئی تھیں اور شہزادی ایک مخملی گدے پر خواب ناز میں محو تھی۔ قاسم کی ہمت زیادہ ہوئی۔ وہ سرک کر اندر چلا گیا۔ اور دبے پاؤں شہزادی کے قریب جا کر اس کے دل فریب حسن کا امرت پینے لگا۔ اسے اب وہ ہراس نہ تھا۔ جو خیمہ میں آتے وقت ہوا تھا۔ اس نے ضرورت پڑنے پر اپنی راہ فرار سوچ لی تھی۔

قاسم ایک منٹ تک مورت کی طرح کھڑا شہزادی کو دیکھتا رہا۔ سیاہ زلفیں کھل کر اس کے رخساروں کو چھپائے ہوئے تھیں۔ گویا سیاہ حرفوں میں ایک روشن دلاویز شاعرانہ خیال پنہاں تھا۔ وجود خاکی میں یہ لطافت۔ یہ ملاحت۔ یہ ضیا کہاں؟

قاسم کی آنکھیں اس نظارے سے مخمور ہوگئیں۔ اس کے دل پر ایک ولولہ انگیز شوریدگی کا اثر ہونے لگا۔ جو نتائج سے بے خوف تھی۔ اشتیاق نے آرزو کی صورت اختیار کی۔ اشتیاق میں بے صبری تھی۔ اور ہیجان۔ آرزو میں ایک مدہوشی اور لطف درد۔ اس کے دل میں اس حسینہ کے پیروں پر سر ملنے کی۔ اس کے سامنے رونے کی۔ اس کے قدموں پر جان دے دینے کی۔ اظہار الفت کی بیان غم کی۔ ایک لہر سی اٹھنے لگی۔ ہوش کے بھنور میں پڑ گیا۔

(۵)

قاسم آدھ گھنٹہ تک اس ملکۂ حسن کے پیروں کے پاس سر جھکائے بیٹھا سوچتا رہا کہ اسے کیونکر بیدار کروں۔ جونہی وہ کروٹ بدلتی۔ وہ مارے خوف کے تھر تھرا جاتا۔ وہ شجاعت جس نے ملتان کو تسخیر کیا تھا۔ اس کا ساتھ چھوڑ دیتی تھی۔

دفعتہً قاسم کی نگاہ ایک طلائی گلاب پاش پر پڑی۔ جو قریب ہی ایک چوکی پر رکھا ہوا تھا۔ اس نے گلاب پاش اٹھالیا۔ اور ایک منٹ کھڑا سوچتا رہا۔ کہ شہزادی کو جگاؤں یا نہ جگاؤں؟ سونے کی ڈولی پڑی ہوئی دیکھ کر ہمیں اس کے اٹھانے میں جو پس و پیش ہوتا ہے۔ وہی اس وقت اسے ہو رہا تھا۔ بالآخر اس نے کلیجہ مضبوط کرکے شہزادی کے رُخ انور پر گلاب کے کئی چھینٹے دے۔ شمع موتیوں کی لڑی سے آراستہ ہوئی۔

شہزادی نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔ اور قاسم کو سامنے کھڑا دیکھ فوراً منہ پر نقاب کھینچ لی۔ اور آہستہ سے بولی" مسرور"۔

قاسم نے کہا "مسرور تو یہاں نہیں ہے۔ لیکن مجھے بھی اپنا ادنےٰ جانباز خادم سمجھیے۔ جو ارشاد ہوگا۔ اس کی تعمیل میں سرمو عذر نہ ہوگا۔"

شہزادی نے نقاب اور کھینچ لی - اور خیمہ کے ایک گوشہ میں جاکر کھڑی ہوگئی -

قاسم کو اپنی قوتِ بیان کا آج پہلی بار تجربہ ہوا - وہ بہت کم سخن اور متین آدمی تھا - اپنے جذبات دل کے اظہار میں اسے ہمیشہ جھجک ہوتی تھی - لیکن اس وقت الفاظ قطرۂ باراں کی طرح اس کی زبان پر آنے لگے - گہرے پانی کے بہاؤ میں ایک نوائے درد پیدا ہوجاتی ہے - بولا " میں جانتا ہوں کہ میری یہ گستاخی طبع نازک پر ناگوار گزری ہے - مزاج عالی میں اس کی جو سزا مناسب معلوم ہو - اس کے لیئے یہ سر تسلیم خم ہے - آہ میں ہی وہ بدنصیب کور نفس انسان ہوں - جس نے آپ کے پدر بزرگوار اور پیارے بھائیوں کے خون سے اپنا دامن ناپاک کیا ہے - میرے ہی ہاتھوں ملتان کے ہزاروں جوان ہلاک ہوئے سلطنت تباہ ہوگئی - خاندان شاہی برباد ہوگیا - اور آپ کو یہ روز سیاہ دیکھنا پڑا - لیکن اس وقت آپ کا یہ مجرم آپ کے سامنے دست بستہ حاضر ہے - آپ کے ایک اشارے پر وہ آپ کے قدموں پر نثار ہو جائے گا - اور اس کے وجود ناقص سے دنیا ناپاک ہو جائیگی - مجھے آج معلوم ہوا - کہ نفس شجاعت کے پردہ میں انسان سے کیسی کیسی بدعتیں کرواتا ہے یہ محض آتشِ حرص ہے راکھ میں چھپی ہوئی - محض زہر قاتل ہے - خوشنما شیشہ میں بند - کاش میری آنکھیں پہلے کھلی ہوتیں - تو ایک نامور شاہی خاندان یوں خاک میں نہ مل جاتا - پر اس شمع الفت نے جو کل شام کو میرے سینہ میں روشن ہوئی - اس گوشہ تاریک کو منور کردیا - یہ ان روحانی جذبات کا فیض ہے - جو کل میرے دل میں بیدار ہوئے جنہوں نے مجھے قید حرص سے آزاد کردیا "

اس کے بعد قاسم نے اپنی بے قراری اور سوز دل اور صدمۂ شوق کا نہایت رقت انگیز الفاظ میں ذکر کیا - یہاں تک کہ اس کے الفاظ کا ذخیرہ ختم ہوگیا - اظہار حال کی ہوس جز دکل پوری ہوگئی -

(۶)

لیکن وہ پابندِ ہوس وہاں سے ہلا نہیں ۔ اس کی آرزوؤں نے ایک قدم اور آگے بڑھایا ۔ میری اس رام کہانی کا حاصل کیا؟ اگر محض دردِ دل ہی سنانا تھا ۔ تو کسی تصویر کو سنا سکتا تھا ۔ وہ تصویر اس سے زیادہ توجہ اور خموشی سے میرا ماجرائے غم سنتی ۔ کاش میں بھی اس ملکۂ حسن کی صدائے شیریں سنتا ۔ وہ بھی مجھ سے کچھ اپنا حالِ دل کہتی ۔ مجھے معلوم ہوتا کہ میرے اس قصۂ درد کا اس کے دل پر کیا اثر ہوا ۔ کاش مجھے معلوم ہوتا کہ جس آتشِ سوزاں میں میں پھنکا جا رہا ہوں ۔ کچھ اس کی آنچ ادھر بھی پہنچتی ہے یا نہیں ۔ کون جانے یہ سچ ہو کہ محبت پہلے معشوق کے دل میں پیدا ہوتی ہے ۔ ایسا نہ ہوتا تو وہ صبر شکن نگاہ مجھ پر پڑتی ہی کیوں؟ آہ اس پیکرِ حسن کی نواسنجیوں میں کتنا لطف آئے گا ۔ نغمۂ عندلیب سبھی سنتے ہیں ۔ پر نغمۂ گل کس نے سنا ہے ۔ کاش میں وہ نغمہ سنتا ۔ اس کی آواز کتنی دلکش ہو گی ۔ کتنی پاکیزہ ۔ کتنی نورانی ۔ آبِ حیات میں ڈوبی ہوئی ۔ اور جو کہیں وہ بھی مجھ پر مائل ہو ۔ تو پھر مجھ سے زیادہ خوش نصیب دنیا میں اور کون ہوگا ۔

اس خیال سے قاسم کا دل اچھلنے لگا ۔ رگوں میں ایک حرکت سی محسوس ہوئی ۔ باوجودیکہ کنیزوں کے جاگ جانے اور مسرور کی واپسی کا دھڑکا لگا ہوا تھا ۔ تاہم شوقِ تکلم نے اسے بیتاب کر دیا ۔ بولا ۔ ملکۂ حسن ۔ یہ سینہ فگار نظرِ کرم کا مستحق ہے ۔ کچھ اس کے حالِ زار پر رحم نہ کیجیئے گا؟

شہزادی نے نقاب کی آڑ سے اس کی طرف تاکا ۔ اور بولی ۔" جو خود رحم کا مستحق ہو ۔ وہ دوسروں کے ساتھ کیا رحم کر سکتا ہے؟ قفس میں تڑپتے ہوئے طائر بے پر و بال سے نغمہ کی ہوس رکھنا عبث ہے ۔ میں جانتی ہوں ۔ کہ کل شام کو میں دہلی کے ظالم بادشاہ کے روبرو کنیزوں کی طرح ہاتھ باندھے کھڑی ہوں گی ۔ میری عزت میرے رتبہ اور میرے وقار

کا مدار خاندانی اعزاز پر نہیں۔ بلکہ میری صورت پر ہوگا۔ پادر افتادگی کا حق پورا ہو جائیگا۔ کون ایسا بشر ہے جو اس زندگی کی آرزو رکھے گا؟ آہ ملتان کی شہزادی آج ایک جفاکار ریاکار۔ حرام کار انسان کی ہوس رانیوں کا شکار بننے پر مجبور ہے۔ جائیے مجھے میرے حال پر چھوڑ دیجئے۔ میں بدنصیب ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ میرے ساتھ آپ بھی شاہی عتاب نازل ہو جائے۔ دل میں کتنی ہی باتیں ہیں۔ مگر کیا کہوں؟ کیا حاصل؟ اس راز کا سربستہ رہنا ہی بہتر ہے۔ آپ میں سچی شجاعت اور حمیت کا جوہر ہے۔ آپ دنیا میں نام و نمود پیدا کرینگے۔ بڑے بڑے کام انجام دینگے۔ خدا آپ کے ارادوں میں برکت دے۔ یہی اس ستم نصیب کی دعا ہے۔ میں صدق دل سے کہتی ہوں کہ مجھے آپ سے کوئی ملال نہیں ہے۔ آج مجھے معلوم ہوا کہ محبت کینہ اور پرخاش سے کتنی بے لوث ہوتی ہے۔ وہ اس دامن میں منہ چھپانے سے کبھی گریز نہیں کرتی۔ جو اس کے عزیزوں کے خون سے آلودہ ہو رہا ہو۔ آہ یہ کم بخت دل اُبلا پڑتا ہے۔ اپنے کان بند کر لیجئے۔ وہ اپنے آپے میں نہیں ہے۔ اس کی باتیں نہ سنئے۔ صرف آپ سے یہی التجا ہے کہ اس غریب کو بھول نہ جائیے گا۔ میرے دل میں اس خواب شیریں کی یاد ہمیشہ تازہ رہے گی۔ قید حرم میں یہی خواب دل کو تسکین دیتا رہے گا۔ اس خواب کو پریشان نہ کیجئے گا۔ اب یہاں سے جائیے۔ ایسا نہ ہو کہ مسرور آجائے وہ ایک ہی سفاک ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اس نے آپ کو دھوکا دیا۔ عجب نہیں کہ کہیں یہیں چھپا بیٹھا ہو۔ اس سے ہشیار رہئے گا۔ اب رخصت!

(۷)

قاسم پر ایک بے خودی کی حالت طاری ہو گئی۔ جیسے روحانی نغمہ سننے کے بعد کسی مجذوب کی ہوتی ہے۔ اسے خواب میں بھی جو امید نہ ہو سکتی تھی۔ وہ پوری ہو گئی تھی غرور سے اس کی گردن کی رگیں تن گئیں۔ اُسے معلوم ہوا کہ دنیا میں مجھ سے زیادہ خوش

نصیب دوسرا نہیں ہے۔ میں چاہوں تو اس گلزار حسن کی بہار لوٹ سکتا ہوں۔ اس ساغر سے مست ہو سکتا ہوں۔ آہ! وہ کتنی سرور انگیز۔ کتنی مبارک زندگی ہوگی۔ ابتک قاسم کی محبت گوالے کا دودھ تھی۔ پانی سے ملی ہوئی شہزادی کے سوز دل نے پانی کو جلا کر خلوص کا رنگ پیدا کر دیا۔ اس کے دل نے کہا۔ "میں اس ملکۂ حسن کے لئے کیا کچھ نہیں کر سکتا۔ کوئی ایسی مصیبت ہے جو جھیل نہ سکوں۔ کوئی ایسی آگ نہیں۔ جس میں کود نہ سکوں۔ مجھے خوف کس کا ہے! بادشاہ کا؟ میں بادشاہ کا غلام نہیں۔ اس کا دست نگر نہیں محتاج نہیں۔ میرے جوہر کی ہر ایک دربار میں قدر ہو سکتی ہے۔ میں آج اس زنجیر اطاعت کو توڑ ڈالوں گا۔ اور اس دیس میں جا بسوں گا۔ جہاں بادشاہ کے فرشتے بھی پر نہیں مار سکتے۔ نعمت حسن پا کر اب مجھے اور کوئی خواہش نہیں۔ اب اپنی آرزوؤں کا کیوں گلا گھونٹوں؟ ارمانوں کو کیوں نامرادی کا نوالہ بننے دوں؟ اس نے ایک عالم وحشت میں کمر سے تلوار نکالی اور جوش کے ساتھ بولا "جب تک میرے بازوؤں میں دم ہے۔ کوئی آپ کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھ بھی نہیں سکتا۔ چاہے وہ دِلّی کا تاجدار ہی کیوں نہ ہو۔ میں دلّی کے کوچہ و بازار میں خون کی ندی بہا دوں گا۔ سلطنت کی جڑیں ہلا دوں گا۔ تخت شاہی کو زیر و زبر کر دوں گا۔ اور کچھ نہ کر سکوں گا۔ تو مر مٹوں گا۔ پر اپنی آنکھوں سے آپ کی یہ تحقیر نہ دیکھوں گا۔"

شہزادی آہستہ آہستہ اس کے قریب آئی۔ اور بولی۔ "مجھے آپ کے اوپر کامل اعتماد ہے۔ لیکن آپ کو میری خاطر سے ضبط اور صبر کرنا ہوگا۔ آپ کے لئے میں محل سرا کی تکلیفیں اور جفائیں سب سہ لوں گی۔ آپ کی محبت ہی میری زندگی کا سہارا ہوگی۔ یہ یقین کہ آپ مجھے اپنی کنیز سمجھتے ہیں۔ مجھے ہمیشہ سنبھالتا رہے گا۔ کون جانے تقدیر ہمیں پھر ملائے۔"

قاسم نے اکڑ کر کہا۔ "آپ دِلّی کا رُخ کیوں کریں؟ ہم صبح ہوتے ہوتے بھروچ پہنچ سکتے ہیں۔"

شہزادی ۔ مگر ہندوستان کے باہر تو نہیں جا سکتے۔ دلّی کے بد اندیش بن کر ممکن ہے ہم دشت و بیابان میں زندگی کے دن کاٹیں۔ پر عافیت نہ نصیب ہوگی۔ واقعات کی طرف سے آنکھیں نہ بند کیجئے۔ خدا نے آپ کو شجاعت عطا کی ہے۔ پر تیغ اصفہانی بھی تو پہاڑ سے ٹکرا کر ٹوٹ ہی جائے گی۔

قاسم کا جوش کچھ دھیما ہوا۔ تعلّی کا پردہ نظروں سے ہٹ گیا۔ عالم غیظ میں بڑھ بڑھ کر باتیں کرنا انسانی خاصہ ہے۔ قاسم کو اپنی معذوری صاف نظر آنے لگی۔ بے شک میری یہ لن ترانیاں مضحکہ خیز ہیں۔ شاہ دہلی کے مقابلہ میں میری کیا ہستی ہے؟ ان کا ایک اشارہ میری ہستی کو مٹا سکتا ہے۔ حسرت ناک لہجہ میں بولا۔ "بالفرض ہم کو دشت و بیابان ہی میں زندگی کے دن کاٹنے پڑیں تو کیا؟ اہلِ محبت گوشۂ تاریک میں بھی سیر چمن کا لطف اٹھاتے ہیں۔ محبت میں وہ درویشانہ بے نیازی ہے جو دنیا کی نعمتوں کی طرف آنکھ اٹھا کر کبھی نہیں دیکھتی۔"

شہزادی ۔ مگر مجھ سے یہ کب ممکن ہے کہ اپنی بہتری کے لئے آپ کو ان خطروں میں ڈالوں؟ میں شاہ دلّی کی ستم شعاریوں کی داستانیں سن چکی ہوں۔ انہیں یاد کر کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ خدا وہ دن نہ لائے کہ میری وجہ سے آپ کا بال بھی بیکا ہو۔ آپ کی مہم آرائیوں کے چرچے۔ آپ کی خیریت مزاج کی خبریں اس کنج قفس میں میری تسکین اور تقویت کا باعث ہوں گی۔ میں مصیبتیں جھیلوں گی۔ اور ہنس ہنس کر آگ میں جلوں گی اور پیشانی پر میل نہ آنے دوں گی۔ ہاں میں شاہ دہلی کے دل کو اپنا بناؤں گی۔ صرف آپ کی خاطر سے۔ تاکہ آپ کے لئے موقع پڑنے پر چند کلماتِ خیر کہہ سکوں۔

(۸)

لیکن قاسم اب بھی وہاں سے نہ ہلا۔ اس کی آرزوئیں امید سے بڑھ کر پوری ہوتی

جاتی تھیں۔ پھر ہوس بھی اسی انداز سے بڑھتی جاتی تھی۔ اس نے سوچا۔ اگر ہماری محبت کی بہار محض چند لمحوں کی مہمان ہے۔ تو پھر ان مبارک لمحوں کو فکر مآل سے کیوں مکدر کریں۔ اگر تقدیر میں اس نعمت حسن سے بہرہ ور ہونا نہیں لکھا ہے۔ تو اس موقع کو ہاتھ سے کیوں دوں؟ کون جانے پھر ملاقات ہو یا نہ ہو۔ یہ محبت رہے یا نہ رہے۔ بولا "شہزادی اگر آپ کا یہی آخری فیصلہ ہے۔ تو میرے لئے بجز حسرت اور یاس کے اور کیا چارہ ہے؟ قلق ہوگا کڑھوں گا۔ پر صبر کروں گا۔ اب ایک دم کے لئے یہاں آ کر میرے پہلو میں بیٹھ جایئے تاکہ اس دل بے قرار کو تسکین ہو۔ آیئے۔ ایک لحظہ کے لئے بھول جائیں کہ جدائی کی گھڑی ہمارے سر پر کھڑی ہے۔ کون جانے یہ دن کب آئیں۔ ثروت غریبوں کی یاد بھلا دیتی ہے۔ آیئے ایک ساعت مل کر بیٹھیں۔ اپنی عنبریں زلفوں کی خوش بوئے تر سے اس رُوح سوزاں کو طراوت پہنچایئے۔ یہ باہیں گلوں کی زنجیریں بن جائیں اپنے کفِ بلوریں سے پریم کے پیالے بھر بھر کے پلایئے۔ ساغر کے ایسے دور چلیں کہ ہم چھک جائیں۔ دلوں پر سرور کا ایسا گاڑھا رنگ چڑھے جس پر فراق کی ترشیوں کا اثر نہ ہو۔ وہ مئے احمر پلایئے۔ جو جلتے ہوئے کشتِ آرزو کو سیراب کر دے اور روح تشنہ ہمیشہ کے لئے شادکام ہو جائے۔"

مئے ارغوانی کے دور چلنے لگے۔ شہزادی کے کف بلوریں سے مئے ارغواں کا پیالہ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے بلوریں تختۂ آب پر کنول کا پھول کھلا ہوا۔ قاسم دنیا و مافیہا سے بے خبر پیالے پر پیالے چڑھاتا جاتا تھا۔ جیسے کوئی رہزن مال غنیمت پر ٹوٹا ہوا ہو۔ یہاں تک کہ اس کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ گردن جھک گئی۔ بلا نوشی نے مدہوش کر دیا۔ شہزادی کی طرف ہوس ناک نگاہوں سے تاکتا ہوا آغوش کھولے بڑھا۔ کہ گھڑیال نے چار بجائے اور نقارہ کوچ کی دل دوز صدائیں کان میں آئیں۔ آغوش کھلا کا کھلا رہ گیا۔ کنیزیں اٹھ بیٹھیں۔ شہزادی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور حرماں نصیب قاسم دل کی

آرزوئیں لئے خیمہ سے باہر نکلا۔ جیسے تقدیر کے پنجۂ فولاد نے اسے دھکیل کر باہر نکال دیا ہو۔ جب اس خیمہ میں آیا۔ تو دل آرزوؤں سے پُر تھا۔ کچھ دیر کے بعد آرزوؤں نے ہوس کا روپ بھرا اور اب باہر نکلا۔ تو دل حسرتوں سے پامال تھا۔ ہوس کا تارِ عنکبوت اس کی رُوح کے لئے زنجیر آہن بنا ہوا تھا۔

(۹)

شام کا سہانا وقت تھا۔ بحرِ نسیم میں دھیرا دھیرا تلاطم ہو رہا تھا۔ جری اور جوان بخت، قاسم ملتان کی مہم سر کر کے بادۂ غرور سے مخمور چلا آتا تھا۔ دہلی کی سڑکیں بیرقوں اور جھنڈیوں سے سجی ہوئی تھیں۔ گلاب اور کیوڑے کی خوشبو چاروں طرف اُڑ رہی تھی۔ جا بجا نوبت خانے اپنا سہانا راگ الاپ رہے تھے۔ شہر پناہ کے اندر داخل ہوتے ہی سارے شہر میں ایک غلغلہ سا ہو گیا۔ توپوں نے خیر مقدم کے گھن گرج نالے بلند کئے۔ بالاخانوں پر ماہر دیان شہر ستاروں کی طرح چمکنے لگیں۔ قاسم پر پھولوں کی برکھا ہونے لگی۔ وہ قصرِ شاہی کے قریب پہنچا۔ تو امرائے عالی مقام اس کی پیشوائی کے لئے پا پیادہ صف بہ صف ایستادہ تھے۔ اس شان سے وہ دیوانِ خاص تک پہنچا۔ اس کا دماغ اس وقت عرشِ معلےٰ پر تھا۔ مشتاق آرزومند نگاہوں سے تاکتا ہوا بارگاہ عالی میں پہنچا۔ اور تختِ شاہی کو بوسہ دیا۔ بادشاہ مسکرا کر تخت سے اترے اور آغوش کھولے ہوئے قاسم کو سینے سے لگانے کے لئے بڑھے۔ قاسم فرطِ احترام سے ان کے قدموں کو بوسہ دینے کے لئے جھکا۔ کہ یکایک اس کے سر پر ایک بجلی سی گری۔ بادشاہ کا خنجر خارا شگاف اس کی گردن پر پڑا۔ اور سر تن سے جدا ہو کر الگ جا گرا۔ خون کے فوارے بادشاہ کے قدموں کی طرف۔ تخت کی طرف اور تخت کے پیچھے کھڑے ہونے والے مسرور کی طرف لپکے گویا کوئی تھلایا ہوا مار آتشیں ہے۔

تن بسمل ایک لمحہ میں ٹھنڈا ہو گیا - مگر دونوں آنکھیں حسرت کشتہ کی دو مورتوں کی طرح دیر تک دیواروں کی طرف تاکتی رہیں - آخر وہ بھی بند ہو گئیں - ہوس نے اپنا کام پورا کر دیا - اب صرف حسرت باقی تھی - جو برسوں تک دیوان خاص کے در و دیوار پر چھائی رہی - اور جس کا پرتو ابھی تک قاسم کے مزار پر خس و خاشاک کی صورت میں نظر آتا ہے ۔

سوتیلی ماں

(۱)

بیوی کی وفات کے تین ہی ماہ بعد دوسری شادی کرنی مرنے والی کے ساتھ ایسی بے وفائی اور اس کی روح پر ایسا ستم ناروا ہے کہ اس کی تاویل عذرِ گناہ بدتر از گناہ ہے۔ میں یہ نہ کہوں گا کہ یہ مرحومہ کی آخری وصیت تھی اور نہ شاید میرا یہ عذر ہی قابلِ پذیرائی سمجھا جائے۔ کہ ہمارے کم سن بچے کے لئے ماں ایک لازمی کیفیت تھی پر اس معاملہ میں میرا ضمیر بالکل صاف ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ برزخ میں میرا یہ فعل زیادہ سرزنش کے قابل نہ سمجھا جائے گا۔ خلاصہ یہ کہ میں نے شادی کی۔ اور باوجودیکہ ایک نویلی دلہن پر مادرانہ فرائض کی تلقین صدائے بے ہنگام اور اس کی ناشگفتہ تمناؤں کے لئے ہوائے گرم تھی۔ پر میں نے پہلے ہی دن امبا سے صاف

کہہ دیا کہ میں نے تم سے شادی صرف اس لیئے کی ہے کہ تم میرے بھولے بچے کی ماں بنو۔ اور ماں کا غم اس کے دل سے بھلا دو۔

(۲)

دو ماہ گزر گئے۔ میں شام کو منّو کو ساتھ لے کر ہوا خوری کے لیے جایا کرتا تھا۔ لوٹتے وقت بعض احباب سے ملاقات بھی کر لیا کرتا تھا۔ ان صحبتوں میں منّو بلبل کی طرح چہکتا۔ دراصل ان ملاقاتوں کی غرض لطف صحبت نہیں۔ منّو کے طفلانہ کمالات کی نمائش تھی۔ جب احباب اسے پیار کرتے۔ اس کی ذہانت اور فطری فراست کو سراہتے تو مجھ پر ایک نشہ سا طاری ہو جاتا تھا۔ خوشی کے مارے پھولا نہ سماتا۔

ایک روز میں منو کے ساتھ بابو جوالا سنگھ کے مکان پر بیٹھا ہوا تھا۔ یہ میرے بے تکلف دوستوں میں تھے۔ میرے اور ان کے درمیان کوئی راز نہ تھا۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم اپنی کمزوریاں اور خامیاں۔ اپنے خاندانی "تنازعے" اور مالی پریشانیاں بیان کرتے تھے۔ نہیں ہم ان بے تکلفی کے تذکروں میں بھی حفظِ وقار کو مدِ نظر رکھتے تھے۔ اپنی شکستوں کی داستانیں کبھی ہماری زبان پر نہ آتیں۔ سیاہ داغوں کو ہمیشہ چھپاتے تھے۔ رازداری میں بھی راز تھا۔ بے تکلفی میں تکلّف۔

دفعتہً بابو جوالا سنگھ نے منو سے پوچھا۔ کیوں منّو! تمہاری نئی اماں تمہیں خوب پیار کرتی ہیں نا؟

میں نے مسکرا کر منّو کی طرف دیکھا۔ اس کے جواب کی طرف سے مجھے کوئی اندیشہ نہ تھا۔ میں خوب جانتا تھا کہ امبا اسے دل سے پیار کرتی ہے۔ مگر مجھے کتنا تعجب ہوا۔ جب منّو نے اس سوال کا جواب زبان سے نہیں آنکھوں سے دیا۔ آنسو کے کئی قطرے اس کی آنکھوں سے ٹپک پڑے۔

مجھ پر شرم سے گھڑوں پانی پڑ گیا۔ ان چند قطروں نے امبا کے اس خوشنما اور دلاویز تصور کو مٹا دیا۔ جو میں نے ان دو مہینوں میں تیار کیا تھا۔ جوالا سنگھ نے میری طرف ناہمدردانہ انداز سے دیکھ کر منّو سے کہا۔ کیوں روتے ہو بیٹا؟

منّو نے برجستہ کہا "روتا نہیں ہوں۔ آنکھوں میں دھواں لگ گیا تھا"

جوالا سنگھ کا سوتیلی ماں کی ماتا پر شک کرنا ایک قدرتی امر تھا۔ مگر حق یہ ہے کہ میں بھی شبہ سے خالی نہ تھا۔ مجھے یقین آگیا تھا کہ امبا وہ رحم اور محبت کی دیوی نہیں ہے۔ جسے سراہتے میری زبان نہ تھکتی تھی۔ جب یہاں سے اٹھا۔ تو میرا دل بھرا ہوا تھا اور خفت سے گردن نہ اٹھتی تھی۔

(۳)

میں مکان کی طرف چلا۔ تو سوچنے لگا کہ کیونکر اپنے غصے کا اظہار کروں۔ کیوں نہ منہ ڈھانپ کر لیٹ رہوں؟ امبا پوچھے۔ تو ترش ہو کر کہہ دوں "میرے سر میں درد ہے۔ مجھے دق مت کرو" کھانا کھانے کو اٹھائے۔ تو کرخت لہجہ میں جواب دوں۔ امبا ضرور سمجھ جائے گی۔ کہ کوئی بات میری طبیعت کے خلاف ہوئی ہے۔ خوشامد کرنے لگے گی۔ اس وقت طنز و طعن سے اس کا کلیجہ چھلنی کر دوں گا۔ ایسا رلاؤں گا کہ وہ بھی یاد کرے پھر خیال آیا۔ اس کا ہنس مکھ چہرہ دیکھ کر مجھے اپنے دل پر قابو بھی رہے گا۔ اس کی ایک متبسم نگاہ۔ ایک میٹھی بات۔ ایک پر مزہ چٹکی میرے اس سنگ گراں کے ریزے کر سکتی ہے۔ پر اس کمزوری پر میری طبیعت جھنجلائی۔ یہ میری کیا حالت ہے۔ کیا اتنی جلدی ہوا کا رخ بدل گیا؟ مجھے دعوےٰ تھا۔ کہ میں شیریں اداؤں کے طوفان اور سخن ہائے دلاویز کے سیلاب میں بھی اٹل رہ سکتا ہوں۔ کہاں اب یہ کیفیت ہے کہ ان ہلکے جھونکوں کا بھی متحمل ہونے کی تاب نہیں۔ اس ملامت نے میرے دل کو مضبوط کیا۔ تاہم ایک

میری طرف طفلانہ متانت سے دیکھ کر بولا۔ جی نہیں۔ وہ مجھے پیار کرتی ہیں۔ اسی لئے مجھے بار بار رونا آتا ہے۔ میری اماں مجھے بہت پیار کرتی تھیں۔ وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئیں۔ نئی اماں ان سے بھی زیادہ پیار کرتی ہیں۔ اس لئے مجھے ڈر لگتا ہے کہ کہیں یہ بھی اسی طرح مجھے چھوڑ کر نہ چلی جائیں"!

یہ کہہ کر منّو پھر زور زور سے سسکنے لگا۔ میرے آنسو بھی نہ رُک سکے۔ امبا کے پیار نے اس ننھی سی معصوم جان پر کتنا ستم ڈھایا تھا۔ ذرا دیر کے لئے میں بھی سہم اٹھا کسی شاعر کا یہ خیال یاد آیا۔ کہ نیک روحیں اس مکروہ دنیا میں زیادہ دنوں تک نہیں ٹھہرتیں۔ کہیں تقدیر تو اس بھولے بچے کی زبان سے یہ الفاظ نہیں کہلا رہی ہے؟ ایشور نہ کرے کہ وہ روز بد دیکھنا پڑے۔ مگر میں نے استدلال سے اس اندیشہ کو دل سے دور کر دیا۔ ماں کی موت نے پیار اور جدائی میں ایک ذہنی تعلق پیدا کر دیا ہے۔ اور کوئی بات نہیں۔

منّو کو گود میں لئے ہوئے امبا کے پاس آیا اور مسکرا کر بولا۔ ان سے پوچھو کیوں رو رہے ہیں"۔ امبا چونک پڑی۔ اس کے تیور چڑھ گئے۔ بولی تمہیں پوچھو"۔

میں نے کہا "یہ اس لئے روتے ہیں کہ تم انہیں بہت پیار کرتی ہو۔ اور ڈرتے ہیں کہ تم بھی پہلی اماں کی طرح چھوڑ کر نہ چلی جاؤ"!

جس طرح گرد صاف ہوتے ہی آئینہ چمک اٹھتا ہے۔ اسی طرح امبا کا چہرہ روشن ہوگیا۔ اس نے منّو کو میری گود سے چھین لیا۔ اور شاید پہلی بار سچی مادرانہ محبت سے اس کے رخساروں کا بوسہ لیا۔

(۵)

افسوس! کیا خبر تھی۔ کہ منّو کے اندیشے اتنی جلد پورے ہوں گے؟ شاید وہ معصوم

نگاہیں پردۂ غیب کی محرم تھیں۔ شاید ان معصوم کانوں میں قضا کے فرشتے سرگوشیاں کرتے تھے۔ چھ مہینے بھی نہ گزرے تھے کہ امبا بیمار پڑی اور انفلوانزا نے دیکھتے دیکھتے اسے ہمارے ہاتھوں سے چھین لیا۔ پھر وہ باغ ویران ہوگیا۔ پھر یہ بسا ہوا گھر اجڑ گیا۔ امبا منوؔ پر قربان ہوگئی۔ ہاں اس نے مادرانہ الفت کا حق ادا کردیا۔ جاڑے کے دن تھے اور وہ گھڑی رات رہے منوؔ کے لئے ناشتا پکانے اٹھتی تھی۔ اس کی روز افزوں دل جوئیوں نے منوؔ پر اپنا قدرتی اثر پیدا کردیا تھا۔ وہ ضدی اور شریر ہوگیا تھا جب تک امبا کھلانے نہ بیٹھے منہ میں لقمہ نہ ڈالتا۔ جب تک امبا پنکھا نہ جھلے۔ چارپائی پر بیٹھ نہ سکتا۔ اُسے چھیڑتا۔ چڑاتا۔ دق کرتا۔ پر امبا کو ان شرارتوں میں کوئی روحانی لطف آتا۔ انفلوانزا اسے کراہ رہی تھی۔ کروٹ لینے کی سکت نہ تھی۔ بدن توا ہو رہا تھا۔ پر منوؔ کے ناشتے کی فکر سوار تھی۔ ہائے وہ بے نفس مادرانہ خاطر داریاں اب افسانے ہوگئے۔ مگر ان افسانوں کی یاد اب بھی دل کو تڑپاتی ہے امبا کے ساتھ منوؔ کی طفلانہ شوخی اور شرارت اور ہنسی بھی رخصت ہوگئی۔ اب وہ یاس اور حزن کی زندہ تصویر ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی اب وہ کبھی روتا نہیں۔ ممتا کی نعمت کھو کر اب اسے کوئی اندیشہ۔ کوئی خوف نہیں ؛؛

مشعلِ ہدایت

(۱)

الہ آباد کے تعلیم یافتہ حلقہ میں پنڈت دیورتن شرما کی ذات غنیمت تھی۔ ان کی اعلیٰ تعلیم اور خاندانی وقار کی بنا پر گورنمنٹ نے انہیں ایک معزز خدمت پر مامور کرنا چاہا۔ مگر انہوں نے آزادی کو ہاتھ سے دینا مناسب نہ سمجھا۔ ان کے چند خیر خواہ احباب نے بہت سمجھایا۔ کہ اس موقعہ کو ہاتھ سے نہ جانے دو۔ سرکاری ملازمت بڑے نصیبوں سے ملتی ہے۔ بڑے بڑے لوگ اس کے لئے ترستے ہیں اور اس کی آرزو لئے دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ اپنے خاندان کا نام روشن کرنے کا اس سے بہتر اور کوئی ذریعہ نہیں۔ اسے الہ دین کا چراغ سمجھو۔ ثروت اور اعزاز اور شہرت یہ سب اس کے غلام ہیں۔ رہ گئی

قومی خدمت! تو بھی قوم کے لئے تمہیں کیوں مرنے ہو؟ اسی شہر میں بڑے بڑے عالی دماغ صاحب ثروت اصحاب ہیں۔ جو بنگلوں میں شان سے رہتے ہیں اور موٹروں پر گرد و غبار کا طوفان اڑاتے ہوئے نکل جاتے ہیں۔ کیا وہ قوم کے خادم نہیں ہیں؟ جب ضرورت یا موقع آتا ہے تو وہ قوم کی خدمت کرتے ہیں۔ ابھی جب میونسپل ووٹ کا معاملہ درپیش تھا۔ تو میو ہال کے احاطہ میں فٹن اور موٹروں کا تانتا لگا ہوا تھا۔ اور ہال کے اندر قومی نعروں اور تقریروں کا۔ مگر ان میں سے کون ایسا ہے۔ جس نے اپنے ذاتی فوائد کو بالائے طاق رکھ دیا ہو۔ دُنیا کا دستور ہے کہ پہلے گھر میں چراغ جلا کر تب مسجد میں چراغ جلاتے ہیں۔ یہ قومی چرچے کالج ہی کے لئے مخصوص ہیں۔ یا اس زمانہ کے لئے جب تک انسان کو اور کوئی کام نہیں ہوتا۔ بے کار نہ رہے۔ بے گار ہی کی۔ جب کار و بار چل گیا۔ تو پھر کہاں کی قوم اور کہاں کے قومی چرچے! یہی سارے زمانہ کا دستور ہے تو تمہیں کو قوم کا قاضی بننے کی کیا ضرورت ہے؟ اور حقیقت تو یہ ہے کہ سرکاری ملازمت میں قومی خدمت کے جتنے موقعے ملتے ہیں اتنے کسی اور حالت میں نہیں مل سکتے۔ ایک رحم دل داروغہ سیکڑوں قوم پرستوں سے بہتر ہے۔ ایک منصف مزاج فرض شناس مجسٹریٹ ہزاروں قومی نعرہ بازوں سے زیادہ قومی خدمت کر سکتا ہے۔ اس کے دل میں لاگ چاہئیے۔ انسان جس حالت میں ہو قوم کو کچھ نہ کچھ نفع اپنی ذات سے پہنچا سکتا ہے۔ شرما جی اس آخری دلیل کی اہمیت سے انکار نہ کر سکے۔ مگر قائل ہونے پر بھی ان کے دل کو اطمینان نہ ہوا۔ خواہ اصولاً خواہ محض سہل انگاری اور آرام طلبی کے باعث جو اکثر ایسی حالت میں قومی خدمت کا درجہ پا جاتی ہے۔ انہوں نے ملازمت سے دور رہنے ہی کا فیصلہ کیا۔ اُن کے اس فیصلے پر کالج کے پرجوش طلبا نے انہیں مبارک بادیں دیں۔ اور اس قومی فتح پر ایک ڈراما کھیلا گیا۔ جس کے ہیرو شرما جی ہی تھے۔ اونچے حلقوں میں جا بجا اس ایثار کا چرچا ہوا۔ اور شرما جی کو قومی دائرہ میں قدم رکھتے

ہی خاصی شہرت حاصل ہوگئی۔ چنانچہ وہ کئی سال سے قوم کی خدمت کرتے تھے۔ اور اس خدمت کا بیشتر حصہ اخباروں کے پڑھنے میں صرف ہوتا تھا۔ جو بجائے خود ایک اعلےٰ درجہ کا قومی کام ہے۔ اس کے علاوہ وہ اخباروں اور رسالوں کے لئے مضامین لکھتے۔ قومی جلسے منعقد کرتے۔ فری لائبریری کے سکرٹری۔ اسٹوڈنٹ ایسوسی ایشن کے صدر۔ سوشل سروس لیگ کے اسسٹنٹ سکرٹری اور پرائمری ایجوکیشن کمیٹی کے پرجوش ممبر تھے۔ قومی رفاہ و فلاح کی تجویزیں شب و روز ان کے دماغ میں گونجا کرتی تھیں۔ زراعت کی ترقی سے انہیں خاص دلچسپی تھی۔ رسالوں میں جہاں کسی نئی کھاد یا نئی پیداوار کا ذکر دیکھتے فوراً سرخ پنسل سے نوٹ کر دیتے۔ اور اپنی تقریروں میں اس کے حاشیے دیتے۔ مگر باوجودیکہ شہر سے تھوڑے ہی دور پر ان کا ایک بڑا موضع تھا۔ اپنے کسی اسامی سے روشناس نہ تھے۔ یہاں تک کہ الہ آباد ہی میں گورنمنٹ کے زراعتی فارم کی سیر کرنے کبھی نہ گئے تھے۔

(۲)

اسی محلہ میں ایک لالہ بابو لال رہتے تھے۔ ایک وکیل کے محرر تھے۔ تھوڑی سی اردو ہندی جانتے تھے۔ مگر اپنا قانونی کام اچھی طرح کر سکتے تھے۔ وضع قطع بھدی اور جسم بھی کچھ بہت سڈول نہ تھا۔ موٹے چارخانے کی لمبی اچکن ان کے بے ڈول اور غیر متناسب جسم پر بہت نظر فریب نہ ہو سکتی تھی۔ جوتا بھی ویسا ہی پہنتے تھے۔ اور باوجودیکہ بے چارے اکثر کڑوے تیل سے اس کی مالش کرتے رہتے تھے۔ وہ اپنی گراں باری کا انتقام لینے سے نہ چوکتا تھا۔ منشی جی سال کے چھ مہینے برابر پیروں میں مرہم لگاتے رہتے تھے۔ جوتا ان کے پیروں کا محافظ نہیں۔ ان کی آبرو کا نگہبان تھا۔ اوائل عمر میں کچھ دنوں تک شرما جی کے ہم سبق رہے تھے۔ اس رشتے

سے کبھی کبھی ان کے پاس آیا کرتے۔ شرما جی کو ان کا آنا بہت ناگوار گزرتا۔ بالخصوص جب وہ خوش لباس اور خوش تقریر احباب کی موجودگی میں آجاتے اور منشی جی بھی کچھ ایسے کم نگاہ تھے کہ ان میں اپنا اَن ملاپن مطلق نظر نہ آتا۔ بلکہ ایسے موقعوں پر وہ ضرور آپہنچتے اور سب سے بڑا ستم یہ کہ برابر کرسی پر ڈٹ جاتے۔ جیسے ہنسوں میں کوا۔ اس وقت یہ لوگ انگریزی میں باتیں کرنے لگتے۔ اور بابو لال کو کم فہم۔ مخبوط الحواس بدھوا گسنٹرک وغیرہ معزز القاب سے یاد کرتے۔ اُن پر پھبتیاں چست کرتے۔ ہاں شرما جی کی یہ شرافت تھی۔ کہ وہ اپنے نا موقع شناس دوست کو حتی الامکان تضحیک سے بچاتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ بابو لال کو شرما جی سے سچی ارادت تھی۔ وہ ان کی قومی تجاویز کو بڑے غور سے سنتا۔ اور دل میں ان کی پرستش کرتا تھا۔

(۳)

ایک بار الہ آباد میں عین چیت کے مہینہ میں پلیگ کا دورہ ہوا۔ روساء شہر نکل بھاگے۔ محلے ویران ہو گئے۔ غربا مکھیوں کی طرح مرنے لگے۔ شرما جی نے بھی سامان سفر درست کیا۔ "لیکن سوشل سروس لیگ" کے سکرٹری تھے۔ ایسے موقع پر نکل جانے میں بدنامی کا خوف تھا۔ کسی حیلہ کی فکر ہوئی۔ "لیگ" میں زیادہ تر کالج اور سکول کے طلبا تھے۔ ان کی ایک میٹنگ کی۔ اور یوں قومی خدمت کی تلقین فرمائی۔

دوستو! آپ اس بدنصیب قوم کے چشم و چراغ ہیں۔ آپ اس دیوار لرزاں کے سہارے ہیں۔ ہمارے سر پر آج آفت آئی ہوئی ہے۔ ان آفتوں میں ہماری نگاہیں آپ کی طرف نہ اٹھیں۔ تو اور کس طرف اُٹھیں گی؟ دوستو! زندگی میں قومی خدمت کے ایسے موقعے نہ ملیں گے۔ ثابت کر دو۔ کہ تم مردوں کا دل رکھتے ہو۔ جو حوادث روزگار سے نہیں ڈرتا۔ ہاں دنیا کو دکھا دو کہ ہندوستان جس نے بھرت اور ہریش چندر

پیدا کیئے۔ وہ آج بھی ایثار اور قربانی سے خالی نہیں ہے۔ جس قوم کے نوجوانوں میں حرارت اور زندگی ہے۔ وہ قوم دنیا میں ہمیشہ زندہ اور نیک نام رہے گی۔ آیئے۔ ہم کمرہمت باندھیں۔ بے شک راستہ خطرناک ہے۔ کام مشکل ہے۔ آپ کو اپنے آرام اور تکلفات اور فیشن ایبل ظاہرداریوں کو خیرباد کہنا پڑے گا۔ بعض اوقات تم ہچکچکنے لگے ہٹو گے اور منہ پھیر لوگے۔ مگر بھائیو۔ یہ ہمارے ہاتھ اگر قوم کے کام نہ آئیں تو کس کام کے؟ اگر یہ ہمارے پیر قوم کی چاکری میں نہ دوڑیں۔ تو کس کام کے؟ کاش میں اس خدمت میں تمہارا ہاتھ بٹا سکتا۔ لیکن مجھے نہایت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اپنے دیہات کے بھائیوں کی جو کچھ خدمت ہو سکے۔ وہ انجام دوں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ اپنے قومی فرائض کو دل و جان سے ادا کریںگے۔ اور امید کرتا ہوں کہ واپسی میں بھی شاید آپ کی خدمت میں کچھ اضافہ کر سکوں"۔

اس کے بعد پروگرام تیار رہا۔ مختلف خدمات کے لیے جدا جدا جماعتیں قائم کی گئیں۔ کوئی تیمارداری کے لئے۔ کوئی دوا فروشی کے لئے۔ کوئی لاشوں کے جلانے کے لئے یا دفن کرنے کے لئے۔ اس طرح شرما جی نے اپنا گلا چھڑایا۔ اور شام کو اپنی ٹمٹم پر سوار ہو کر مع اسباب سفر اسٹیشن کی طرف روانہ ہوئے۔ مگر طبیعت کچھ گری ہوئی تھی۔ اپنی کم ہمتی اور کمزوری پر دل میں نادم تھے۔

سوء اتفاق سے اسٹیشن پر ان کے ایک بے تکلف دوست مل گئے۔ یہ دہی وکیل صاحب تھے۔ جن کی کرسی وزارت پر منشی بابو لال رونق افروز تھے۔ بھاگے جا رہے تھے۔ شرما جی کو دیکھ کر پوچھا۔ کیوں جناب کہاں کا قصد ہے۔ بھاگ کھڑے ہوئے؟

شرما جی پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ سنبھل کر بولے۔ "بھاگوں کیوں"؟

وکیل صاحب۔ یہ سارا شہر کس لئے بھاگا جا رہا ہے؟

شرما جی "میں ایسا بزدل۔ نافرض شناس نہیں ہوں"۔

وکیل صاحب "یار کیوں باتیں بناتے ہو۔ اچھا بتاؤ۔ کہاں جاتے ہو؟"
شرما جی "بعض دیہاتوں میں بیماری پھیل رہی ہے۔ وہاں کچھ رلیف کا کام کروں گا۔"

وکیل "سراسر غلط ہے۔ ابھی میں ڈسٹرکٹ گزٹ دیکھے آتا ہوں۔ شہر کے باہر بیماری کا نام بھی نہیں ہے۔

شرما جی لاجواب ہو کر بھی بحث کر سکتے تھے۔ دل قائل ہو جائے پر زبان نہ قائل ہوتی تھی۔ بولے "ڈسٹرکٹ گزٹ کو آپ وحی سمجھتے ہونگے۔ میں ایسا نہیں سمجھتا۔

وکیل۔ تو کیا آپ کے کان میں فرشتے کہہ گئے۔ صاف صاف کیوں نہیں کہتے کہ جان کے ڈر کے مارے بکٹٹ بھاگا جا رہا ہوں۔

شرما۔ اچھا بالفرض ایسا ہی سہی۔ تو کیا گناہ کر رہا ہوں۔ سب کو اپنی جان پیاری ہوتی ہے۔

وکیل۔ ہاں اب آئے راہ پر۔ یہ مردوں کی سی باتیں ہیں۔ اپنی جان بچانا قدرت کا پہلا قانون ہے۔ لیکن اب بھول کر بھی قوم پرستی کا دعوے نہ کیجیے گا۔ اس کے لیے آہنی استقلال اور زبردست روحانی طاقت درکار ہے۔ تن پروری اور قوم پرستی میں بعد المشرقین ہے۔ قوم کا خادم قوم پر مٹ جاتا ہے۔ اپنے تئیں قوم پر نثار کر دیتا ہے۔ تب اسے یہ آسمانی اعزاز حاصل ہوتا ہے۔ کم سے کم میں اخبار بینی کو قوم پرستی کا درجہ نہیں دے سکتا۔ اب کبھی بڑھ بڑھ کر باتیں نہ کیجیے گا۔ گویا آپ کو اپنے سوا سارے جہان کو خود غرض۔ خود پرور۔ خود مطلب کہنے کا حق حاصل ہے۔

شرما جی نے اس دریدہ دہنی کا کچھ جواب نہ دیا۔ حقارت سے منہ پھیر لیا اور جا کر گاڑی میں بیٹھ گئے۔

(۴)

جمنا پار تین اسٹیشنوں کے بعد شرما جی کا ایک موضع تھا۔ مختار صاحب سواری لئے حاضر تھے۔ شرما جی اپنے وکیل دوست کی لعن و طعن پر دل میں پیچ و تاب کھاتے اتر سے۔ وہ حضرت بھی قریب ہی بیٹھے تھے۔ ہنس کر بولے۔ جناب آپ ہی کے گاؤں میں پلیگ آیا ہے۔ چلوں میں بھی قلعی کھولوں؟

شرما جی نے کچھ جواب نہ دیا۔ بہلی پر بیٹھے۔ بے گاری حاضر تھے۔ انہوں نے اسباب سر پر لادا۔ چیت کا مہینہ تھا۔ آم کی بور کی خوشبو سے لدی ہوئی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ کبھی کبھی کوئل کی سہاؤنی کوک سنائی دے جاتی تھی۔ کھلیانوں میں کسان خوشی سے مست ہو ہو کر گا رہے تھے۔ پر شرما جی اپنی خفت سے اس درجہ مکدر ہو رہے تھے کہ انہیں ان دلفریبیوں کا احساس ہی نہیں ہوا۔

گاؤں بہت دور نہ تھا۔ شرما جی کے والد مرحوم خوش مذاق آدمی تھے۔ ایک چھوٹا سا باغ۔ مختصر سا بنگلہ۔ پختہ کنواں۔ شیوجی کا مندر۔ انہیں کی یادگاریں تھیں وہ گرمی کے دنوں میں یہیں چلے آیا کرتے تھے۔ پر شرما جی کو اس موضع میں آنے کا پہلا اتفاق تھا۔ بنگلہ میں آسائش کے سامان موجود تھے۔ بہلی سے اترے تو سیکڑوں کو دروازے پر کھڑا پایا۔ پر شرما جی تھکے ہوئے تھے۔ کسی سے مخاطب نہ ہوئے۔

دو گھڑی رات جاتے جاتے شرما جی کے نوکر چاکر بھی ٹمٹم لئے آ پہنچے۔ کہار۔ سائیس اور مہراج نینوں نے اس شان سے اسامیوں کو دیکھا۔ گویا وہ سب ان کے غلام ہیں۔ سائیس نے ایک موٹے تازے کسان سے کہا۔ گھوڑے کو کھول دو۔

غریب کسان ڈرتے ڈرتے گھوڑے کے قریب گیا۔ گھوڑے نے اجنبی صورت دیکھی۔ تیور بدلے۔ کنوتیاں کھڑی کیں۔ کسان ڈر کر لوٹ آیا۔ تب سائیس نے اس کو

دھکا دے کر کہا "بس بچھیا کے تاؤ ہی ہو۔ ہل جوتنے سے کیا اکل بھی چلی جاتی ہے؟ یہ لو گھوڑے کو نہلاؤ۔ منہ کیا بناتا ہے۔ کیا کوئی سنگھ ہے جو کھا جائے گا"۔ کسان نے ڈرتے ڈرتے راس پکڑی۔ غریب کی سہمی ہوئی صورت دیکھ کر ہنسی آتی تھی۔ قدم قدم پر خائف لگاہوں سے گھوڑے کی طرف دیکھتا۔ اور اس طرح ڈرتا تھا۔ گویا پولیس کا سپاہی ہے۔

رسوئی بنانے والے مہراج نے فرمایا۔ "ارے نائی کہاں ہے۔ چل پانی وانی لا۔ ذرا پیر دبا دے۔ تھک گیا ہوں"۔

مختار صاحب ان مہمانوں کی ضیافت کا انتظام کرنے لگے۔ سائیس اور کہار کے لئے پوریاں پکوائیں۔ مہراج کے لئے بوٹی بھنگ مہیا کی۔ اشارے پر دوڑتے تھے۔ اور کسانوں کا تو پوچھنا ہی کیا۔ وہ تو بن داموں کے غلام تھے۔ اللہ آزاد محنت کی کمائی کھانے والے کسان اس وقت غلاموں کے غلام بنے ہوئے تھے۔

(۵)

کئی دن گذر گئے۔ شرما جی اپنے بنگلہ میں بیٹھے ہوئے اخبار اور کتابیں پڑھا کرتے۔ ہالینڈ کی زراعت۔ امریکہ کی صنعت۔ جرمنی کی تعلیم کے اعداد اور نقشے ان کے پیش نظر رہتے۔ گاؤں میں ایسا کون تھا۔ جس سے وہ حظ صحبت حاصل کر سکتے؟ بے شک کسانوں سے بات چیت کرنے کا انہیں شوق تھا۔ مگر یہ اُجڈ۔ اکھڑ۔ کسان نہ معلوم کیوں ان سے محترز رہتے۔ شرما جی کا دماغ زراعتی معلومات کا ذخیرہ تھا۔ وہ کسانوں کو اپنے اس ذخیرے سے فائدہ پہنچانا چاہتے تھے۔ لیکن یہ گنوار ان سے ملتفت ہی نہ ہوتے۔ وہ انہیں جھک کر سلام ضرور کرتے اور تب کترا کر نکل جاتے جیسے کوئی پاگل کتے سے بچ کر نکل جاتے۔ اس امر کا فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ شرما جی

کے ان سے ہمکلام ہونے کی خواہش کا کیا ذکر تھا۔ خالص ہمدردی یا اپنی ہمہ دانی کا اظہار۔

شرما جی کی ڈاک شہر سے لانے اور لے جانے کے لئے دو آدمی روز روانہ کئے جاتے۔ "وہ لوٹی کونے" کے طرز علاج کے قائل تھے۔ سبزی اور میوے زیادہ استعمال کرتے۔ ایک آدمی اس کام کے لئے بھی دوڑایا جاتا۔ شرما جی نے اپنے مختار کو سخت تاکید کر دی تھی۔ کہ کسی سے مفت کام نہ لیا جائے۔ اُسے مناسب مزدوری دی جایا کرے۔ پھر باوجود اس کے انہیں تعجب ہوتا تھا کہ کوئی آدمی خوشی سے ان کاموں کے لئے آمادہ نہ ہوتا۔ روز باری باری سے آسامی بھیجے جاتے۔ وہ اسے بھی ایک قسم کی بے گار سمجھتے۔ مختار صاحب کو اکثر سختی سے کام لینا پڑتا۔ شرما جی کاشتکاروں کے اس تامل اور تساہل کو ہٹھ مردی اور کج خلقی کے سوا اور کسی خیال سے منسوب نہ کر سکتے۔ کبھی کبھی خود بھی کنوار کے بادلوں کی طرح اپنے گوشہ عافیت سے نکل ان پر برس پڑتے۔ گھوڑے کے لئے چارہ کا انتظام بھی تردد سے خالی نہ تھا۔ روز شام کے وقت جبر و تشدد کی بانگ بلند کے ساتھ بین و بکا کی دبی ہوئی سسکیاں ان کے کان میں آتیں۔ ایک کہرام سا مچ جاتا۔ لیکن اس معاملہ میں بھی وہ اپنے تئیں معذور سمجھتے۔ گھوڑا بھوکوں نہیں مر سکتا۔ گھاس کا دام دیا جاتا ہے۔ اس پر بھی اگر واویلا مچتا ہے۔ تو مچے۔ اس کی دوا میرے پاس نہیں۔ ان کے دل میں یہ گمان پختہ ہوتا جاتا تھا کہ دیہاتی بڑے سرکش۔ جبر پسند اور ہٹھ مرد ہیں۔ مختار عام صاحب ان کے بارے میں جو کچھ کہتے ہیں اس میں سر مو فرق نہیں ہے۔ اخباروں اور تقریروں میں فضول اس قدر شور و شر مچایا جاتا ہے۔ یہ لوگ اس سے زیادہ ہمدردی کے مستحق نہیں۔ اور جو لوگ ان کی بے کسی اور پستی کا راگ الاپتے ہیں۔ وہ حقیقت حال سے بے خبر ہیں۔

ایک روز شرما جی بیٹھے بیٹھے اکتا کر سیر کرنے نکلے۔ اور گھومتے گھامتے کھلیان کی طرف نکل گئے۔ آموں کے جھرمٹ میں کسانوں کی گاڑھی محنت کے سنہرے انبار لگے

ہوئے تھے۔ چاروں طرف بھس کا طوفان اٹھ رہا تھا۔ حلقۂ ماہ کی طرح زمین پر جو اور گیہوں کے ڈنٹھلوں کے حلقے بنے ہوئے تھے۔ بیلوں کے منہ میں جالی نہ تھی۔ وہ جب چاہتے تھے۔ بھوسہ میں منہ ڈال کر اناج کا ایک گال کھا لیتے تھے۔ یہ سب انہیں کے پسینے کی کمائی ہے۔ آج ان کے منہ میں جالی دینا ناشکری ہے۔ جا بجا اناج کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ گاؤں کا دھوبی اور چمار اور بڑھئی اور کمہار صورت امید کھڑے تھے۔ ایک طرف نٹ ڈھول بجا بجا کر کرتب دکھا رہا تھا۔ بھاٹ کی طبع موزوں آج مدّاکبر پر تھی۔ شرما جی اس نظارے سے خوش ہوئے۔ مگر اس ہنگامۂ مسرت میں ان کی نگاہ اپنے کئی سپاہیوں پر پڑی۔ جو لٹھ لئے اناج کے ڈھیروں کے پاس بیٹھے تھے۔ سہانے سبزہ زار میں ٹھنٹھ جیسا بدنما معلوم ہوتا ہے۔ نغمۂ دل پذیر میں بے سُری آواز جس طرح کانوں کو ناگوار گزرتی ہے۔ اسی طرح شرما جی کی پُر ذوق نگاہوں میں یہ منڈلاتے ہوئے سپاہی نظر آئے۔ انہوں نے قریب جا کر ایک سپاہی کو بلایا۔ سب کے سب پگڑیاں سنبھالتے دوڑتے ہوئے آکر کھڑے ہو گئے۔ شرما جی نے پوچھا "تم لوگ یہاں اس طرح کیوں بیٹھے ہو"؟

ایک سپاہی نے جواب دیا "سرکار! ہم لوگ اسامیوں کے سر پر سوار نہ رہیں۔ تو ایک کوڑی لگان وصول نہ ہو"۔

"اناج گھر میں جانے کی دیر ہے۔ پھر تو یہ سیدھے منہ بات نہ کریںگے۔ بڑے سرکش لوگ ہیں۔ ہم لوگ رات کو یہیں رہتے ہیں۔ اتنے پر بھی جہاں آنکھ جھپکی ڈھیر غائب ہوا"۔

شرما جی "آخر تم لوگ یہاں کب تک رہو گے"؟

سپاہی۔ جب تک سرکاری جمع کوڑی کوڑی وصول نہ ہو جائے۔ ہم لوگ بنئے کو بلا کر اپنے سامنے اناج تلواتے ہیں۔ جو کچھ ملتا ہے۔ اس میں سے سرکاری رقم کاٹ کر

مساعی کو دیتے ہیں۔

شرما جی نے سوچا۔ جب یہ کیفیت ہے تو ان کسانوں کی حالت کیوں نہ خراب ہو۔ غریب اپنے دھن کے مالک خود نہیں ہیں۔ یہ اسے اپنے پاس رکھ کر زیادہ بہتر موقع پر نہیں بیچ سکتے۔ اس کا کیا علاج ہو سکتا ہے؟ بالفرض میں اس وقت ان کے ساتھ رعایت کر دوں۔ لیکن لگان نہ وصول ہوا تو؟ کاش ہالینڈ کی مشترکہ زراعتی سوسائٹیاں یہاں ہوتیں! شرما جی کے دل میں کسانوں کی مٹھ مردی کا جو خیال پیدا ہو چلا تھا۔ اس میں اس نظارہ نے کچھ خفیف سی ترمیم کر دی۔

اس مسئلہ کو سوچتے ہوئے وہ یہاں سے چل دئے۔ سپاہیوں نے ساتھ چلنا چاہا۔ لیکن انہوں نے منع کر دیا۔ جلوس سے انہیں الجھن ہوتی تھی۔ اکیلے گاؤں میں گھومنے لگے۔ گاؤں کیا تھا۔ ملیریا اور غلاظت کا مرکز تھا۔ "انا فیلیز" کی رقص گاہ "کیولکس" کی عملداری اور "اسگومایا" کا میدان قتال! کہیں گوبر کے ڈھیر۔ کہیں کوڑے کا انبار۔ ہوا میں عفونت۔ مکانات اکثر بوسیدہ۔ دیواریں چھپر کے بوجھ سے زمین میں دھسی ہوئی۔ پرنالوں کا پانی چاروں طرف بہتا ہوا شرما جی نے ناک بند کر لی۔ اور تیزی سے قدم بڑھانے لگے۔ دم گھٹنے لگا۔ تو دوڑے خوب زور سے دوڑے اور ہانپتے ہوئے ایک سایہ دار نیم کے درخت کے نیچے آکر کھڑے ہو گئے اور ابھی اچھی طرح سانس بھی نہ لینے پائے تھے کہ بابو لال نے آکر پالاگن کیا۔ اور پوچھا "کوئی سانڈ وانڈ تھا کیا؟"

اس موضع میں بابو لال بھی آدھ آنے کے حصہ دار تھے۔ تعطیلوں میں یہیں چلے آیا کرتے تھے۔ پلیگ کی وجہ سے کچہری بند ہو گئی تھی۔ اس لئے چلے آئے تھے۔

شرما جی بولے "سنڈاس سے بھی زیادہ ہولناک گندی ہوا تھی۔ اُف یہ لوگ یہاں کیسے رہتے ہیں؟"

بابو لال "رہتے کیا ہیں۔ زندگی کے دن پورے کرتے ہیں"۔
شرما جی "مگر یہ مقام تو صاف نظر آتا ہے"۔
بابو لال "جی ہاں۔ اس طرف گاؤں کے کنارے تک صاف جگہ ملے گی"۔
شرما جی "تو پھر اُس طرف کیوں اتنی گندی ہے"؟
بابو جی "گستاخی معاف ہو تو عرض کر دوں"۔
شرما جی (ہنس کر) جان بخشی کیوں نہ کردائی۔ واقعی کیا بات ہے؟ ایک طرف ایسی صفائی۔ دوسری طرف ایسی غلاظت"۔
بابو لال "یہ میرا حصہ ہے۔ میں اپنے حصہ کی نگرانی خود کرتا ہوں۔ آپ کا حصہ ملازموں کی توجہ پر ہے"۔
شرما جی "اچھا یہ بات ہے۔ آخر آپ کیا حکمت کرتے ہیں"؟
بابو لال "کچھ نہیں۔ صرف تاکید کرتا رہتا ہوں۔ جہاں زیادہ گندہ پن دیکھتا ہوں۔ خود صاف کروا دیتا ہوں۔ صفائی کا ایک انعام مقرر کر دیا ہے۔ جس کا مکان سب سے زیادہ صاف ہوتا ہے۔ اس کو یہ انعام ملتا ہے۔ آئیے تشریف رکھئے۔
شرما جی کے لئے ایک کرسی رکھ دی گئی۔ آکر بیٹھ گئے۔ اور بولے "شاید آج ہی آتے ہو"؟
بابو لال "جی ہاں پلیگ نے کچہریوں پر بھی اثر کیا"۔
شرما جی "شہر کی کیا کیفیت ہے"؟
بابو لال "بہت خراب۔ بیماری بڑھتی جاتی ہے۔ سوشل سروس والے آپ کے آتے ہی غائب ہو گئے۔ غریبوں کے گھروں میں لاشیں پڑی سڑتی ہیں۔ میونسپلٹی والے بھی جان بچاتے پھرتے ہیں۔ بازار بند ہیں۔ اناج مشکل سے ملتا ہے۔
شرما جی "بھلا بتلائیے۔ ایسی حالت میں وہاں رہ کر کیا کرتا۔ بس لوگوں نے

میری ہی جان سستی سمجھ رکھی ہے۔ کیا مجھ ہی کو قومی خدمت کا دعوئے ہے جسے
دیکھو۔ وہی قومی شہید بنا پھرتا ہے۔ جو لوگ ہزاروں روپے عیش اور تکلف میں
اڑاتے ہیں۔ اُن کا شمار بھی قومی فدائیوں میں ہے۔ میں تو پھر بھی کچھ نہ کچھ کرتا ہی رہتا
ہوں۔ آخر میں بھی انسان ہوں۔ کوئی دیوتا نہیں۔ فرشتہ نہیں۔ دولت کی ہوس
نہ سہی۔ مگر قومی اعزاز کی ہوس مجھے بھی ہے۔ میں جو شب و روز اخبار بینی میں صرف
کروں۔ اخباروں کے لئے مضامین لکھنے میں سر کھپاؤں۔ جابجا تقریریں کرتا پھروں
اس کا صلہ بس یہی کافی سمجھا جاتا ہے کہ جب کسی سیٹھ جی یا وکیل صاحب کے دردولت
پر حاضر ہو جاؤں۔ تو وہ ایک مربیانہ انداز سے میری مزاج پرسی کر لیں۔ لیکن جب
کوئی ممبری خالی ہوتی ہے تو نظر انتخاب فوراً کسی وکیل صاحب پر جا پڑتی ہے جنہیں
بجز اپنی ذاتی ثروت کے اس اعزاز کا کوئی استحقاق نہیں۔ تو بھئی جو گڑ کھائے۔ وہ
کان چھدوائے۔ قومی سرفروشی کا بہترین صلہ قومی اعزاز ہے۔ جب وہاں تک میری
رسائی ہی نہیں۔ تو کیوں جان دوں۔ اگر یہ آٹھ سال میں نے لکشمی کی پوجا میں صرف
کئے ہوتے تو غالباً اب تک میرا شمار بھی لیڈروں میں ہوتا۔ لیکن ابھی تک چھٹ
بھیّوں میں سمجھا جاتا ہوں۔ جہاں دیکھو وہاں دولت کی پوچھ اور قدر ہے۔ ابھی
میں نے کتنی محنت سے زراعتی بینک پر مضمون لکھا۔ مہینوں اس کی تیاری میں
صرف کئے۔ سیکڑوں میگزین اور رسالے پڑھنا پڑے۔ مگر کسی نے اس مضمون کو پڑھنے
کی بھی تکلیف نہ گوارا کی۔ اگر اتنی محنت کسی اور کام میں صرف کرتا تو کم سے کم
اپنا بھلا تو ہوتا۔ نہیں تو بھاڑ لیپ کر ہاتھ کالا کرنے کے سوا اور کیا نتیجہ ہوا؟

بابو لال۔ آپ کا فرمانا بجا ہے۔ مگر جب آپ جیسے لوگ ایسے خیالات کو
دل میں جگہ دینگے۔ تو یہ قوم کا بیڑا کون پار لگائے گا؟

شرما جی۔ وہی۔ جو آنریبل بنے گھومتے ہیں۔ بندہ تو اب سیر و سیاحت

کرے گا۔ دنیا کی ہوا کھائے گا"۔ بابولال نے سلسلہ کلام بدل کر پوچھا" یہ تو تبلائیے دیہات کو آپ نے پسند کیا؟"

شرما جی - پسند تو خاک نہیں کیا۔ ہاں کچھ نئے تجربے البتہ ہو گئے۔ خیال تھا کہ کاشتکار لوگ بڑے غریب اور بے کس ہوتے ہیں۔ اب معلوم ہوا کہ یہ لوگ موٹے نامہمان نواز اور جبر پسند ہیں۔ سیدھے سے بات نہ سنیں گے۔ مگر سختی سے جو کام چاہو کروالو۔ بس چوپایوں کا خاصہ ہے اور تو اور مالگذاری کے لئے بھی ان کے سر پر سوار رہنے کی ضرورت ہے۔ ٹل جاؤ۔ تو کوڑی نہ وصول ہو۔ نالش کیجئے۔ قرقی کرائیے۔ بے دخلی جاری کیجئے۔ خود زیر بار ہو کر انہیں زیر بار کیجئے۔ یہ سب انہیں منظور ہے۔ پر وقت پر روپیہ دینا نہیں جانتے۔ یہ سب تجربے میرے لئے نئے ہیں۔ مجھے اب تک ان سے جو ہمدردی تھی۔ وہ اب نہیں ہے۔ اخبارو ں میں ان کے حال زار پر جو مرثیے گائے جارہے ہیں۔ وہ بالکل خیالی اور فرضی ہیں۔ کیوں آپ کا کیا خیال ہے؟

بابولال :- مجھے تو اب تک اس قسم کی کوئی شکایت نہیں ہوئی۔ میرا تجربہ تو یہ ہے کہ یہ لوگ بڑے خلیق احسان شناس اور بامروت ہیں۔ ہاں ان کے یہ اوصاف سطح پر نہیں نظر آتے۔ ان سے ہمدردی کیجئے۔ ملئے۔ ان کے دل میں گھسئے۔ تب ان کے جوہر کھلتے ہیں۔ ان پر اعتبار کیجئے۔ تب وہ آپ پر اعتبار کرینگے۔ آپ کہیں گے پیش قدمی کرنا ان کا کام ہے۔ اور آپ کا یہ کہنا درست ہے۔ پر صدیوں سے انھوں نے اتنی ٹھوکریں کھائی ہیں۔ کہ ان میں آزادانہ اوصاف سلب ہو گئے ہیں زمیندار کو وہ ایک ہوّا سمجھتے ہیں۔ جس کا کام انہیں نگل جانا ہے۔ چونکہ وہ اس کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔ اس لئے مکر و فریب سے کام لیتے ہیں۔ جو کمزوروں کی سپر ہے۔ لیکن ایک بار آپ ان کی نگاہ میں اپنا اعتبار جما دیجئے اور پھر آپ کو شکایت

کا کوئی موقع نہ رہے گا"

بابو لال یہ باتیں کہہ ہی رہے تھے کہ چماروں نے گھاس کے گٹھے لاکر ان کے دروازہ پر ڈال دئیے۔ اور چپ چاپ چلے گئے۔ شرما جی کو تعجب ہوا۔ اسی گھاس کے لئے ان کے بنگلہ پر روز ہائے وائے مچتی رہے اور یہاں کسی کو خبر بھی نہ ہوئی۔ پوچھا۔ آخر اعتبار جمانے کی ترکیب بھی کوئی ہے؟

بابو لال نے منکسرانہ انداز سے کہا۔ آپ خود عاقل اور زمانہ شناس ہیں میرا آپ کے روبرو زبان کھولنا گستاخی ہے۔ میں تو اس کی ایک ہی ترکیب جانتا ہوں۔ انہیں کسی تکلیف میں دیکھ کر فوراً ان کی مدد کیجئے۔ میں نے انہیں کے لئے ہومیو پیتھی سیکھی۔ اور ایک چھوٹا شفا خانہ اپنے ساتھ رکھتا ہوں۔ اگر کبھی روپیہ کی ضرورت ہوتی ہے تو روپیہ۔ اناج کی ضرورت ہوتی ہے۔ تو اناج دیتا ہوں۔ پر سود نہیں لیتا۔ اس میں مجھے خسارہ ہرگز نہیں ہوتا۔ دوسری صورتوں میں سود سے بہت زیادہ مل رہتا ہے۔ گاؤں میں دو اندھی عورتیں اور دو یتیم لڑکیاں ہیں۔ ان کی پرورش کا انتظام کر دیا ہے۔ ہوتا سب کسانوں ہی کی کمائی سے ہے۔ پر نیک نامی میری ہوتی ہے۔ اتنے میں کئی اسامی آئے۔ اور بابو لال سے بولے۔ بھیا! باقی لے لی جائے"۔

بابو لال نے آنکھوں سے اشارہ کیا۔ وہ روپیہ رکھ کر چل دئیے۔ شرما جی نے سوچا اسی لگان کے لئے میرے چپراسی کھلیان میں چار پائیاں ڈال کر سوتے ہیں اور دہی لگان یہاں اس طرح بے خرخشہ وصول ہو رہا ہے۔ بولے "یہ تو اسی حالت میں ہو سکتا ہے۔ جب زمیندار خود گاؤں میں رہے"۔

بابو لال۔ جی ہاں اور کیا۔ اور محض رہنے ہی سے کیا ہو گا۔ اس کی نیت صاف ہو۔ طبیعت میں ہمدردی کا مادہ ہو۔ حریص خود غرض اور ظالم نہ ہو۔ ورنہ

اس گاؤں سے دُور رہنا ہی اچھا۔ ہاں بڑے بڑے زمینداروں کو البتہ یہ دقت ہوتی ہے کہ بعض اوقات وہ نیت صاف رکھنے پر بھی اپنی اسامیوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔ کیونکہ ان کے ملازم کچھ کا کچھ کیا کرتے ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اگر آقا کسی کام کو دل سے کرنا چاہے تو اُس کے ملازم جلد یا دیر میں ضرور اس کی راہ چلنے لگتے ہیں۔ ہاں اگر آقا میں خود ہی کمزوری باقی ہے۔ نیت کا صاف ہے۔ لیکن ارادہ کی قوت اور فیصلہ کی ہمّت نہیں رکھتا۔ تو ملازموں کی بن آئی ہے وہ اسے اپنے ڈھرے پر کھینچ لے جاتے ہیں۔

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ شرما جی کے کہار نے آکر اطلاع دی کہ رسوئی ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ چل کر جیم لیجئے۔

(۶)

شرما جی یہاں سے اُٹھے۔ تو بابو لال کی باتیں ان کے کان میں گونج رہی تھیں۔ ان کے معقول ہونے میں شک نہ تھا۔ لیکن شرما جی اعلےٰ درجہ کے تعلیم یافتہ آدمی تھے۔ اور کسی بات کو خواہ وہ بظاہر کیسی ہی معقول کیوں نہ ہو۔ بغیر استدلال اور توجیہ کے تسلیم نہیں کر سکتے تھے۔ بابو لال کو وہ ہمیشہ ایک معمولی عقل کا انسان سمجھتے آتے تھے۔ اور اس خیال میں یک بارگی تغیر ہونا ممکن نہ تھا۔ ان باتوں کا اُلٹا اثر یہ ہوا کہ انہیں بابو لال سے کچھ چڑھ سی ہو گئی۔ انہیں ایسا معلوم ہوا گویا وہ زمینداری کے معاملات میں اپنی فضیلت کا اظہار کرتا ہے۔ جس شخص نے ہمیشہ دوسروں کی تعلیم و تنبیہہ کی ہو۔ وہ بابو لال جیسے آدمی کا معتقد کیونکر ہو سکتا تھا وہ اپنے بنگلہ کو لوٹنے لگے۔ تو ان کا استدلال بابو لال کی باتوں کے پُرزے پُرزے کر رہا تھا۔ خوب! اب میں دیہات میں آکر رہوں۔ ساری

زندگی کی آرزوؤں سے ہاتھ دھولوں۔ دیہقانوں کے ساتھ بیٹھا گپیں اڑاؤں۔ گھڑی آدھ گھڑی تو خیر دل بہلاؤ کے طور پر ان سے بات چیت کرنا ناممکن ہے۔ مگر یہ نہیں ہوسکتا کہ دس پانچ گنوار میرے سر پر سوار رہیں۔ مجھے تو مالیخولیا ہو جائے گا۔ مانا کہ میرا فرض ان کی خبر گیری ہے۔ پر یہ نہیں ہو سکتا۔ کہ ان کے لئے میں اپنے تئیں بدل ڈالوں۔ بابو لال بننا اب میرے امکان سے باہر ہے۔ جس کی پرواز فکر اس گاؤں کے احاطے سے باہر نہیں جا سکتی۔ مجھے دنیا میں بہت کام کرنا ہے۔ میرے لئے یہ زندگی ناموزوں ہی نہیں بلکہ مہلک ہے۔

یہی سوچتے ہوئے وہ بنگلہ پر پہنچے۔ تو کیا دیکھتے ہیں کہ کئی کانسٹیبل مغرورانہ انداز سے برآمدہ میں لیٹے ہوئے ہیں۔ مختار عام نے شرما جی کو دیکھتے ہی بڑھ کر کہا "حضور! آج داروغہ جی آگئے ہیں۔ میں نے کمرہ میں ان کے پلنگ بچھوا دیئے ہیں۔ یہ لوگ جب اس علاقہ میں آجاتے ہیں۔ تو یہیں قیام کرتے ہیں۔ حضور کا پلنگ اوپر بچھا ہوا ہے۔

شرما جی اپنے دوسرے اخبار نویس بھائیوں کی طرح پولیس سے بغض للہ رکھتے ہیں۔ یہ باتیں سنتے ہی ان کے بدن میں آگ سی لگ گئی۔ خشمگیں نگاہوں سے مختار صاحب کی طرف دیکھا اور دل میں یہ ٹھان کر کہ ابھی ان حضرات کا بوریا بدھنا اٹھا کر باہر پھینک دیتا ہوں۔ تیور بدلے۔ جھپٹتے ہوئے برآمدے میں پہنچے کہ چھوٹے داروغہ ٹھاکر گوکلت سنگھ نے کمرہ سے نکل کر پالاگن کیا۔ اور ہاتھ بڑھا کر بولے۔ اچھی ساعت سے چلا تھا۔ کہ آپ سے نیاز حاصل ہو گیا۔ آپ مجھے بھول تو نہ گئے ہوں گے؟

یہ حضرت دو سال قبل سوشل سروس لیگ کے ایک سرگرم ممبر تھے۔ انٹرمیڈیٹ کلاس میں فیل ہو جانے کے بعد پولیس ٹریننگ میں داخل ہو گئے تھے۔ شرما جی نے

نہیں دیکھا۔ پہچان گئے۔ ہاتھ بڑھا دیا۔ غصہ فرو ہو گیا۔ مسکرانے کی کوشش کر کے بولے۔ "حافظہ تو ذی اختیار لوگوں کا کمزور ہوتا ہے۔ میں تو آپ کو دور ہی سے پہچان گیا۔ کہیئے کیا اسی تھانے میں تعینات ہوئے ہیں"؟

کوکلت سنگھ۔ جی ہاں! آج کل یہیں ہوں۔ آیئے۔ آپ کو داروغہ جی سے انٹروڈیوس کرا دوں۔

اندر کرسی پر داروغہ ذوالفقار خاں لیٹے ہوئے حقہ پی رہے تھے۔ قوی ہیکل آدمی تھے۔ چہرہ سے رعب اور تحکم نمایاں تھا۔ شرما جی کو دیکھتے ہی اٹھ کر ہاتھ ملایا اور بولے "آپ سے نیاز حاصل کرنے کا اشتیاق مدت سے تھا۔ آج خوش نصیبی سے موقع بھی مل گیا۔ اس تصرف بے جا کو معاف فرمایئے گا"۔

شرما جی کو تجربہ ہوا۔ کہ پولیس کے لوگ خواہ مخواہ کج خلق مشہور ہیں۔ ہاتھ ملا کر بولے۔ "یہ آپ کیا فرماتے ہیں۔ یہ آپ کا خانہ بے تکلف ہے"۔

لیکن پولیس پر چھینٹے جمانے کا ایسا نادر موقع ہاتھ سے نہیں دینا چاہیئے کوکلت سنگھ سے بولے۔ "آپ نے تو شاید پچھلے سال کالج چھوڑا۔ لیکن پولیس میں کیونکر آ پھنسے"؟

داروغہ ذوالفقار خاں یہ للکار سن کر سنبھل بیٹھے۔ اور بولے۔ "کیوں جناب! کیا پولیس ہی سارے محکموں سے گیا گزرا ہے۔ ایسا کون سا محکمہ ہے۔ جہاں رشوت کا بازار گرم نہیں۔ اگر آپ کسی ایسے محکمے کا نام بتا دیجئے تو تا زیست غلامی کر دوں۔ ملازمت کر کے کوئی رشوت سے بچ جائے۔ یہ محال ہے۔ تعلیم کے محکمہ کو بے لوث کہا جاتا ہے۔ مگر اس کا بھی تجربہ ہو گیا۔ اڈیٹر لوگ بڑے پاک و صاف بنتے ہیں۔ مگر ان کی بھی تھاہ لے چکا۔ شفاخانہ کا محکمہ پاک سمجھا جاتا ہے لیکن میں حلف اٹھا سکتا ہوں کہ پولیس سے وہ کسی معنی میں بہتر نہیں۔ اب میں

کسی کے راست بازی کے دعوے کو تسلیم نہیں کر سکتا۔ اور دوسرے محکموں کی نسبت تو نہیں کہہ سکتا۔ لیکن پولیس کے محکمہ میں جو رشوت نہیں لیتا۔ اسے میں احمق سمجھتا ہوں میں نے دو ایک راست باز سب انسپکٹر دیکھے ہیں۔ لیکن ہمیشہ تباہ۔ کبھی معتوب۔ کبھی معطل۔ کبھی برخاست۔ جو شخص خود نہ کھائے گا وہ دوسروں کو کیوں کھانے دیگا لیکن چوکی دار اور کانسٹیبل ہمارے دست و بازو ہیں۔ انہیں کی کارگذاری اور جانفشانی پر ہماری نیک نامی کا دارومدار ہے۔ جب وہ خود پریشاں حال ہونگے تو کام کیا خاک کرینگے۔ جو لوگ خود ہاتھ بڑھاکر لیتے ہیں وہ دوسروں کو بھی کھلاتے ہیں۔ اور افسروں کو بھی خوش رکھتے ہیں۔ ان کا شمار کارگزار اور نیک نام افسروں میں ہوتا ہے۔ میں نے تو اپنا یہی اصول مقرر کرایا ہے اور خدا کا شکر ہے۔ افسر اور ماتحت سبھی خوش ہیں"۔

شرما جی نے کہا۔ انہیں وجوہ سے تو میں نے ٹھاکر صاحب سے کہا۔ کہ آپ یہاں کیونکر آ پھنسے"۔

ذوالفقار خاں تیز ہو کر بولے "پھنسے نہیں یہاں آکر پارس ہو گئے۔ ورنہ کسی دوسرے صیغہ میں ہوتے۔ تو اب تک ٹھوکریں کھاتے پھرتے۔ اب گھوڑے پر سوار نوشہ بنے گھومتے ہیں۔ ہاں ذرا ابھی تنہا خوری کی عادت ہے "۔ وہ رفتہ رفتہ دور ہو جائے گی۔ بھئی ٹھاکر صاحب بُرا نہ مانیئے گا۔ میں نے کئی ٹریننگ والوں کو دیکھا۔ یہ حضرت چاہتے ہیں کہ جو کچھ ہے اکیلے ہی ہضم کرلیں۔ تھانہ کے دیگر اہلکار منہ تاکتے رہ جاتے ہیں۔ دنیا کی نگاہ میں ایماں دار بنا چاہتے ہیں۔ ایماندار بنتے ہو۔ تو دل سے بنو۔ اس مکاری سے کیا حاصل ہے؟ جب خدا ہی کا خوف نہیں۔ تو دنیا کا کیا ڈر؟ یہ حضرت چھوٹی چھوٹی رقموں پر گرتے ہیں۔ ہمارے غرور کے کسی دیرینہ آدمی سے تجربہ نہ حاصل کرینگے۔ جہاں آسانی سے سو ملے"

سکتے ہیں۔ وہاں پانچ میں ملبل ہو جاتے ہیں۔ کہیں دودھ والے کی قیمت ماری کہیں مودیوں کے نرخ کے بارے میں دردسری کی۔ کہیں حجام کے پیسے دبا لئے۔ ان چھوٹی چھوٹی باتوں سے فایدہ تو بہت کم ہوتا ہے۔ بدنامی البتہ بہت۔ میں بڑے بڑے شکاروں پر نگاہ رکھتا ہوں۔ پدی اور بٹیر ماتحتوں کے لئے چھوڑ دیتا ہوں۔ اور حق تو یہ ہے۔ غرض بری شے ہے۔ رشوت دینے سے زیادہ احمق اندھے آدمی دنیا میں نہ ہوں گے۔ کتنے ہی ایسے باؤلے آتے ہیں جو محض یہ چاہتے ہیں کہ تیں ان کے کسی پٹی دار یا رقیب کو دو چار جھڑپ سنا دوں۔ اتنے ہی کے لئے سیکڑوں روپے دیئے جاتے ہیں۔ ایسے عقل کے دشمنوں پر رحم کرنا حماقت ہے۔ اس علاقہ کو ضلع میں کان جواہر کا خطاب ملا ہوا ہے۔ سب انسپکٹر لوگ اس کے عاشق ہیں۔ ایک نہ ایک فساد روز برپا ہوتا رہتا ہے۔ زمیندار نرے جاہل کے لٹھ ذرا ذرا سی بات پر فوجداریاں کر بیٹھتے ہیں۔ بس سارے علاقہ میں یہی آپ کا پٹی دار بابو لال البتہ سمجھدار آدمی ہے۔ اس کے یہاں کسی کی دال نہیں گلتی۔ اور لطف یہ ہے کہ کوئی اس سے ناخوش نہیں۔ بس میٹھی میٹھی قند و شکر کی سی باتوں سے من بھر دیتا ہے۔ اپنی اسامیوں کے لئے جان دینے کو حاضر اور حق یہ ہے کہ میں زمیندار ہوتا۔ تو اسی کے نقش قدم پر چلتا۔ زمیندار کا فرض ہے کہ اپنی اسامیوں کو ظلم و ستم سے بچائے۔ ان پر شکاریوں کا وار نہ ہونے دے۔ یوں حرص یا ضرورت سے مجبور ہو کر انسان کیا نہیں کر ڈالتا۔ لیکن ان غریب بے کسوں کی حالت واقعی قابل رحم ہے اور ان کے لئے جو شخص سینہ سپر ہو۔ اس کو داد دینی چاہیئے۔

شرما جی نے داروغہ صاحب کی اس طولانی تقریر کو اس طرح سنا گویا وہ کسی مجذوب کی بکواس ہے۔ ظالمانہ صاف گوئی اور ستم ظریفانہ انداز اور رفیق انسانیت

کے ساتھ برہنہ خودغرضی نے اس میں ایک خاص لطافت پیدا کر دی تھی۔ ایسی تقریر کا جواب دینے کی کوشش کرنا بے سود تھا۔ بولے۔ "کیا کوئی تفتیش درپیش ہے یا محض گشت؟"

داروغہ جی نے فرمایا "جی نہیں مسٹر گشت۔ آج کل فصل کے دن ہیں اور یہی زمانہ ہماری فصل کا بھی ہے۔ شیر کو بھی تو ماند میں بیٹھے بیٹھے شکار نہیں ملتا۔ ہم بھی شکار کی تلاش میں گھوم رہے ہیں۔ خفیہ فروش کو گرفتار کرینگے۔ کسی کو سرقہ کا مال خریدتے ہوئے پکڑ لیں گے اور اگر ہمارے نصیب سے کہیں ڈاکہ پڑ گیا۔ تو ہماری پانچوں گھی میں ہیں علاقہ میں جتنے شری فتنہ باز سیاہ قلب دو پاتے ہیں وہ سب اپنے تابع فرمان ہیں۔ آپ میری صاف گوئی پر حیران ہوتے ہوں گے۔ لیکن میں اپنے سارے ہتھکنڈے بیان کروں۔ تو شاید آپ کو یقین نہ آئے۔ اور لطف یہ ہے کہ میرا شمار ضلع کے نہایت ہوشیار۔ متدین۔ کارگزار سب انسپکٹروں میں ہے۔ فرضی ملزم بھی پکڑتا ہوں۔ گواہ بھی اصلی دلواتا ہوں۔ میری فراہم کی ہوئی شہادتیں ایسی ہوتی ہیں کہ بیرسٹر کا باپ بھی ہو۔ تو ناکوں چنے چبائے۔

اس اثنا میں شہر سے ڈاک آگئی۔ شرما جی اٹھ کھڑے ہوئے۔ بولے "داروغہ جی آپ کی باتیں بڑے مزے دار ہیں۔ اب اجازت دیجئے۔"

(۷)

چاندنی رات تھی۔ شرما جی کھلی چھت پر لیٹے ہوئے اخبار پڑھنے میں غرق تھے اخبار ان کے لئے دعوتِ روح تھی۔ اس میں انہیں نغمہ اور بہار کا لطف حاصل ہوتا تھا۔ دفعتاً ایک ہلچل سن کر نیچے جھانکا۔ تو کیا دیکھتے ہیں کہ گاؤں کے ہر ایک طرف سے کسانوں کے غول کے غول کانسٹیبلوں کے ساتھ چلے آرہے ہیں۔ رہ رہ کر کانسٹیبلوں کی گالی گلوج بھی سنائی دیتی تھی۔ یہ سب آدمی بنگلہ کے سامنے صحن میں بیٹھتے جاتے تھے۔ کہیں کہیں

سے عورتوں اور بچوں کے رونے اور چیخنے کی پُر درد آوازیں کان میں آرہی تھیں۔ شرما جی حیران تھے کہ کیا ماجرا ہے۔ دفعتہً بڑے داروغہ صاحب کی گرج سنائی دی۔ "تم لوگوں کو تھانہ چلنا ہوگا۔ ہم ایک نہ مانیں گے۔"

پھر سناٹا ہوگیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کسانوں میں کاناپھوسی ہو رہی ہے۔ اس کے بعد ایک کہرام سا مچ گیا۔ مختار صاحب اور داروغہ جی کی مغلظات اس گریہ و زاری میں یوں سنائی دیتی تھی جیسے آندھی میں بادل کی گرج +

شرما جی سے اب صبر نہ ہو سکا۔ وہ زینے کے دروازے پر آئے اور کمرہ میں جھانک کر دیکھا۔ میز پر روپے گنے جا رہے تھے۔

داروغہ صاحب بولے "اتنے بڑے موضع میں یہ رقم؟"

مختار صاحب نے جواب دیا "گھبرائیے نہیں۔ اب کی مُکھیوں کی خبر لی جائے گی تب داروغہ جی نے ڈانٹ کر کہا۔" یہ حرام زادے سیدھے سے نہ مانیں گے۔ اٹل سنگھ! ان مکھیوں کو گرفتار کرلو۔ فوراً ہتھکڑیاں ڈال دو۔ ایک ایک کو جیل بھجوا دونگا یہ ڈاکہ انہیں لوگوں کا کام ہے۔ دیکھوں کیسے بچتے ہیں"۔

پھر صحن میں ڈھول سا پٹنے لگا۔ شرما جی کا خون جوش کھا رہا تھا۔ انہوں نے ہمیشہ حق اور انصاف کی حمایت کی تھی۔ ظلم و ستم کا یہ ڈراما اپنی آنکھوں سے دیکھ کر خاموش رہنا ان کے لیے غیر ممکن تھا +

یکایک کسی نے چیخ کر کہا۔ "دہائی ہے سرکار کی۔ مُکتار صاحب ہم لوگوں کا ہک ناہک مروائے ڈارت ہیں!"

اس فریاد نے بارود میں آگ لگا دی۔ شرما جی غصہ سے بھرے ہوئے بے تحاشا زینہ سے اُترے۔ معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ جاتے ہی جاتے مختار صاحب کو ٹھڈوں سے گرادینگے۔ اور داروغہ کو ایسی لعن طعن کرینگے۔ کہ اُسے بھاگتے ہی بن پڑے۔ مگر یکایک

ہمدردوں میں ضبط نفس کی بڑی طاقت ہے۔ سنبھل گئے۔ توازن غصہ پر غالب آگیا مختار صاحب کو بلا کر کہا۔ "لالہ صاحب! آپ نے یہ کیا غل غپاڑا مچا رکھا ہے؟"

مختار صاحب بولے۔ "حضور داروغہ جی نے ان آدمیوں کو ایک ڈاکہ کی تفتیش کے لئے طلب کیا ہے۔" اور شرما جی کے کان میں کہا۔ "آدھا سا جھا طے ہو گیا ہے۔"

شرما جی کو اب تاب نہ رہی۔ تلملا کر بولے۔ "تم حرام خور ہو۔ خبردار جو مجھ سے ایسی بات کی۔ ان آدمیوں کو فوراً رخصت کر دو۔ ورنہ مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔"

داروغہ جی بڑے موقع شناس آدمی تھے۔ مختار صاحب کی باتوں سے انہوں نے اخذ کیا تھا کہ شرما جی اس مال غنیمت میں شریک ہوں گے۔ ان کی صاف بیانیاں اسی غلط فہمی کا نتیجہ تھیں۔ اب انہیں اپنی غلطی معلوم ہوئی۔ شرما جی کے تیور دیکھے۔ آنکھوں سے غصہ کی شعاعیں نکل رہی تھیں۔ ان کے رسوخ اور وقار سے واقف تھے۔ قریب آکر بولے۔ جناب آپ کے مختار صاحب نے مجھے بڑا دھوکا دیا۔ ورنہ حلف سے کہتا ہوں۔ یہاں ہرگز یہ شر نہ برپا کرتا۔ آپ میرے دوست بابو کو کلت سنگھ کے محسن ہیں۔ اور اس لحاظ سے میں آپ کو اپنا مربی سمجھتا ہوں۔ اپنے ہی گھر میں آگ نہ لگاتا۔ لیکن اس شخص نے مجھے بڑا چکمہ دیا۔ اور میں بھی ایسا احمق تھا کہ اس چکمے میں آگیا۔ میں سخت نادم ہوں۔ اور آپ سے معافی چاہتا ہوں (آہستہ سے) میری ایک دوستانہ صلاح قبول فرمائیے۔ اس مختار کو جس قدر ممکن ہو۔ الگ کر دیجئے۔ یہ آپ کی ریاست کو تباہ کئے ڈالتا ہے۔"

(۸)

منشی بابو لال اپنے دروازے پر بیٹھے ہوئے اسی ماجرے کے متعلق بات چیت کر رہے تھے۔

شیودین ’’بھیا آپ جا کے درگا کو کیوں نہیں سمجھاتے ؟ رام رام ایسا اندھیر!‘‘

بابولال ’’بھئی میں دوسرے کے معاملے میں دخل دینے والا کون ؟ شرما جی تو وہیں ہیں ان کی مرضی جیسی ہو گی ۔ ویسا کرینگے ۔ یہ آج کوئی نئی بات تھوڑے ہی ہے ۔ دیکھتے تو ہو کہ ہر مہینہ ایک نہ ایک لفڑا لگا رہتا ہے ۔ یہ سب مختار صاحب کے کرتوت ہیں ۔ شرما جی متین آدمی ہیں شرافت اور ملائمت سے پیش آتے ہیں ۔ مختار نے سمجھا ہوگا ۔ وہ اس معاملہ میں بھی زبان نہ کھولیں گے اور غالباً اس کا خیال صحیح نکلا ۔ ورنہ شرما جی کے روبرو یہ طوفان کیونکر مچتا ۔ ہاں یہ تو بتلاؤ ۔ اب کی کتنی اوکھ ہوتی ہے ؟‘‘

رام داس ۔ ’’اوکھ تو بہت ہے ۔ پر جب وشٹوں کے مارے بچے بھیا تم مانتے نہیں ہو ۔ پر آنکھ دیکھی بات ہے کہ کڑاہ کڑاہ رس جل گیا اور پاؤ بھر مال بھی نہ پڑا ۔ نہ جانے ایسا کون سا منتر مار دیتے ہیں ۔

بابولال ’’اچھا اب کے میرے کہنے سے یہ نقصان اٹھالو ۔ دیکھوں ایسا کون بڑا منتر باز ہے ۔ جو کڑاہوں کا رس جلا دیتا ہے ۔ ضرور اس میں کوئی نہ کوئی راز ہے ۔ اب کے میرے سامنے گڑ بنانا ۔ اور کسی باہر کے آدمی کو مت آنے دینا ۔ پھر دیکھوں کیسے مال نہیں پڑتا ۔ اس گاؤں میں جتنے کولھو زمین میں دھنسے پڑے ہیں ۔ ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے ۔ کہ پہلے یہاں بہت اوکھ ہوتی ہوگی ۔‘‘

شیودین ۔ بھیا ہمارے ہوش میں یہ سب کولھو چلتے رہے ۔ ماگھ پوس میں رات بھر بجار لگی رہتی تھی ۔ پر جب سے یہ بدّیا پھیلی ہے ۔ تب سے کوئی اوکھ کے پاس نہیں جاتا ۔

بابولال ۔ ’’ایشور چاہیں گے ۔ تو پھر ویسی ہی اوکھ ہوگی ۔ اب کے میں اس منتر کو الٹ دوں گا ۔ اوکھ لگ جائے تو ہماری پٹی میں ایک ہزار کا گڑ ہو جائے گا ۔‘‘

شیودین ۔ بھیا کیسی بات کہتے ہو ۔ اس پٹی میں پچیس بیگھ سے کم اوکھ نہیں ہے ۔

کچھ نہ ہو۔ تو تین چار ہزار کہیں نہیں گئے۔"

بابولال "تب تو بیجائی میں پچاس روپے مل جائیں گے۔ اس سے تمہاری پٹی میں چار لالٹین جل سکتی ہیں۔" دفعتہً سامنے سے شرما جی ایک آدمی کے ساتھ آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ بابولال نے اسامیوں کو وہاں سے ہٹا دیا۔ کرسی رکھوا دی۔ اور چند قدم آگے بڑھ کر بولا۔ آپ نے کیوں تکلیف کی مجھی کو بلا لیا ہوتا۔"

شرما جی "آپ کو کس منہ سے بلواتا۔ میرے آدمی وہاں پٹ رہے تھے۔ ان کا گلا دبایا جا رہا تھا۔ اور آپ قریب نہ پھٹکے۔ مجھے آپ سے مدد کی امید تھی۔"

بابولال "میں واقعی نادم ہوں کہ اس وقت آپ کی کچھ خدمت نہ کر سکا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس وقت میرے وہاں جانے سے داروغہ جی اور مختار صاحب دونوں برا مانتے یہاں یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ آئے دن ایسے سوانگ ہوتے رہتے ہیں اور کچھ اسی گاؤں میں نہیں۔ جہاں دیکھئے یہی نقشہ نظر آتا ہے۔ میں آپ سے اس کا کچھ ذکر نہ کرتا تھا کہ شاید آپ اسے غیبت خیال کریں۔"

شرما جی "آخر یہ تو جوں توں کر کے ٹلی۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ اس طرح کام نہ چلے گا۔ اپنی اسامیوں کو آج اس مصیبت میں دیکھ کر مجھے روحانی صدمہ ہوا۔ میرا دل مجھے بار بار نفریں کرتا ہے۔ جن کی کمائی کھاتا ہوں۔ جن کی بدولت ٹمٹم پر سوار ہو کر رئیس بنا گھومتا ہوں۔ ان کے کچھ حقوق مجھ پر بھی تو ہیں۔ مجھے اپنی خود غرضی صاف نظر آ رہی ہے۔ اپنی نظروں میں خود گر گیا ہوں۔ میں ساری قوم کی نجات کا بیڑا اٹھائے ہوئے ہوں۔ سارے ہندوستان کا قاضی بننے کا مدعی ہوں۔ مگر اپنے گھر کی خبر نہیں جن کی روٹیاں کھاتا ہوں۔ ان کی طرف سے ایسا بے فکر! میں نے اس شرمناک حالت کی اصلاح کا مصمم ارادہ کر لیا ہے۔ اور اس کام میں آپ کی مدد اور ہمدردی کا سائل ہوں۔ مجھے اپنی شاگردی میں لیجئے۔ میں سچے دل سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا

ہوں ۔ اس بار کے سنبھالنے میں مجھے سہارا دیجیئے ۔ میری تعلیم نے مجھے کتاب کا کیڑا بنا کر چھوڑ دیا ۔ اور صحبت نے خیالی پلاؤ پکانا سکھایا ۔ میں انسان نہیں اصولوں کا پوتھا ہوں ۔ اب مجھے انسان بنائیے ۔ میں نے یہیں بود و باش کرنے کا پکا ارادہ کر لیا ہے مگر آپ کو بھی شہر سے تعلق ترک کرنا پڑے گا ۔ آپ کا جو کچھ نقصان ہوگا ۔ اس کا ذمہ وار میں ہوں ۔ اپنے تئیں میرا مختار کل سمجھئے ۔ اور مجھے عملی زندگی بسر کرنے کا سبق سکھائیے ۔ ممکن ہے کہ آپ کے نقش قدم پر چل کر میں اپنے فرائض ادا کرنے کے قابل ہو جاؤں ۔

خنجرِ وفا

(۱)

جے گڑھ اور نجے گڑھ دو نہایت سرسبز۔ مہذب۔ وسیع اور مستحکم سلطنتیں تھیں دونوں ہی میں علم و ہنر کی گرم بازاری تھی۔ دونوں کا مذہب ایک۔ معاشرت ایک رسم و رواج ایک۔ فلسفہ ایک۔ اصولِ ترقی ایک۔ معیارِ زندگی ایک اور زبان میں بھی برائے نام فرق تھا۔ جے گڑھی شعرا کے کلام پر نجے گڑھ والے سر دھنتے۔ اور نجے گڑھی فلسفیوں کے مسائل جے گڑھ کا ایمان تھے۔ جے گڑھی حسینوں سے نجے گڑھ کے خانوادے روشن ہوتے۔ اور نجے گڑھ کی دیویاں جے گڑھ میں پجتی تھیں۔ تاہم دونوں سلطنتوں میں ہمیشہ چشمک رہتی تھی۔ چشمک ہی نہیں بلکہ مخاصمت

کدورت۔ سوءِ ظن اور حسد۔ دونوں ہی ہمیشہ ایک دوسرے کے خلاف مجز بکف رہتی
تھیں ۔ جے گڑھ میں اگر کوئی ملکی اصلاح عمل میں آتی۔ تو بجے گڑھ میں واویلا مچ جاتا۔
کہ ہماری زندگی معرضِ خطر میں ہے۔ اعلیٰ ہذا بجے گڑھ میں کوئی تجارتی ترقی صورت پذیر
ہوتی ۔ تو جے گڑھ میں شورِ محشر برپا ہو جاتا تھا۔ جے گڑھ اگر ریلوے کی کوئی نئی شاخ
نکالتا۔ تو بجے گڑھ اسے اپنے لئے مارِ سیاہ سمجھتا اور بجے گڑھ میں کوئی نیا جہاز تیار ہوتا۔
تو جے گڑھ کو وہ نہنگ خون آشام نظر آتا تھا۔ اگر یہ بدگمانیاں جہلا یا عوام میں پیدا
ہوتیں ۔ تو ایک بات تھی۔ لطف یہ تھا کہ یہ کدورتیں علم اور بیداری ثروت اور
وقار کی سرزمین ہی میں نشوونما پاتی تھیں ۔ جہالت اور جمود کی سرزمین ان کے لئے موافق
نہ تھی۔ بالخصوص تدبر اور آئین کے زرخیز علاقے میں تو اس تخم کی بالیدگی خیال کی سبک روی
کو بھی مات کر دیتی تھی۔ ننھا سا بیج چشم زدن میں تناور درخت ہو جاتا۔ دارالعوام
میں آہ و زاری کی صدائیں گونجنے لگتیں ۔ ملکی انجمنوں میں ایک زلزلہ سا آجاتا۔
جرائد اور اخبارات کی فغانِ دل سوز قلمرو کو زیر و زبر کر دیتی۔ کہیں سے آواز آتی
"جے گڑھ پیارے جے گڑھ۔ مقدس جے گڑھ کے لئے یہ سخت آزمائش کا موقع ہے
رقیب نے جو نصابِ تعلیم تیار کیا ہے۔ وہ ہمارے لئے پیامِ مرگ ہے۔ اب ضرورت
اور اشد ضرورت ہے کہ ہم کمرِ ہمت چست باندھیں اور ثابت کر دیں کہ جے گڑھ۔ لافانی
جے گڑھ۔ ان حملوں سے جانبر ہو سکتا ہے۔ نہیں ان کا دندان شکن جواب دے سکتا
ہے۔ اگر ہم اس وقت بیدار نہ ہوئے تو جے گڑھ۔ پیارا جے گڑھ پردۂ ہستی سے محو
ہو جائے گا۔ اور روائتیں بھی اسے فراموش کر دیں گی" دوسری جانب سے صدا آتی۔
بجے گڑھ کے بے خبر سونے والو! ہمارے مہربان پڑوسیوں نے اپنے اخباروں کی
زبان بند کرنے کے لئے جو نئے قواعد نافذ کئے ہیں ۔ ان پر ناراضگی کا اظہار کرنا
ہمارا فرض ہے۔ ان کا منشا بجز اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ ہمیں وہاں کے معاملات

سے بے خبر رکھا جاتا ہے۔ اور اسی تاریکی کے پردہ میں ہمارے اوپر دھاوے کئے جاتے ہیں۔ ہمارے گلوں پر پھیرنے کے لئے نئے نئے اسلحہ تیار کئے جاتے ہیں اور بالآخر ہمارا نام و نشان مٹا دیا جاتا ہے۔ لیکن ہم اپنے دوستوں کو جتا دینا اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ اگر انہیں آلہ شر کی ایجاد میں ید طولے ہے تو ہمیں بھی دفعہ بلیات میں کمال ہے۔ اگر شیطان ان کا مددگار ہے۔ تو ہم کو بھی تائید ربانی حاصل ہے اور اگر اب تک ہمارے دوستوں کو معلوم نہیں ہے۔ تو اب ہونا چاہیئے۔ کہ تائید ایزدی ہمیشہ شیطان پر غالب آتی ہے۔

(۲)

نبجے گڑھ باکمال کلاونتوں کا اکھاڑا تھا۔ شیریں بائی اس اکھاڑے کی سبز پری تھی۔ اس کے کمال کا دور دور شہرہ تھا۔ قلمرو نغمہ کی ملکہ تھی۔ جس کے آستانے پر بڑے بڑے نامور آکر سر جھکاتے تھے۔ چاروں طرف فتح کا نقارہ بجا کر اس نے نبجے گڑھ کا رخ کیا۔ جس سے اب تک اسے خراج تحسین نہ حاصل ہوا تھا۔ اس کے آتے ہی نبجے گڑھ میں ایک انقلاب سا برپا ہو گیا۔ تعصب اور تکبر اور تفاخر بجا ہو آسے اڑنے والی سوکھی پتیوں کی طرح منتشر ہو گئے۔ بازار حسن و نشاط میں خاک اڑنے لگی۔ تھیٹروں اور رقص گاہوں میں ایک ویرانی کا عالم نظر آنے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا ساری خلقت مسحور ہو گئی ہے۔ شام ہوتے ہی نبجے گڑھ کے صغیر و کبیر، برنا و پیر شیریں بائی کی مجلس عام کی طرف دوڑتے تھے۔ سارا ملک شیریں کے نشۂ عبودیت میں مخمور ہو گیا۔

نبجے گڑھ کے باخبر حلقے میں اہل وطن کے اس جنون سے ایک اضطراب کی حالت پیدا ہوتی۔ محض یہی نہیں کہ ان کے ملک کی دولت زائل ہو رہی تھی۔ بلکہ ان کا قومی

وقار اور غرور خاک میں ملا جاتا تھا۔ بجے گڑھ کی ایک رقاصہ ایک معمولی ضنیاگر خواہ وہ کتنی ہی شیریں ادا کیوں نہ ہو۔ بجے گڑھ کی دلچسپیوں کا مرکز بن جائے۔ یہ ستم تھا۔ باہم مشورے ہوئے اور قاضیان وطن کی جانب سے وزراء ملک کی خدمت میں اس خاص امر کے متعلق ایک وفد حاضر ہوا۔ بجے گڑھ کے اراکین نشاط کی جانب سے بھی محضر نامے پیش ہونے لگے۔ اخباروں نے قومی ذلت اور نکبت کے ترانے چھیڑے دارالعوام میں سوالات کی یورش ہونے لگی۔ یہاں تک کہ وزراء مجبور ہو گئے۔ شیریں بائی کے نام شاہی فرمان پہنچا۔ "چونکہ تمہارے قیام سے ملک میں ایک شورش پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ اس لئے تم فی الفور بجے گڑھ سے رخصت ہو جاؤ"۔ مگر یہ حکم سراسر آئین بین الاقوام۔ باہمی عہد نامے اور اصولِ تمدن کے خلاف تھا۔ جے گڑھ کے سفیر نے جو بجے گڑھ میں متعین تھا۔ اس حکم سے تعریض کی اور شیریں بائی نے بالآخر اس کی تعمیل سے انکار کیا۔ کیونکہ اس سے اس کی آزادی اور خودداری اور اس کے وطن کے حقوق اور وقار پر حرف آتا تھا۔

(۳)

جے گڑھ کے کوچہ و بازار خاموش تھے۔ سیرگاہیں خالی تفریح و تماشے دربستہ قصر شاہی کے وسیع صحن اور دارالعوم کے پُرفضا سبزہ زار میں آدمیوں کا ہجوم تھا۔ مگر ان کی زبانیں بند تھیں اور آنکھیں سُرخ۔ بشرے تند اور سخت۔ تیوریاں چڑھی ہوئی ماتھے پر شکن۔ اُمڈی ہوئی کالی گھٹا تھی۔ ہیبت ناک۔ خاموش اور سیلاب کو دامن میں چھپائے ہوئے۔

مگر دارالعوام میں ایک ہنگامہ عظیم برپا تھا۔ کوئی صلح کا حامی تھا۔ کوئی جنگ کا طالب۔ کوئی مصالحت کا معین۔ کوئی تحقیقاتی کمیشن کا محرک، معاملہ نازک

تھا۔ موقع تنگ۔ تاہم باہمی ردوکد۔ تعریض وتردید۔ ذاتی حملوں اور بدگمانیوں کا بازار گرم تھا۔ آدھی رات گذر گئی۔ مگر کوئی فیصلہ نہ ہوسکا۔ سرمایہ کی متفق طاقت۔ اس کا رسوخ اور وقار اور رعب فیصلہ کی زبان بند کئے ہوئے تھا۔

تین پہر رات جاچکی تھی۔ ہوا نیند سے متوالی ہوکر انگڑائیاں لے رہی تھی۔ اور درختوں کی آنکھیں جھپکی جاتی تھیں۔ آسمان کی شمعیں بھی جھلملانے لگی تھیں۔ اراکین دربار کبھی دیواروں کی طرف تاکتے تھے۔ کبھی سقف کی طرف۔ لیکن مفر نہ سوجھتا تھا۔

دفعتاً باہر سے آواز آئی۔ جنگ! جنگ!" دارالعوام۔ اس صداء بلند سے گونج اٹھا۔ دیواروں نے زبان خاموش سے جواب دیا۔" جنگ! جنگ!"

یہ نعرۂ غیب تھا۔ جس نے جامد میں حرکت پیدا کردی۔ اب ساکن میں تموج پیدا ہوگیا۔ اراکین گویا خواب غفلت سے چونک پڑے۔ جیسے کوئی بھولی ہوئی بات یاد آتے ہی اچھل پڑے۔ وزیر جنگ سید عسکری نے فرمایا۔ کیا اب بھی آپ لوگوں کو اعلانِ جنگ میں تامل ہے؟ زبان خلق حکم خدا ہے اور اس کی صدا ابھی آپ کے کانوں میں آئی۔ اس کی تعمیل ہمارا فرض ہے۔ ہم نے آج اس طولانی نشست میں یہ ثابت کیا ہے کہ ہم زبان کے دھنی ہیں۔ پر زبان تلوار ہے۔ سپر نہیں۔ ہمیں اس وقت سپر کی ضرورت ہے۔ آئیے ہم اپنے سینوں کو سپر بنالیں اور ثابت کردیں کہ ہم میں ابھی وہ جوہر باقی ہے۔ جس نے ہمارے بزرگوں کا نام روشن کیا۔ غیرت قومی زندگی کی روح ہے۔ وہ نفع ونقصان سے بالاتر ہے۔ وہ منڈی اور روکڑ۔ وصول اور باقی تیزی ومندی کی پابندیوں سے آزاد ہے۔ ساری کانوں کی چھپی ہوئی دولت ساری دنیا کی منڈیاں ساری دنیا کی صنعتیں اس کے پاسنگ ہیں۔ اسے بچائیے۔ ورنہ آپ کا یہ سارا نظام منتشر ہوجائے گا۔ شیرازہ بکھر جائے گا۔ آپ فنا ہو جائیں گے۔

ہمارا اہلِ زر سے سوال ہے۔ کیا اب بھی آپ کو اعلانِ جنگ سے تامل ہے"؟

باہر سے صدہا آوازیں آئیں۔ "جنگ! جنگ!"

ایک سیٹھ صاحب نے فرمایا: "آپ جنگ کے لئے تیار ہیں؟"

عسکری: "ہمیشہ سے زیادہ!"

خواجہ صاحب: "آپ کو فتح کا یقین ہے"؟

عسکری: "کامل یقین ہے"!

دور و قریب جنگ! جنگ! کی گرجتی ہوئی پیہم صدائیں آنے لگیں۔ گویا ہمالہ کے کسی اتھاہ غار سے ہتھوڑوں کی جھنکار آ رہی ہو۔ دارالعوام کانپ اٹھا۔ زمین تھرانے لگی۔ راؤں کی تقسیم شروع ہوئی۔ اراکین نے بالاتفاق جنگ کا فیصلہ کیا۔ تحریر جو کچھ نہ کر سکتی تھی۔ وہ نعرۂ خلق نے کر دکھایا۔

(۴)

آج سے تیس سال پہلے ایک زبردست انقلاب نے جے گڑھ کو ہلا ڈالا تھا۔ برسوں تک خانہ جنگیوں کا دور دورہ رہا۔ ہزاروں خاندان مٹ گئے۔ سیکڑوں قصبے ویران ہو گئے۔ باپ بیٹے کے خون کا پیاسا تھا۔ بھائی بھائی کی جان کا گاہک۔ جب بالآخر حریت کی فتح ہوئی۔ تو اس نے فدائیانِ تاج کو چن چن کر مارا۔ ملک کے زندان خانے سیاسی فدائیوں سے پُر ہو گئے۔ انہیں جانبازوں میں ایک مرزا منصور بھی تھا۔ اسے قنوج کے قلعہ میں قید کیا گیا۔ جس کے تین طرف اونچی دیواریں تھیں۔ اور ایک طرف گنگا ندی۔ منصور کو سارے دن ہتھوڑے چلانا پڑتے۔ صرف شام کو آدھ گھنٹہ کے لئے نماز کی رخصت ملتی تھی۔ اس وقت منصور گنگا کے کنارے آ بیٹھتا اور ابنائے وطن کی حالت پر روتا۔ وہ سارا ملکی اور معاشرتی نظام جو اس کے خیال

میں قومی نشو و نما کا جزو اعظم تھا۔ اس شورش کے سیلاب میں غارت ہو رہا تھا۔ وہ ایک آہ سرد بھر کر کہتا۔ جے گڑھ! اب تیرا خدا ہی حافظ ہے۔ تو نے خاک کو اکسیر بنایا۔ اور اکسیر کو خاک۔ تو نے نسب و جوہر کو۔ آداب و اخلاق کو۔ علم و کمال کو مٹا دیا۔ پامال کر دیا۔ اب ہم تیرے نشاں دار ہیں۔ چرواہے تیرے پاسبان اور بنئے تیرے ارکین دربار مگر دیکھ لینا یہ ہوا ہے اور چرواہے اور ساہوکار ایک دن تجھے خون کے آنسو رلائیں گے ثروت اپنی رفتار نہ چھوڑے گی۔ حکومت اپنا رنگ نہ بدلے گی۔ اشخاص چاہے بدل جائیں۔ لیکن نظام وہی رہے گا۔ یہ تیرے بنئے چارہ گر جو اس وقت مجسم انکسار اور حق و انصاف کے پتلے بنے ہوئے ہیں۔ ایک دن نشۂ ثروت میں متوالے ہوں گے۔ ان کی سختیاں تاج کی سختیوں سے کہیں زیادہ سخت ہوں گی اور ان کے مظالم اس سے کہیں زیادہ شدید!

انہیں خیالوں میں ڈوبے ہوئے منصور کو اپنے وطن کی یاد آجاتی۔ گھر کا نقشہ آنکھوں میں کھنچ جاتا۔ معصوم بچے عسکری کی پیاری پیاری صورت آنکھوں میں پھر جاتی۔ جسے تقدیر نے ماں کے ناز و پیار سے محروم کر دیا تھا۔ تب منصور ایک آہ سرد کھینچ کر اٹھ کھڑا ہوتا اور وحشت اشتیاق میں اس کا جی چاہتا کہ گنگا میں کود کر پار نکل جاؤں۔

رفتہ رفتہ اس خواہش نے ارادہ کی صورت اختیار کی۔ گنگا اُمڈی ہوئی تھی۔ اور چھور کا کہیں پتہ نہ تھا۔ تند اور گرجتی ہوئی لہریں دوڑتے ہوئے پہاڑوں کے مشابہ تھیں۔ پاٹ دیکھ کر سر میں چکر سا آ جاتا تھا۔ منصور نے سوچا ندی اترنے دوں۔ لیکن ندی اترنے کی جگہ ہولناک مرض کی طرح بڑھتی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ منصور کو یارائے صبر نہ رہا۔ ایک دن وہ رات کو اٹھا۔ اور اس پُر شور متموج تاریکی میں کود پڑا۔ منصور ساری رات لہروں کے ساتھ زیر و زبر ہوتا رہا۔ جیسے کوئی ننھا سا

طائر طوفان میں تھپیڑے کھا رہا ہو۔ کبھی ان کی گود میں چھپا ہوا کبھی ایک ریلے میں دس قدم آگے۔ کبھی ایک دھکے میں دس قدم پیچھے۔ زندگی نقش بر آب کی زندہ مثال! جب وہ ندی کے پار ہوا تو لاشہ بے جان تھا۔ صرف سانس باقی تھی اور سانس کے ساتھ شوق دیدار۔

اس کے تیسرے دن منصور نگے گڑھ جا پہنچا۔ ایک گود میں عسکری تھا۔ اور دوسرے ہاتھ میں اپنی بے نوائی کا بقچہ۔ وہاں اس نے اپنا نام مرزا اجلال بتایا وضع و قطع بھی تبدیل کر لی تھی۔ تناور سجیلا جوان تھا۔ چہرہ پر شرافت اور نجابت کا نور جھلکتا تھا۔ ملازمت کے لئے کسی مزید سفارش کی ضرورت نہ تھی۔ سپاہیوں میں داخل ہو گیا۔ اور پانچ ہی سال میں اپنے حسن خدمات اور اعتماد کی بدولت مندور کے سرحدی کوہستانی قلعہ کا قلعہ بنا دیا گیا۔

لیکن مرزا اجلال کو وطن کی یاد ہمیشہ ستایا کرتی۔ وہ عسکری کو گود میں لے لیتا اور فصیلوں پر چڑھ کر اسے بجے گڑھ کے وہ مسکراتے ہوئے سبزہ زار اور متوالے چشمے اور حلیم بستیاں دکھاتا۔ جن کے سواد قلعہ سے نظر آتے تھے۔ اس وقت بے اختیار اس کے جگر سے ایک آہ سرد نکل جاتی۔ اور آنکھیں ڈبڈبا آتیں۔ وہ عسکری کو گلے لیتا اور کہتا۔ "بیٹا وہ تمہارا دیس ہے۔ وہی تمہارا اور تمہارے بزرگوں کا آشیانہ ہے تم سے ہو سکے۔ تو اس کے ایک گوشے میں بیٹھے ہوئے اپنی عمر ختم کر دینا۔ مگر کبھی اس کی آن میں بٹہ نہ لگانا۔ کبھی اس سے دغا مت کرنا۔ کیونکہ تم اسی کے آب و گل سے پیدا ہوئے ہو۔ اور تمہارے بزرگوں کی پاک روحیں اب بھی وہاں منڈلا رہی ہیں"۔

اس طرح بچپنے ہی سے عسکری کے دل پر وطن کی خدمت اور محبت کا نقش ہو گیا تھا وہ جوان ہوا۔ تو بجے گڑھ پر جان دیتا تھا۔ اس کے وقار کا دلدادہ۔ اس کی ہیبت و شان کا حلقہ کش۔ اس کی سرسبزی کا قائل۔ اس کے پھریرے کو نئی اچھوتی سرزمینوں

میں نصب کرنے کا فدائی۔ بیس سال کا جوان رعنا تھا۔ ارادہ مضبوط۔ حوصلے بلند۔ ہمت وسیع۔ تواءِ آہنی۔ آکر جے گڑھ کی فوج میں داخل ہو گیا۔ اور اس وقت جے گڑھی سپاہ کا مہر درخشاں بنا ہوا تھا۔

(۵)

جے گڑھ نے الٹی میٹم دے دیا۔ اگر ۲۴ گھنٹوں کے اندر شیریں بائی جے گڑھ نہ پہنچی۔ تو اس کے استقبال کے لئے جے گڑھ کی فوج روانہ ہو گی۔ نجے گڑھ نے جواب دیا۔ جے گڑھ کی فوج آئے۔ ہم اس کی پیشوائی کے لئے حاضر ہیں۔ شیریں بائی جب تک یہاں کی عدالت سے حکم عدولی کی سزا نہ پائے۔ وہ رہا نہیں ہو سکتی۔ اور جے گڑھ کو ہمارے اندرونی معاملات میں دخل دینے کا کوئی مجاز نہیں"۔

عسکری نے منہ مانگی مراد پائی۔ خفیہ طور پر ایک قاصد مرزا اجلال کی خدمت میں روانہ کیا۔ اور خط میں لکھا۔

"آج نجے گڑھ سے ہماری جنگ چھڑ گئی۔ اب خدا نے چاہا تو دنیا جے گڑھ کی تلوار کا لوہا مان جائے گی۔ عسکری ابن منصور بزم فاتحاں کا حاشیہ نشین بن سکے گا اور شاید میری وہ دلی تمنا بھی بر آئے۔ جو ہمیشہ میری روح کو تڑپایا کرتی ہے۔ شاید میں مرزا منصور کو پھر جے گڑھ کے دارالعوام میں ایک ممتاز درجے پر بیٹھے ہوئے دیکھ سکوں۔ ہم مندوں سے نہ بولیں گے اور آپ بھی ہمیں نہ چھیڑیئے گا۔ لیکن اگر خدا نخواستہ کوئی افتاد آ ہی پڑے تو آپ میری یہ مہر جس سپاہی یا افسر کو دکھا دیں گے وہ آپ کی تعظیم کرے گا۔ اور آپ کو میرے کیمپ میں پہنچا دے گا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ضرورت پڑے تو اس جے گڑھ کے لئے جو آپ کو اتنا پیارا

ہے اور اس عسکری کی خاطر جو آپ کا لختِ جگر ہے آپ تھوڑی سی تکلیف سے (ممکن ہے وہ روحانی تکلیف ہو) دریغ نہ فرمائیں گے"۔

اس کے تیسرے دن ہے گڑھ کی فوج نے بجے گڑھ پر حملہ کیا اور مندور سے پانچ میل کے فاصلے پر دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا۔ بجے گڑھ کو اپنے ہوائی جہازوں زہریلے غازوں اور دور انداز توپوں کا غرّہ تھا۔ ہے گڑھ کو اپنے سپاہ کی شجاعت اور جفاکشی۔ فہم اور ادراک کا بھروسہ۔ بجے گڑھ کی سپاہ حکم اور ضبط کی غلام تھی۔ ہے گڑھ والے ذمہ داری اور تمیز کے قائل ۔

ایک مہینہ تک شب و روز کشت و خون کے معرکے ہوتے رہے۔ ہمیشہ آگ اور فلزات اور زہریلی ہواؤں کا طوفان سا اٹھا رہتا۔ انسان تھک جاتا تھا۔ پر کلیں ان تھک تھیں ہے گڑھیوں کے حوصلے پست ہو گئے۔ متواتر زکیں کھائیں۔ عسکری کو معلوم ہوا کہ ذمہ داری فتح ہیں چاہے معجزے دکھائے پر شکست میں میدان حکم ہی کے ہاتھ رہتا ہے ۔

ہے گڑھ کے اخباروں نے ارباب حل و عقد پر حملے کرنے شروع کئے۔ عسکری ساری قوم کا تودۂ ملامت بن گیا۔ وہی عسکری جس پر ہے گڑھ فدا ہوتا تھا۔ سب کی نظروں میں خار ہو گیا۔ یتیموں کے آنسو۔ بیواؤں کی آہیں۔ مجروحوں کی جالکاہیاں تاجروں کی تباہی۔ قوم کی ذلت ان سب کا سبب وہی ایک فرد واحد عسکری تھا۔ قوم کی امامت تختِ زرنگار ہو تو ہو۔ پر پھولوں کی سیج ہرگز نہیں ۔

اب ہے گڑھ کی جانبری کی بجز اس کے اور کوئی صورت نہ تھی کہ کسی طرح مخالف سپاہ کا تعلق مندور کے قلعہ سے قطع کر دیا جائے۔ جو سامانِ جنگ و رسد اور وسائل نقل و حرکت کا مرکز تھا۔ مہم دشوار تھی۔ نہایت خطرناک۔ کامیابی کی اُمید موہوم۔ ناکامی کا اندیشہ غالب۔ کامیابی اگر سوکھے دھان کا پانی تھی۔ تو ناکامی اس

کی آگ ۔ مگر نجات کی اور کوئی دوسری تدبیر نہ تھی ۔ عسکری نے مرزا جلال کو لکھا:-

پیارے ابا جان! اپنے سابق کے نیاز ناموں میں میں نے جس ضرورت کا اشارہ کیا تھا۔ بدقسمتی سے وہ ضرورت آپڑی ۔ آپ کا پیارا جے گڑھ بچہ مگر آگ میں پھنسا ہوا ہے ۔ اور آپ کا پیارا عسکری ورطۂ یاس میں دونوں آپ کی طرف نگاہِ التجا سے تک رہے ہیں ۔

آج ہماری آخری کوشش ہے ۔ ہم مخالف سپاہ کو مندور کے قلعہ سے علیحدہ کرنا چاہتے ہیں ۔ نصف شب کے بعد یہ معرکہ شروع ہوگا ۔ آپ سے صرف اتنی درخواست ہے کہ اگر ہم سربکف ہوکر قلعہ کے مقابل تک پہنچ سکیں تو ہمیں آہنی دروازہ سے سر ٹکرا کر واپس نہ ہونا پڑے ورنہ آپ اپنی قوم کی عزت اور اپنے بیٹے کی لاش کو اسی مقام پر تڑپتے دیکھیں گے ۔ اور جے گڑھ آپ کو کبھی معاف نہ کرے گا ۔ اس سے آپ کو کتنی ہی ایذا پہنچی ہو ۔ مگر آپ اس کے حقوق سے سبکدوش نہیں ہو سکتے"

شام ہو چکی تھی ۔ میدانِ جنگ ایسا نظر آتا تھا ۔ گویا جنگل آگ سے جل گیا ہو ۔ جے گڑھی سپاہ ایک خونریز معرکہ کے بعد خندقوں میں آرہی تھی ۔ مجروحین قلعہ مندور کے شفاخانے میں پہنچائے جارہے تھے ۔ توپیں تھک کر چپ ہوگئی تھیں ۔ اور بندوقیں ذرا دم لے رہی تھیں ۔ اسی وقت جے گڑھی سپاہ کا ایک افسر جے گڑھی وردی پہنے ہوئے عسکری کے خیمہ سے نکلا ۔ شکستہ توپیں ۔ سرنگوں طیارے ۔ گھوڑوں کی لاشیں ۔ اوندھی پڑی ہوئی ہوا گاڑیاں اور متحرک مگر اعضا شکستہ قلعے اس کے لئے پردے کا کام کرنے لگے ۔ ان کی آڑ میں چھپتا ہوا وہ جے گڑھی مجروحوں کی صف میں جا پہنچا اور چپ چاپ زمین پر لیٹ گیا ۔

(۶)

نصف شب گزر چکی تھی۔ مندور کا قلعہ دار مرزا جلال قلعہ کی فصیل پر بیٹھا ہُوا میدانِ جنگ کا تماشا دیکھ رہا تھا۔ اور سوچتا تھا۔ کہ عسکری کو مجھے ایسا خط لکھنے کی جرأت کیونکر ہوئی۔ اسے سمجھنا چاہیئے تھا۔ کہ جس شخص نے اصول و عقائد پر اپنی زندگی نثار کر دی۔ جلا وطن ہُوا اور غلامی کا طوق گردن میں ڈالا۔ وہ اب اپنی حیات کے دور آخر میں جادۂ مستقیم سے منحرف نہ ہوگا۔ اپنے اصولوں کو نہ توڑے گا۔ خدا کے دربار میں وطن اور فرزند اور اہل وطن ایک بھی ساتھ نہ دینگے۔ اپنے اعمال کی سزا و جزا آپ ہی بھگتنی پڑے گی۔ روزِ حساب سے کوئی نہ بچا سکے گا۔

توبہ! جے گڑھیوں سے پھر وہی حماقت ہوئی۔ خواہ مخواہ گولہ باری سے دشمن کو خبردار کر دینے کی کیا ضرورت تھی۔ اب ادھر سے بھی جواب دیا جائیگا۔ اور ہزاروں جانیں ضائع ہوں گی۔ شبخون کے معنی تو یہ ہیں کہ غنیم سر پر آجائے۔ اور کانوں کان خبر نہ ہو۔ چوطرفہ کھلبلی پڑ جائے۔ مانا کہ موجودہ حالات میں اپنی حرکات کو پوشیدہ رکھنا دشوار ہے۔ اس کا علاج غار تاریک سے کرنا چاہیئے۔ مگر آج شاید ان کی گولہ باری معمول سے زیادہ شدید ہے۔ جے گڑھ کی صفوں کو اور متعدد استحکامات کو چیر کر بہ ظاہر اُن کا یہاں تک آنا محال معلوم ہوتا ہے۔ لیکن بفرضِ محال آ ہی جائیں۔ تو مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ اس مسئلہ کو طے کیوں نہ کر لوں خوب! اس میں طے کرنے کی بات ہی کیا ہے۔ میرا راستہ صاف ہے۔ میں جے گڑھ کا نمک خوار ہوں۔ میں جب خانماں برباد۔ خستہ حال۔ آوارہ وطن تھا تو جے گڑھ نے مجھے اپنے دامن میں پناہ دی اور میری خدمات کا مناسب اعتراف کیا۔ اس کی بدولت تیس سال تک میری زندگی نیک نامی اور عزت سے گزری۔ اس سے دغا

کرنا حد درجہ کی نمک فراموشی ہے۔ ایسا گناہ جس کی کوئی سزا نہیں۔ وہ اوپر شور ہو رہا ہے۔ ہوائی جہاز ہوں گے۔ وہ گولہ گرا۔ مگر خیریت ہوئی نیچے کوئی نہیں تھا۔

مگر کیا دغا ہر ایک حالت میں گناہ ہے؟ ایسی حالتیں بھی تو ہیں جب دغا وفا سے بھی زیادہ مستحسن ہو جاتا ہے۔ اپنے دشمن سے دغا کرنا کیا گناہ ہے؟ اپنی قوم کے دشمن سے دغا کرنا کیا گناہ ہے؟ کتنے ہی فعل جو ذاتی حیثیت سے ناقابل عفو ہیں۔ قومی حیثیت سے عین ثواب ہو جاتے ہیں۔ وہی خون بے گناہ جو ذاتی حیثیت میں سخت ترین سزا کا مستوجب ہے۔ مذہبی حیثیت سے شہادت کا درجہ پاتا ہے اور قومی حیثیت سے فدائیت کا۔ کتنی بے رحمیاں اور سفاکیاں۔ کتنی دغائیں اور روباہ بازیاں قومی اور مذہبی نقطۂ نگاہ سے محض روا نہیں۔ فرائض میں داخل ہو جاتی ہیں۔ حال کے یورپی معرکہ عظیم میں اس کی کتنی ہی مثالیں مل سکتی ہیں۔ دنیا کی تاریخ ایسی دغا کاریوں سے پُر ہے۔ اس نئے دور میں ذاتی احساس نیک و بد قومی مصلحت کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ قومیت نے ذات کو مٹا دیا ہے ممکن ہے۔ یہی منشاء ایزدی ہو۔ اور خدا کے دربار میں بھی ہمارے افعال قومی معیار ہی پر پرکھے جائیں۔ یہ مسئلہ اتنا آسان نہیں ہے۔ جتنا میں سمجھا تھا۔

پھر عالم بالا میں شور ہوا۔ مگر شاید یہ ادھر ہی کے طیارے ہیں۔ آج جے گڑھ والے بڑے دم خم سے لڑ رہے ہیں۔ ادھر والے دبتے نظر آتے ہیں۔ آج یقیناً میدان انہیں کے ہاتھ رہے گا۔ جان پر کھیلے ہوتے ہیں۔ جے گڑھی دلاوروں کے جوہر مایوسی ہی میں خوب کھلتے ہیں۔ ان کی شکست فتح سے بھی شان دار ہوتی ہے۔ بلاشک عسکری نقل و حرکت کا اُستاد ہے۔ کس خوبصورتی سے اپنی فوج کا رُخ باب قلعہ کی طرف پھیر دیا۔ مگر سخت غلطی کر رہے ہیں۔ اپنے ہاتھوں اپنی قبر کھود رہے ہیں۔ سامنے کا میدان دشمن کے لئے خالی کئے دیتے ہیں۔ وہ چاہے تو بلا روک ٹوک آگے بڑھ سکتا ہے۔

اور صبح تک جے گڑھ کی سرزمین میں داخل ہو سکتا ہے۔ جے گڑھیوں کے لئے واپسی یا تو غیر ممکن ہے یا نہایت خطرناک۔ قلعہ کا دروازہ نہایت مستحکم ہے۔ فصیلوں کے شگافوں سے ان پر بے شمار بندوقوں کے نشانے پڑیں گے۔ ان کا اس آگ میں ایک گھنٹہ بھی ٹھہرنا ممکن نہیں ہے۔ کیا اتنے ہم وطنوں کی جانیں محض ایک اصول پر۔ محض روز حساب کے خوف پر۔ محض اپنے اخلاقی احسان پر قربان کر دوں؟ اور محض جانیں ہی کیوں؟ اس سپاہ کی تباہی جے گڑھ کی تباہی ہے۔ کل جے گڑھ کی پاک سرزمین غنیم کے نقارہ فتح کی صداؤں سے گونج اٹھے گی۔ میری مائیں اور بہنیں اور بیٹیاں اس کی حیا سوز بدعتوں کا شکار ہوں گی۔ سارے ملک میں قتل اور غارتگری کے ہنگامے برپا ہوں گے۔ پرانی عداوت اور کدورت کے شعلے بھڑکیں گے۔ کنج مرقد میں سوئی ہوئی روحیں دشمن کے قدموں سے پامال ہوں گی۔ وہ تعمیرات جو ہماری گزشتہ عظمت کی زندہ روائتیں ہیں۔ وہ یادگاریں جو ہمارے بزرگوں کے تبرکات ہیں۔ جو ہمارے کارناموں کا دفتر ہمارے کمالات کا خزانہ اور ہمارے اکتسابات کی روشن شہادتیں ہیں۔ جن کی آرائش اور ترتیب اور جامعیت کو دنیا کی قومیں رشک کی نگاہوں سے دیکھتی ہیں۔ وہ نیم وحشی۔ کندۂ ناتراش لشکریوں کی فرودگاہ بنیں گی۔ اور ان کے جوش انہدام کا شکار کیا اپنی قوم کو اس ستم شعاریوں کا تختۂ مشق بننے دوں۔ محض اس لئے کہ میرا پیمان وفا نہ ٹوٹے؟

اُف! یہ قلعے میں زہریلے گیس کہاں سے آگئے۔ کسی جے گڑھی طیارے کی حرکت ہوگی۔ سر میں چکر سا آرہا ہے۔ یہاں سے کمک بھیجی جارہی ہے۔ فصیل کے روزنوں میں بھی توپیں چڑھائی جارہی ہیں۔ جے گڑھ والے قلعہ کے سامنے آگئے۔ ایک دھاوے میں وہ باب ہمایوں تک آپہنچیں گے۔ بجے گڑھ والے اس سیلاب کو اب نہیں روک سکتے۔ جے گڑھ والوں کے سامنے کون ٹھیر سکتا ہے؟

یا اللہ کسی طرح دروازہ خود بخود کھل جاتا ۔ کوئی جے گڑھی ہواباز مجھ سے بزور کنجی چھین لیتا ۔ مجھے ہلاک کر ڈالتا ۔ آہ میرے اتنے عزیز ہم وطن پیارے بھائی ایک آن میں تو وہ خاک ہو جائیں گے ۔ اور میں بے بس ہوں ۔ ہاتھوں میں زنجیر ہے ۔ پیروں میں بیڑیاں ۔ ایک ایک رویاں رسیوں سے جکڑا ہوا ہے ۔ کیوں نہ اس زنجیر کو توڑ دوں ان بیڑیوں کے ریزے ریزے کر دوں ۔ اور دروازے کے دونوں بازو اپنے عزیز فاتحوں کے خیر مقدم کیلئے کھول دوں ۔ بالفرض یہ گناہ سہی ۔ پر یہ موقع گناہ سے ڈرنے کا نہیں ۔ جہنم کے مار آتشیں اور خون آشام بہائم اور لپکتے ہوئے شعلے میری روح کو جلائیں ۔ تڑپائیں ۔ کوئی مضائقہ نہیں ۔ اگر محض میری روح کی تباہی میری قوم اور وطن کو قعر ہلاکت سے بچا سکے ۔ تو وہ مبارک ہے ۔ نیجے گڑھ نے زیادتی کی ہے ۔ اس نے محض جے گڑھ کو ذلیل کرنے کے لئے ۔ محض اس کے اشتعال کیلئے شریں بائی کے شہر بدر ہونے کا حکم جاری کیا ۔ جو سراسر نا روا تھا ۔ ہائے افسوس میں نے اسی وقت استعفا کیوں نہ دے دیا ۔ اور اس قفس اطاعت سے نہ نکل گیا ۔

ہائے غضب ! جے گڑھی سیاہ خندقوں تک پہنچ گئی ۔ خدایا ! ان جانبازوں پر رحم کر ۔ ان کی مدد کر ۔ کل دار توپوں سے کیسے گولے برس رہے ہیں ۔ گویا آسمان کے بے شمار تارے ٹوٹے پڑتے ہیں ۔ الامان باب ہمایوں پر گولوں کی کیسی ضربیں پڑ رہی ہیں ۔ کان کے پردے پھٹے جاتے ہیں ۔ کاش دروازہ ٹوٹ جاتا ۔ ہائے میرا اسکری ۔ میرا لخت جگر ۔ وہ گھوڑے پر سوار آ رہا ہے ۔ کیسا شجاع ۔ کیسا جانباز کیسا قوی ہمت ! آہ مجھ روسیاہ کو موت کیوں نہیں آجاتی ۔ میرے سر پر کوئی گولہ کیوں نہیں آ گرتا ۔ جس پودے کو اپنے خون جگر سے پالا ۔ جو میری خزاں نصیب زندگی کا سدا بہار پھول تھا ۔ ہائے جو میری شب تار کا چراغ میری زندگی کی امید میرے

وجود کی کائنات ۔میری آرزو کی انتہا تھا ۔ وہ میری آنکھوں کے سامنے آگ کے بھنور میں پڑا ہوا ہے ۔ اور میں حرکت نہیں کر سکتا ۔ اس قاتل زنجیر کو کیونکر توڑ دوں ؟ اس دل سرکش کو کیونکر سمجھاؤں ؟ مجھے روسیاہ بننا منظور ہے ۔ مجھے دوزخ کی عقوبتیں سہنی منظور ہیں ۔ میں ساری دُنیا کے گناہوں کا بار سر پر لینے کو تیار ہوں ۔صرف اس وقت مجھے گناہ کرنے کی پیمانِ وفا توڑنے کی ۔ نمک حرام بننے کی توفیق عطا کر ۔ ایک لمحہ کے لئے مجھے شیطان کے حوالے کر دے ۔ میں نمک حرام بنوں گا ۔ دغاباز بنوں گا پر قوم فروش نہیں بن سکتا ۔

آہ ظالم ! سرنگیں اڑانے کی تیاری کر رہے ہیں ۔ سپہ سالار نے حکم دے دیا وہ تین آدمی تہ خانے کی طرف چلے ۔ جگر کانپ رہا ہے ۔ جسم میں رعشہ آ رہا ہے ۔ یہ آخری موقع ہے ۔ ایک لمحہ اور بس ! پھر تاریکی ہے ۔ اور تباہی ۔ ہائے ان مخرف اعضا میں اب بھی حرکت نہیں ہوتی ۔ یہ خون اب بھی گرم نہیں ہوتا ۔ آہ ! وہ دھماکے کی آواز آئی ۔ خدا کی پناہ زمین میں لرزہ آ گیا ۔ ہائے عسکری عسکری رخصت ۔میرے پیارے بیٹے رخصت ! اس ظالم بے رحم باپ نے تجھے اپنی وفا پر قربان کر دیا ۔ میں تیرا باپ نہ تھا ۔ تیرا دشمن تھا ۔ میں نے تیرے گلے پر چھری چلائی ۔ اب دھواں صاف ہو گیا ۔ آہ ! وہ فوج کہاں ہے جو سیلاب کی طرح بڑھتی آتی تھی ۔ اور ان دیواروں سے ٹکرا رہی تھی ۔ خندقیں لاشوں سے بھری ہوئی ہیں اور وہ جس کا میں دشمن تھا ۔ جس کا قاتل ۔ وہ بیٹا ۔ وہ میرا دلارا عسکری کہاں ہے ؟ کہیں نظر نہیں آتا .... آہ ! آہ !!"

خوابِ پریشاں

(۱)

چاندنی رات ہوا کے خوشگوار جھونکے ۔ پُر فضا باغ ۔ کنور امرناتھ اپنی مہتابی پر لیٹے ہوئے منورما سے کہہ رہے تھے ۔ "تم گھبراؤ نہیں ۔ میں جلد آؤں گا۔"

منورما نے ان کی طرف سائلانہ انداز سے دیکھ کر کہا ۔ "مجھے بھی ساتھ کیوں نہیں لے چلتے؟"

امرناتھ ۔ "تمہیں وہاں تکلیف ہوگی ۔ میں کبھی یہاں رہونگا ۔ کبھی وہاں ۔ سارے دن مارا مارا پھروں گا ۔ کوہستانی علاقہ ہے ۔ صحرا و بیابان کے سوا آبادی کا کہیں کوسوں پتہ نہیں ۔ اس پر درندوں کا خوف آسائش کی چیزیں نایاب ہونگی تم ان تکلیفوں کی عادی نہیں ہو۔"

منورما ۔ لیکن تم بھی ان تکلیفوں کے عادی نہ ہو۔

امرناتھ ۔ میں مرد ہوں ۔ موقع اور ضرورت پر ہر ایک تکلیف کا سامنا کر سکتا ہوں ۔

منورما ۔ (غرور سے) میں بھی عورت ہوں ۔ موقع اور ضرورت پر آگ میں کود سکتی ہوں ۔ عورتوں کی نزاکت مردوں کا تخیل ہے ۔ انہیں نازک کہہ کر زبردستی نازک بنایا جاتا ہے ۔ ان کا جسم کمزور ہو ۔ پر دل ۔ ارادہ اور ہمت کا وہ باندھ ہے ۔ جس پر زمانہ کے حادثات کا مطلق اثر نہیں ہوتا ۔

امرناتھ نے منورما کو ارادت کی نگاہ سے دیکھا ۔ اور بولے "یہ میں مانتا ہوں ۔ لیکن جو تخیل مدت دراز سے ہمارا ایمان ہو رہا ہے وہ یک لخت محو نہیں ہو سکتا ۔ تمہاری تکلیف مجھ سے نہ دیکھی جائے گی ۔ مجھے صدمہ ہوگا اور تکلیفوں کو چاہے دیکھ بھی سکوں ۔ لیکن تمہارے توکل کا نظارہ ان سے کہیں دردناک ہوگا ۔ دیکھو! اس وقت کی چاندنی میں کتنی بہار ہے ۔ مجھے ایسا خیال ہوتا ہے کہ چاندنی میں ایک کثافت اور غلاظت ہوتی ہے ۔ جس پر ملمع کا گمان ہوتا ہے ۔ اس کے برعکس آفتاب کی روشنی رقیق اور لطیف ہوتی ہے ۔

منورما ۔ مجھے بہلاوا مت دو ۔ میں تمہارے ساتھ چلوں گی ۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ تم سے الگ رہ کر مجھے کم تکلیف ہوگی ؟ مجھے تو کوئی ایسی تکلیف نہیں معلوم ہوتی ۔ جو جدائی سے زیادہ سخت ہو ۔ کیا روحانی اضطراب جسمانی تکلیف سے کم جانکاہ ہوتا ہے ؟

امرناتھ ۔ تم اپنی تکلیف کا نہیں ۔ میری تکلیف کا خیال کرو ۔ وہاں مجھے تمہاری آسائش کی فکر ہر دم پریشان رکھے گی ۔ تمہارے لئے مکان کی فکر ۔ سواریوں کی فکر ۔ دل بستگی کے سامان کی فکر، غرض کہاں تک کہوں ۔ جس کام کے

لئے جاتا ہوں۔ وہ بالکل نہ ہو سکے گا۔

منورما مایوسانہ انداز سے بولی "خیر جیسی تمہاری مرضی۔ میں ضد نہیں کرتی۔ مگر یہاں میری زندگی اجاڑ ہو جائے گی۔ معلوم نہیں کیا گذرے گی۔ مجھے تو اُس کے خیال ہی سے وحشت ہوتی ہے۔ میرا دل کچھ عجیب بدسگال واقع ہوا ہے۔ تمہیں اپنے سامنے نہ دیکھ کر مجھے طرح طرح کے اوہام ستانے لگتے ہیں۔ شاید دل کے کسی نامعلوم گوشہ میں خیال چھپا ہوا ہے۔ کہ میں تمہاری عافیت کی ضامن ہوں۔ چاہے جو کچھ ہو۔ میں ہمیشہ انہیں وسوسوں میں پڑی رہتی ہوں۔ تم ہاکی کھیلنے جاتے ہو تو مجھے یہ اندیشہ رہتا ہے کہ تمہیں چوٹ نہ لگ گئی ہو۔ شکار کھیلنے جاتے ہو تو ڈرتی ہوں کہ کہیں گھوڑے نے شرارت نہ کی ہو۔ یہاں تک کہ اس چاندنی رات اور کھلے ہوئے صحن میں بھی مجھے اطمینان نہیں ہوتا۔ ایک موہوم سا انتشار دل پر غالب رہتا ہے۔ کیا کروں۔ میری طبیعت ہی ایسی ہے۔

امرناتھ یہ باتیں سن کر کانپ اٹھے۔ سوچا یہ دل نازک ایسی جانکاہ۔ ایسی جگر سوز محبت کا بوجھ کیونکر اٹھا سکے گا؟ کہیں یہ نازک تارِ مضراب کی ان چوٹوں سے ٹوٹ نہ جائے۔ کتنا غم نصیب دل ہے! چاروں طرف درد اور سوز اور خلش سے گھرا ہوا۔ کہیں نسیم کا گزر نہیں۔ کہیں فضا کا تبسم نہیں۔ ایک قیدی ہے۔ گوشۂ تاریک میں زنجیروں سے جکڑا ہوا۔ متین انداز سے بولے "لیکن منورما میں ہرگز اس محبت کے قابل نہیں ہوں۔ مجھ جیسے ظاہر پرست آدمی کے لئے یہ جذبۂ صادق؟ تم اپنے اوپر ظلم کرتی ہو۔ مجھے خوف ہوتا ہے کہ تم نے میری نسبت اپنے دل میں غلط قیاس قائم کر لیا ہے۔ میں بالکل معمولی جذبات کا آدمی ہوں۔ اتنا ہی خود غرض۔ اتنا ہی حریص اور زمانہ ساز۔ اتنا ہی سفلہ اور تن پرور۔ میرے لئے جسمانی آسائش محبت سے کہیں زیادہ اطمینان کا باعث ہے۔ صحبت احباب۔

سیر و شکار۔ تفریح و تفنن کے بغیر میرا ایک دن بھی زندہ رہنا مشکل ہے۔ درد اور سوز سے میں بالکل بیگانہ ہوں۔ محبت میرے لئے حالات زندگی کا ایک جزو ہے اور وہ بھی جزو ضعیف!

منورما نے امرناتھ کو بدگمان نظروں سے دیکھا۔ جو کہہ رہی تھیں۔ میں تم کو تم سے زیادہ پہچانتی ہوں۔

(۲)

کنور امرناتھ مجموعہ اضداد تھے۔ وہ آزاد تھے پر محتاط۔ صاحب ثروت تھے پر بیدار مغز۔ رئیس تھے پر منکسر ذی اثر تھے۔ پر غریب دوست۔ والدین بچپن ہی میں رحلت کر چکے تھے۔ ان کی پرورش و پرداخت کا بار ملازموں پر پڑا۔ محبت کی نعمت سے محروم رہ گئے۔ وہ جس وقت کوئی چیز مانگتے فوراً مل جاتی۔ انہیں رونے اور مچلنے کے موقعے نہ ملتے تھے۔ وہ اپنے ہمجولیوں کو مچلتے دیکھ کر مچلنا چاہتے تھے کبھی کبھی مار کھانے کے لئے گھڑکے جانے کے لئے ان کا دل بے اختیار ہو جاتا تھا۔ ان کے ذہن میں پیار اور مار لازم و ملزوم تھے۔ اس پیار کے لئے وہ مار اور پھٹکار سب کچھ چاہتے تھے۔ وہ دیکھتے تھے کہ لڑکے مار کھا کر بھی ماں کے پیچھے دوڑتے ہیں اور جب ماں کام سے فارغ ہو کر انہیں گود میں اٹھا لیتی ہے تو وہ کیسے نہال ہو جاتے ہیں۔ کیسے مگن ہو کر آنچل میں منہ چھپانا چاہتے تھے۔ مگر نہ وہ گود تھی۔ نہ وہ آنچل۔ وہ اگر روتے نہ تھے تو ہنسنے کا بھی انہیں موقع نہ ملتا تھا ان کا بچپن خشک بے مزہ اور یادہائے شیریں سے خالی تھا۔

جب وہ سن شعور کو پہنچے۔ تو چاروں طرف سے شادی کے تقاضے ہونے لگے۔ راجوں اور رئیسوں کے یہاں سے پیغام آنے لگے۔ جہیز میں علاقے اور بیش

فزار رقمیں بیتل کی جانے لگیں ۔ مگر کنور صاحب کا دل محبت کا بھوکا تھا ۔ انہیں اسی میوہ جنت کی تلاش تھی ۔ برسوں سرگرم طلب رہے ۔ حسن ملا ۔ ناز و ادا ملی ۔ حسن مذاق اور حسن انتظام سے بھی دو چار ہوئے ۔ مگر محبت کہیں نہ مل سکی۔

تب محلوں سے مایوس ہو کر وہ جھونپڑوں کی طرف جھکے ۔ اور یہاں ان کی مراد پوری ہوئی ۔ منورما ایک غریب ٹھاکر کی لڑکی تھی ۔ اس کا باپ کنور صاحب کے دربار کا چپراسی تھا ۔ وہ بچپن ہی سے کنور صاحب کے ساتھ کھیلا کرتی تھی ۔ مگر شاید غیب کو بھی نہ معلوم تھا کہ وہ ایک دن رانی بنے گی ۔ کنور صاحب کی نظر انتخاب اسی پر پڑی ۔ خویش و اقارب نے اختلاف کیا ۔ مگر امر ناتھ اپنی دھن کے پورے تھے ۔ منورما کو رانی بنا کر گھر میں لائے ۔

(۳)

بندیل کھنڈ میں سخت قحط تھا ۔ لوگ درختوں کی چھال نکال نکال کر کھاتے تھے ۔ جڑیں کھود کھود کر پیٹ بھرتے تھے ۔ فاقہ کشی نے دلوں سے دھرم اور مذہب کا احساس فنا کر دیا تھا ۔ حلال اور حرام کی تمیز غائب ہو گئی تھی ۔ جانوروں کا تو ذکر ہی کیا ۔ انسان کے بچے کوڑیوں کے مول بکتے تھے ۔ ماں کی ممتا مٹھی بھر دانوں پر قربان ہو جاتی تھی ۔ حتیٰ کہ بچہ خوری کی دل ہلا دینے والی روایتیں بھی کبھی کبھی سننے میں آ جاتی تھیں ۔ کنور امر ناتھ نے اخباروں میں یہ خبریں دیکھیں تو ان کا درد قوم تڑپ اٹھا ۔ وہ بنارس سیوا سمتی کے سکریٹری تھے ۔ فوراً چند نوجوان والنٹیروں کا ایک دستہ تیار کیا ۔ اور بندیل کھنڈ میں جا پہنچے ۔ چلتے وقت منورما بہت روئی لیکن اسے ساتھ لانا وقت طلب تھا ۔ ہاں یہ وعدہ کیا کہ روزانہ خط لکھیں گے اور جلد واپس آئیں گے !

ایک ہفتہ تک تو امرناتھ نے وعدہ پورا کیا۔ لیکن روز افزوں مصروفیتوں کے ساتھ خطوط میں تاخیر ہونے لگی۔ اکثر محلاتے ڈاک خانوں سے منزل پر پہنچتے وہاں سے روزانہ خط بھیجنے کا انتظام کرنا مشکل تھا۔

منورما صبح سے شام تک انتظار کرتی۔ اس کی تسکین کا یہی ایک سہارا تھا۔ لیکن جب خطوط میں دیر ہونے لگی۔ تو اس کا اضطراب ضبط کے قابو سے باہر ہو گیا۔ وہ بار بار پچھتاتی کہ میں ناحق ان کے کہنے میں آگئی۔ مجھے ان کے ساتھ جانا چاہیے تھا۔ وحشت کے عالم میں کبھی نیچے آتی۔ کبھی اوپر جاتی۔ کبھی باغیچہ میں جا بیٹھتی۔ ہر ایک چیز اُسے غم کے رنگ میں رنگی ہوئی نظر آتی تھی۔ مینا کی بولیوں میں اب وہ شیرینی نہ تھی۔ نہ ستار کے سروں میں وہ دل آویزی۔ ہرن کی کلیلیں اب شتر غمزوں سے بھی زیادہ مکروہ معلوم ہوتیں۔ چوہے اور خرگوش۔ کتے اور بلیاں سب کاٹنے دوڑتے تھے۔ الماریوں میں اچھی اچھی کتابیں چنی ہوئی تھیں۔ امرناتھ کو کتابوں کا ذوق تھا۔ لیکن منورما کبھی ان کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھتی۔ جب تک خط نہ آ جاتا۔ وہ اسی طرح مضطرب اور مضمحل رہتی۔ خط ملتے ہی سوکھے دھانوں میں پانی پڑ جاتا۔ چہرہ شگفتہ ہو جاتا۔ اُسے چومتی۔ چھاتی سے لگاتی اور بار بار پڑھتی۔

مگر دوسرے دن سے پھر وہی پریشانی اور انتظار۔ وہ امرناتھ کی تصویر کو گھنٹوں دیکھا کرتی۔ صرف اسی کام میں اس کا جی لگتا تھا۔ مگر رفتہ رفتہ اس کا دل دردِ ہجر کا عادی ہونے لگا۔ پہلے امرناتھ کے کمرے میں آتے ہوئے اس کے پیر من من بھر کے ہو جاتے تھے۔ وہ ان کی خالی کرسی کی طرف آنکھ نہ اٹھا سکتی تھی۔ مگر اب اس کا بے قرار دل وجود سے مایوس ہو کر خیال کی طرف مڑا۔ جن نظاروں سے کوفت ہوتی تھی۔ اب ان سے دل بستگی ہونے لگی۔ ان کی کتابوں کو قرینہ سے سجاتی۔ ان کی تصویروں پر سے گرد جھاڑتی۔ ان کے اسلحوں کو صاف کرتی۔

اس طرح ایک مہینہ گذر گیا۔ ایک روز اس نے رات کو خواب دیکھا۔ کہ امرناتھ دروازے پر برہنہ سر۔ برہنہ پا کھڑے رو رہے ہیں۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی اور اسی سراسیمگی کے عالم میں بالاخانے کے دروازے تک آئی۔ یہاں کا سناٹا دیکھ کر اسے ہوش آگیا۔ اس نے اسی وقت امرناتھ کے نام ارجنٹ تار بھیجا۔ مگر کوئی جواب نہ آیا۔ سارا دن گزر گیا۔ مگر کوئی جواب نہیں۔ دوسری رات بھی گذری پر جواب کا پتہ نہ تھا۔ منورما بے آب ودانہ خستہ حال۔ نیم جان اپنے کمرہ میں فرش پر پڑی رہتی۔ جسے دیکھتی اس سے پوچھتی۔ جواب آیا؟ پتا بھی کھڑکتا۔ تو فوراً دروازہ پر جا کھڑی ہوتی۔ اور پوچھتی۔ جواب آیا؟

اس کے دل میں طرح طرح کے اندیشے پیدا ہوتے۔ کنیزوں سے خواب کی تعبیر پوچھتی۔ خواب کے وجود اور اسباب پر کئی کتابیں پڑھ ڈالیں۔ مگر عقدہ نہ کھلا۔ لونڈیاں اسے دلاسہ دینے کے لئے کہتیں۔ وہ بہت خیریت سے ہیں۔ خواب کا رونا اصلی ہنسا ہے۔ خواب کی برہنہ پائی گھوڑے کی سواری ہے۔ کوئی گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ لیکن منورما کو ان باتوں سے تسکین نہ ہوتی۔ اُسے تار کے جواب کی رٹ لگی ہوئی تھی۔ یہاں تک کہ چار دن گذر گئے۔

(۴)

کسی محلہ میں مداری کا آنا بچوں کے لئے ایک بڑا واقعہ ہے۔ اس کے ڈمرو کی آواز میں طوانچہ کی صدائے مرغوب سے بھی زیادہ کشش ہوتی ہے۔ اسی طرح محلہ میں کسی جوتشی کا آنا مستورات کے لئے معرکہ کی بات ہے۔ دم زدن میں اس کی خبر گھر گھر پھیل جاتی ہے۔ ساسیں اپنی ناخیر المراد بہوؤں کو لئے آجاتی ہیں مائیں اپنی حسرت نصیب بیٹیوں کو لئے جمع ہو جاتی ہیں۔ جوتشی جی شادی و غم کی

خاطر خواہ تقسیم کرنے لگتے ہیں۔ ان کی غیب گوئیوں میں کنایہ و مجاز کا عنصر غالب ہوتا ہے۔ ان کی تقدیر خوانی تقدیر سے بھی زیادہ مبہم اور ان کے الفاظ مبالغہ سے بھی زیادہ وسیع المفہوم۔ ممکن ہے موجودہ تعلیم نے جوتش کی قدر کم کر دی ہو۔ لیکن جوتشی کی قدر میں ذرا بھی کمی نہیں ہوئی۔ ممکن ہے۔ اس کی باتوں پر کسی کو یقین نہ ہو۔ مگر سننا سب چاہتے ہیں۔ اس کے ایک ایک لفظ میں امید و بیم کو برانگیختہ کرنے کی ساحرانہ قوت پوشیدہ ہوتی ہے۔ بالخصوص اس کی خبر بد تو تسکین افزا ہے اور سوہان روح اور پیکان جگر۔

تار بھیجے ہوئے آج پانچواں دن تھا کہ امرناتھ کے دروازہ پر ایک جوتشی جی وارد ہوئے۔ ان کے وسیع برآمدہ میں فوراً محلہ کی عورتوں کا مجمع ہو گیا۔ جوتشی جی غیب کے نوشتے" کھولنے لگے۔ منورما کو بھی خبر ملی۔ اسے ایسا معلوم ہوا گویا کوئی فرشتۂ غیب آ گیا۔ انہیں فوراً اندر بلا بھیجا۔ اور اپنے خواب کی تعبیر پوچھی۔

جوتشی جی نے ادھر ادھر دیکھا۔ پترے کے ورق الٹے۔ انگلیوں پر کچھ گنا۔ پر کچھ فیصلہ نہ کر سکے۔ کہ کس قسم کے جواب کی ضرورت ہے۔ بولے۔ کیا سرکار نے یہ خواب دیکھا ہے؟

منورما بولی "نہیں۔ میری ایک سکھی نے دیکھا ہے۔ میں کہتی ہوں منحوس خواب ہے۔ وہ کہتی ہیں۔ اس کا پھل بہت اچھا ہے۔ آپ اس کی کیا تعبیر کرتے ہیں؟"

جوتشی جی پھر بغلیں جھانکنے لگے۔ انہیں امرناتھ کے پردیس جانے کا حال نہ معلوم تھا اور نہ اتنی مہلت ہی ملتی تھی کہ یہاں آنے کے قبل وہ معلومات فراہم کر لیتے جو قیافہ اور قیاس کے ساتھ مل کر عرف عام میں جوتش کے نام سے مشہور

ہیں۔ اپنے سوال کے جواب سے جو امید تھی۔ وہ بھی جاتی رہی۔ مایوس ہو کر منورما کی تائید ہی میں خیریت سمجھی۔ بولے سرکار جو کچھ کہتی ہیں وہی ٹھیک ہے۔ سپنا اچھا نہیں ہے۔"

منورما کو رعشہ آ گیا۔ تھر تھر کانپنے لگی۔

جوتشی جی نے اسی سلسلہ میں کہا: "ان کے پتی پر کوئی بڑی مصیبت آنے والی ہے۔ ان کا گھر اجڑ جائے گا۔ وہ دیس بدیس مارے مارے پھریں گے۔ کوئی ایسا سنکٹ پڑے گا۔ جس سے وہ بہت دکھی ہوں گے۔"

منورما نے زور سے چیخ کر کہا۔ "بھگوان! میری رکھشا کرو!" اور زمین پر گر پڑی۔

جوتشی جی اب چیتے۔ سمجھ گئے کہ سخت دھوکا ہوا۔ دلاسا دینے لگے۔ مگر کوئی چنتا کی بات نہیں۔ اس کا میں اتار کر سکتا ہوں۔ سرکار مجھے تھوڑا سا تیل۔ کچا دھاگا۔ اور ایک نئی ہانڈی منگوا دیں۔ ایک بکرا بھی چاہیے۔ میں ابھی اس کا نوارن (دفع بلا) کر سکتا ہوں۔ جب وہاں سے خیر و عافیت کا سماچار مل جائے تو سرکار جو دکشنا چاہیں دے دیں۔ کام کٹھن ہے۔ پر بھگوان کی دیا سے میں کر سکتا ہوں۔ سرکار دیکھیں۔ مجھے بڑے بڑے حاکموں نے کیسے کیسے سارٹیفکٹ دیے ہیں۔ ابھی ڈپٹی صاحب کی لڑکی بیمار تھی۔ ڈاکٹروں نے جواب دے دیا تھا۔ میں نے جنتر دیا۔ بیٹھے بیٹھے آنکھیں کھل گئیں۔ کل کی بات ہے۔ سیٹھ چندو مل کے یہاں روکڑ کی ایک تھیلی اڑ گئی تھی۔ کچھ پتہ نہ چلتا تھا۔ میں نے جا کر شگون دیکھا۔ اور بات کی بات میں چور پکڑ لیا۔ ان کے منیم کا کام تھا۔ ان کے پاس تھیلی جوں کی توں نکل آئی۔۔۔۔۔"

جوتشی جی اپنے کمالات کا اظہار کر رہے تھے۔ مگر منورما بے سدھ پڑی

ہوئی تھی۔ زہر رگوں میں سرایت کر گیا تھا۔ منتروں سے اب کیا اثر ہو سکتا ہ
دفعتہً وہ اٹھی۔ اور لونڈی کو بلا کر حکم دیا۔ سفر کا سامان کرو۔ میں شام کی گاڑی سے مہوبے جاؤں گی۔ جو تشی جی کو منیم جی سے کچھ دلوا دو ؛

(۵)

منورما نے سٹیشن پر آ کر امرناتھ کو تار دیا "میں آ رہی ہوں"۔ اُن کے آخری خط سے معلوم ہوا تھا کہ وہ کبرئی میں ہیں۔ کبرئی کا ٹکٹ لیا۔ گاڑی میں بیٹھی۔ لیکن کئی دنوں کی متواتر شب بیداری تھی۔ گاڑی پر بیٹھتے کے تھوڑی ہی دیر بعد اسے نیند آ گئی۔ اور نیند آتے ہی پریشان خیالات کا نیرنگ پیش نظر ہو گیا۔ متوحش نظارے دکھائی دینے لگے۔

اس نے دیکھا کہ ایک بڑا وسیع دریا ہے۔ اس میں ایک شکستہ کشتی ہلکورے کھاتی بہتی چلی جاتی ہے۔ اس پر نہ کوئی آدمی ہے نہ ملاح۔ نہ پال۔ نہ ڈانڈے۔ موجیں اسے کبھی اُچھالتی ہیں۔ کبھی زیر کرتی ہیں۔ دفعتہً کشتی پر ایک آدمی نظر آیا۔ یہ امرناتھ تھے۔ برہنہ سر۔ برہنہ پا۔ آنکھوں سے آنسو جاری۔ منورما خوف سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا۔ کشتی اب ڈوبی اور اب ڈوبی۔ اس نے زور سے چیخ ماری۔ آنکھیں کھل گئیں۔ سارا جسم پسینہ سے تر تھا سینہ دھک دھک کر رہا تھا۔ وہ اُٹھ بیٹھی۔ منہ ہاتھ دھویا اور قصد کیا۔ اب نہ سوؤں گی۔ مگر آہ! کیسا ڈراؤنا خواب تھا۔ پرماتما اب تمہارا ہی بھروسہ ہے ان پر کوئی حادثہ نہ آنے پائے۔

اس نے سر باہر نکال کر دیکھا۔ آسمان پر تارے دوڑ رہے تھے۔ گھڑی دیکھی۔ بارہ بجے تھے۔ اس کو تعجب ہوا۔ کہ میں اتنی دیر تک سوئی۔ ابھی تو ایک

جھپکی بھی پوری نہ ہونے پائی۔ اس نے ایک کتاب اٹھائی اور خیالات کو سمیٹ کر پڑھنے لگی۔ اتنے میں الٰہ آباد آ گیا۔ گاڑی تبدیل ہوئی۔ دوسری گاڑی میں جا بیٹھی۔ جو پلیٹ فارم پر تیار کھڑی تھی۔ اگرچہ رات کا وقت تھا۔ پر اسے یہ دیکھ کر بہت اطمینان ہوا کہ کمرہ بالکل خالی تھا۔ اس نے پھر کتاب کھولی اور اسے باآواز بلند پڑھنے لگی۔ گاڑی روانہ ہو گئی۔ لیکن کئی دنوں کی جاگی آنکھیں ارادہ کی مطیع نہیں ہوئیں۔ بیٹھے بیٹھے اس پر پھر غنودگی کا غلبہ ہوا۔ اس نے تکیہ پر سر رکھ لیا۔ آنکھیں بند ہو گئیں۔ ایک دوسرا منظر سامنے آ گیا۔ اس نے دیکھا کہ ایک بڑا اونچا پہاڑ ہے۔ اس کی چوٹیاں آسمان سے جا ملی ہیں۔ اوپر والے درخت بالکل چھوٹے چھوٹے پودوں کی طرح نظر آتے ہیں۔ سیاہ گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں اور بجلی اتنی زور سے گرج رہی ہے۔ کہ کان کے پردے پھٹے جاتے ہیں۔ کبھی یہاں گرتی ہے۔ کبھی وہاں۔ اس ہولناک پہاڑ کی چوٹی پر ایک آدمی برہنہ سر بیٹھا ہوا ہے۔ حالانکہ وہ بہت بلندی پر ہے۔ مگر اس کی آنکھوں سے آنسو گرتے ہوئے صاف نظر آ رہے ہیں۔ منورما دہل اٹھی۔ یہ امرناتھ تھے۔ وہ پہاڑی سے اترنا چاہتے تھے۔ لیکن کہیں راستہ نظر نہ آتا تھا۔ ان کا چہرہ خوف سے زرد تھا۔ یکایک ایک بار بجلی زور سے کوندی۔ ایک شعلہ زور سے نکلا۔ اور امرناتھ کا پتہ نہ تھا۔ منورما نے پھر زور سے چیخ ماری۔ اور جاگ پڑی۔ اس کا سینہ بانسوں اچھل رہا تھا۔ اور سر چرخی کی طرح چکر کھاتا تھا۔ جاگتے ہی اس کی آنکھوں سے آنسو کی دھار بہ نکلی۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور دونوں ہاتھ باندھ کر آسمان کی طرف تاکتے ہوئے بولی۔ یا ایشور مجھے ایسے ایسے بڑے بڑے سپنے دکھائی دے رہے ہیں۔ نہ جانے ان پر کیا گزر رہی ہے۔ تم غریبوں پر رحم کرتے ہو۔ میں بھی ابھاگنی غریب ہوں۔ مجھ پر رحم کرو۔ مجھے

محل اور دولت کی ضرورت نہیں۔ میں جھونپڑی میں خوش رہوں گی۔ میں صرف ان کی سلامتی چاہتی ہوں۔ میری اتنی بنتی سن لو!

پھر وہ اپنی جگہ پر بیٹھ گئی۔ طلوع سحر کی سرخی نظر آ رہی تھی۔ اسے گونہ تسکین ہوئی کہ کسی طرح رات کٹ گئی۔ اب تو نیند نہ آئے گی۔ تھوڑی دیر میں گاڑی مانک پور پہنچی۔ یہاں گاڑی پھر بدلی۔ اب کہسار کے دل کش مناظر دکھائی دینے لگے۔ کہیں پہاڑیوں پر بھیڑوں کے گلے۔ کہیں دامن کوہ میں ہرنوں کے جھنڈ۔ کہیں کنول کے پھولوں سے رنگین تال۔ منورما ایک محو فراموشی کے عالم میں ان منظروں کی طرف تاکتی رہی۔ گویا اسے گلکاری فطرت کا مطلق حس نہیں ہے مگر پھر نہ معلوم کب اس کی آنکھیں جھپک گئیں۔ اس نے دیکھا کہ امرناتھ گھوڑے پر سوار ایک پل پر سے چلے جاتے ہیں۔ نیچے دریا امڈا ہوا ہے۔ پل بہت تنگ ہے۔ گھوڑا رہ رہ کر شرارت کرتا ہے۔ منورما کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ وہ زور سے چلا چلا کر کہنے لگی۔ گھوڑے سے اتر پڑو۔ گھوڑے سے اتر پڑو۔ یہ کہتے کہتے وہ ان کی طرف لپکی۔ آنکھیں کھل گئیں۔ گاڑی کسی اسٹیشن کے پلیٹ فارم سے سن سن کرتی چلی جاتی تھی۔ امرناتھ برہنہ سر۔ برہنہ پا۔ پلیٹ فارم پر کھڑے تھے۔ منورما کی آنکھوں میں ابھی تک اسی ہولناک خواب کا نظارہ سمایا ہوا تھا۔ کنور صاحب کو دیکھ کر اسے گمان ہوا۔ کہ وہ گھوڑے سے گر پڑے۔ اور نیچے دریا میں گرا چاہتے ہیں۔ اس نے فوراً انہیں پکڑنے کو ہاتھ پھیلایا اور جب وہ انہیں نہ پا سکی۔ تو اسی نیم بیداری کے عالم میں اس نے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ اور کنور صاحب کی طرف ہاتھ پھیلاتے ہوئے گاڑی سے کود پڑی۔ تب وہ چونکی معلوم ہوا کسی نے آسمان سے اٹھا کر زمین پر پٹک دیا۔ جسم کی ایک ایک رگ میں سنسناہٹ محسوس ہوتی۔ پھر زور سے ایک دھکا لگا اور بے سدھ ہو گئی۔

یہی کبرتی اسٹیشن تھا۔ کنور امرناتھ تار پاکر اسٹیشن پر آئے تھے۔ مگر یہ میل تھا۔ یہاں نہ ٹھہرتا تھا۔ منورما کو گاڑی پر سے ہاتھ پھیلائے گرتے دیکھ کر وہ ہاں ہاں کرتے بجلی کی طرح لپکے۔ مگر نوشتۂ تقدیر پورا ہو چکا تھا۔ منورما اس دیس میں پہنچ چکی تھی۔ جہاں محبت کا آنند ہے۔ مگر فراق کا غم نہیں!

امرناتھ منورما کی لاش پر بیٹھے روتے رہے۔ چند روزہ بہار زندگی ختم ہو گئی۔ دل کی بستی پھر ویران ہو گئی۔ مسرت کا خواب پریشان ہو گیا۔

تیسرے دن وہ برہنہ سر۔ برہنہ پا۔ چشم نم مکان پر پہنچے۔ منورما کا خواب سچا ہوا۔ اس ویرانے میں اب کون رہتا؟ اشک ریزی کی آرزو انہیں یہاں تک لائی تھی۔ وہ ایک ہفتہ تک مکان پر رہے اور خوب روئے۔ منورما کی روح کو خوش کرنے کا اس کے سوا اور کوئی ذریعہ نہ تھا۔ اس کے بعد وہ یکہ و تنہا بے ساز و سامان گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ کل جائداد کاشی سیوا سمتی کے نام وقف کر دی اور اب دیس بدیس گھومتے رہتے ہیں۔ برہنہ سر۔ برہنہ پا۔ چشم نم۔ جوتشی جی کی تعبیر بھی سچی نکلی۔

راہِ خدمت

(۱)

تارا نے بارہ سال تک دُرگا تپسیا کی۔ نہ پلنگ پر سوئی۔ نہ سر میں تیل ڈالا۔ نہ آنکھوں میں سرمہ لگایا۔ زمین پر سوتی تھی۔ گیروے کپڑے پہنتی تھی اور روکھی روٹیاں کھاتی تھی۔ اس کا چہرہ مرجھائی ہوئی کلی تھی۔ آنکھیں بجھا ہوا چراغ اور دل ایک بیہڑ میدان سبزہ اور نزہت سے خالی۔ اُسے صرف ایک آرزو تھی کہ دُرگا کے درشن پاؤں۔ جسم شمع کی طرح گھلتا تھا۔ لیکن یہ آرزو دل سے نہ نکلتی تھی۔ یہی اس کی روح تھی۔ یہی اس کا مدارِ حیات۔ گھر کے لوگ سمجھتے۔ اسے جنون ہے۔ ماں سمجھاتی "بیٹی تجھے کیا ہو گیا ہے؟ کیا تو ساری زندگی یوں ہی رو رو کر کاٹے گی؟ اس زمانے کے دیوتا پتھر کے ہوتے ہیں۔ پتھر کو بھی کسی نے پگھلتے دیکھا ہے؟

دیکھ تیری سہیلیاں پھول کی طرح کھل رہی ہیں۔ ندی کی طرح بڑھ رہی ہیں۔ کیا تجھے مجھ پر بھی رحم نہیں آتا"؟ تارا کہتی "ہاں! اب تو جو لگن لگی وہ لگی۔ یا تو دیوی کے درشن پاؤں گی۔ یا یہی آرزو لئے دنیا سے رخصت ہو جاؤں گی۔ تم سمجھ لو۔ میں مر گئی"۔

اس طرح پورے بارہ سال گزر گئے۔ اور تب دیوی خوش ہوئیں۔ رات کا وقت تھا۔ چاروں طرف خموشی چھائی ہوئی تھی۔ مندر میں ایک دھندلا سا گھی کا چراغ جل رہا تھا۔ تارا درگا کے پیروں پر سر رکھے التجا صادق میں غرق تھی۔ کہ یکایک اسے دیوی کے تن جامد میں ایک جنبش محسوس ہوئی۔ تارا کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ دھندلا چراغ گنبد نور ہو گیا۔ مندر میں ایک روح افزا خوشبو پھیل گئی۔ ہوا میں ایک جان بخش تازگی محسوس ہوئی۔ دیوی کا سفید چہرہ ماہ کامل کی طرح چمکنے لگا۔ بے نور آنکھیں جگمگا اٹھیں۔ ہونٹ کھل گئے۔ آواز آئی "تارا! میں تجھ سے خوش ہوں۔ مانگ کیا مانگتی ہے"؟

تارا کھڑی ہو گئی۔ اس کا جسم اس طرح کانپ رہا تھا۔ جیسے صبح کے وقت کسی مؤذن کی صدا دور سے کانپتی ہوئی آتی ہے۔ اسے معلوم ہو رہا تھا۔ میں ہوا میں اڑی جا رہی ہوں۔ اسے اپنے دل میں ایک پرواز۔ ایک تموج نور کا احساس ہو رہا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ باندھ کر کہا۔ "دیوی! تم نے میری بارہ سال کی تپسیا پوری کی۔ کس منہ سے تمہارا جس گاؤں؟ مجھے دنیا کی وہ برکات عطا ہوں۔ جو ہماری خواہشات کی انتہا اور ہماری تمناؤں کی معراج ہیں۔ میں وہ دولت چاہتی ہوں۔ جو ہوس کو بھی سیر کر دے"۔

دیوی نے مسکرا کر کہا۔ "منظور ہے"۔

تارا۔ "وہ ثروت جو قضا کو بھی شرمندہ کر دے"۔

دیوی نے مسکرا کر کہا "منظور ہے"
تارا۔ "وہ حسن جس کا کہیں ثانی نہ ہو۔"
دیوی نے مسکرا کر کہا "منظور ہے"۔

(۴)

تارا کنور نے باقی رات آنکھوں میں کاٹی۔ صبح کے وقت ایک لمحہ کے لئے اس کی آنکھیں جھپک گئیں۔ جاگی تو دیکھا کہ میں سر سے پاؤں تک ہیرے و جواہرات سے لدی ہوئی ہوں۔ اس کا مکان ایک عالی شان سر بفلک مینار تھا۔ بالکل سنگ مرمر کا بنا ہوا۔ بیش قیمت سنگ ریزوں سے جڑا ہوا۔ دروازہ پر نوبت بج رہی تھی۔ اس کی سمع نواز صدائیں ہوا میں گونج رہی تھیں۔ دروازہ پر میلوں تک سبزہ زار تھا۔ سرو اور مولسری کی قطاریں چمن و خیاباں اور روش کی گلکاریاں بہت ہی خوشنما معلوم ہوتی تھیں۔ کنیزیں سونے میں لدی ہوئیں۔ زرق برق کپڑے پہنے چاروں طرف دوڑتی پھرتی تھیں۔ تارا کو دیکھتے ہی وہ سونے کے لوٹے اور کٹورے لے کر دوڑیں۔ تارا نے دیکھا کہ میرا پلنگ ہاتھی دانت کا ہے۔ زمین پر نہایت نرم غالیچے بچھے ہوئے ہیں۔ اس کے سرہانے کی طرف ایک قد آدم شیشہ تھا۔ تارا نے اس میں اپنی صورت دیکھی تو دنگ رہ گئی۔ اس کا حسن چاند کو بھی شرماتا تھا۔ دیواروں پر صدہا تصویریں آویزاں تھیں۔ جادو طراز مصوروں کی بنائی ہوئی۔ لیکن حسن کی دلآویزی میں ایک بھی تارا کو نہ پہنچتی تھی۔ تارا کو غرورِ حسن کا احساس ہوا۔ وہ کئی کنیزوں کے ساتھ باغیچہ میں گئی۔ وہاں کا سماں دیکھ کر اس کی روح پر سرور چھا گیا۔ ہوا میں عنبر اور زعفران گھلی ہوئی تھی۔ انواع و اقسام کے پھول ہوا کے مدھم جھونکوں سے متوالوں کی طرح جھوم رہے تھے۔ تارا نے ایک گلاب کا پھول توڑ لیا۔ اور

اس کے رنگ ونزاکت کا اپنے ہونٹوں سے مقابلہ کرنے لگی۔ گلاب میں وہ دلآویزی نہ تھی۔ عین وسط باغ میں ایک بلوریں حوض تھا۔ اس میں ہار ل ہنس اور بط خوش فعلیاں کر رہے تھے۔ یکایک تارا کو خیال آیا۔ میرے گھر کے اور لوگ کہاں ہیں۔ کنیزوں سے دریافت کیا۔ انہوں نے کہا "حضور! وہ لوگ پرانے مکان میں ہیں"۔ تارا نے اپنے بالاخانے پر جاکر دیکھا ماں سے اپنا پہلا مکان ایک بوسیدہ جھونپڑی کی طرح نظر آیا۔ اس کی بہنیں اس کی ادنےٰ کنیزوں سے بھی میل نہ کھاتی تھیں۔ ماں کو دیکھا۔ وہ آنگن میں بیٹھی چرخہ کات رہی تھی۔ تارا پہلے سوچا کرتی تھی۔ کہ جب میرے دن پھیں گے تو ان لوگوں کو بھی اپنے ساتھ رکھوں گی۔ اور انکی خوب خدمت کروں گی۔ پر اس وقت غرور ثروت نے اس کے لطیف جذبات کو مُردہ کر دیا تھا۔ اس نے گھر والوں کو ایک حقارت آمیز رحم کی نگاہ سے دیکھا۔ اور تب ان نغموں کا لطف اٹھانے میں محو ہو گئی۔ جس کی روح افزا صدائیں اس کے کان میں آ رہی تھیں۔

دفعتہً زور سے ایک کڑاکا ہوا۔ بجلی کوندی اور برقی لہروں میں سے ایک شعلہ رو نوجوان نکل کر تارا کے سامنے دست بستہ کھڑا ہو گیا۔ تارا نے پوچھا تم کون ہو؟ نوجوان نے کہا "حضور مجھے برق خاں کہتے ہیں۔ میں حضور کا فرمانبردار خادم ہوں"۔

اس کے رخصت ہوتے ہی ہوا کے محرور جھونکے چلنے لگے۔ ایک شعلہ آسمان نظر آیا۔ اور دم کے دم میں وہ اتر کر تارا کنور کے قریب ٹھہر گیا۔ اس میں سے ایک آتشیں صورت کے مسّن اور تناور آدمی نے نکل کر تارا کے قدموں کا بوسہ لیا۔ تارا نے پوچھا۔ تم کون ہو؟ مسّن آدمی نے جواب دیا "حضور میرا نام اگن سنگھ ہے۔ میں حضور کا فرمانبردار غلام ہوں"۔

مسن ابھی جانے بھی نہ پایا تھا۔ کہ دفعتہً سارا محل روشنی سے بقعۂ نور بن گیا۔ معلوم ہوتا تھا۔ سیکڑوں بجلیاں مل کر چمک رہی ہیں۔ صنوفگن ہوائیں چلنے لگیں۔ ایک جگمگاتا ہوا تخت آسمان پر نظر آیا۔ وہ تیزی سے زمین کی طرف چلا۔ اور تارا کنور کے پاس آکر ٹھہر گیا۔ اس میں سے ایک نورانی صورت کا کم سن لڑکا جس کے چہرہ سے متانت برس رہی تھی۔ نکل کر تارا کے سامنے مؤدبانہ انداز سے کھڑا ہو گیا۔ تارا نے پوچھا۔ تم کون ہو؟ لڑکے نے جواب دیا۔ "حضور! مجھے مسٹریڈیم کہتے ہیں۔ حضور کا پروردہ ہوں"۔

(۳)

ارباب ثروت تارا کے خوف سے تھرانے لگے۔ اس کے عالم فریب حسن نے ایک ہنگامہ برپا کر دیا۔ بڑے بڑے تاجدار اس کے آستانے پر سجدے کرنے لگے۔ جس کی طرف اس کی آنکھیں اٹھ جاتی تھیں۔ وہ ہمیشہ کے لئے اُس کا بندۂ بے دام بن جاتا تھا۔ اسے پھر تقدیر بھی اس آستانہ سے جدا نہ کر سکتی تھی۔ عداوت و رقابت کینہ و حسد۔ قتل و خون کا بازار گرم ہوا۔ بدگمانیوں نے زور پکڑا۔ مگر تارا ان عشاق کو خیال میں بھی نہ لاتی تھی۔ وہ محض تفریح کے لئے۔ محض تماشے کے لئے۔ ان جانبازوں کو کھلاتی رہتی تھی۔

ایک روز تارا اپنے پُر فضا باغیچہ میں سیر کر رہی تھی۔ کہ ناگاہ اس کے کان میں کسی کے گانے کی آواز آئی۔ تارا بے تاب ہو گئی۔ اس کے دربار میں دُنیا کے اچھے اچھے گوّیے موجود تھے۔ لیکن وہ بے خودی۔ وہ جذبہ۔ وہ تاثیر جو ان سُروں میں تھی اسے کبھی محسوس نہ ہوتی تھی۔ اس نے گوّیے کو بُلا بھیجا۔

ایک لمحہ کے بعد باغیچہ میں ایک سادھو داخل ہوا۔ اُس کے سر پر جٹائیں تھیں

جسم خاک آلودہ ۔ ابھی مسیں بھیگ رہی تھیں ۔ اس کے ہاتھ میں ایک ٹوٹی ہوئی بین تھی ۔ اسی سے وہ صداء درد نکلتی تھی ۔ جو ٹوٹے ہوئے دل کی صداؤں سے کہیں دردناک تھی ۔ سادھو آکر حوض کے کنارے بیٹھ گیا ۔ اس نے تارا کے سامنے سر تعظیم نہیں جھکایا ۔ حیرت سے اِدھر اُدھر نگاہیں نہیں ڈالیں ۔ اسی عالم محویت میں اپنا سُر الاپنے لگا ۔ تارا پر بے خودی کا ایک سرور طاری ہوگیا ۔ دل میں ایک درد کا احساس ہوا ۔ بے تابانہ جوش کے ساتھ ٹہلنے لگی ۔ سادھو کے نغمہ سے چڑیاں مگن ہوگئیں ۔ پانی میں لہریں اٹھنے لگیں ۔ شجر جھومنے لگے ۔ تارا نے ان دلکش سُروں سے ایک تصویر بنتی ہوئی دیکھی ۔ رفتہ رفتہ تصویر واضح ہونے لگی ۔ اس میں حرکت پیدا ہوئی ۔ تب وہ کھڑی ہوکر ناچنے لگی ۔ اس کا انداز کتنا مستانہ ادائیں کتنی دلربا تھیں ۔ دفعتہً تارا چونک پڑی ۔ اس نے دیکھا کہ یہ میری ہی تصویر ہے ۔ نہیں ۔ میں ہی ہوں ۔ میں ہی بین کی تانوں پر ناچ رہی ہوں ۔ اُسے حیرت ہوئی کہ میں برکات دُنیا کی ملکہ ہوں یا ایک وجود خیال ۔ ایک نغمہ مصور ۔ وہ سر دُھننے لگی ۔ اور ایک عالم دیوانگی میں دوڑکر سادھو کے پیروں سے چمٹ گئی ۔ اس کے آلات بصر میں ایک عجیب تغیر پیدا ہوا ۔ سامنے کے پھلے پھولے درخت اور لہریں مارتا ہوا حوض اور خوش نما روشیں سب غائب ہوگئیں ۔ ایک وسیع فضا تھی اور صرف وہی سادھو بیٹھا ہوا بین بجا رہا تھا اور وہ خود یا اس کا نقش ثانی اس کے تانوں پر تھرک رہا تھا ۔ وہ اب خاک آلود فقیر نہ تھا ۔ نہیں وہ مردانہ جلال کا درخشاں ستارہ اور عارفانہ حسن کا شگفتہ پھول بن گیا تھا ۔ جب نغمہ بند ہوا تو تارا ہوش میں آئی ۔ اس کا دل ہاتھ سے جا چکا تھا ۔ وہ اس باکمال درویش کے ہاتھوں بک چکی تھی ۔

تارا بولی " سوامی جی ۔ یہ محل اور ثروت ۔ شان اور شکوہ سب آپ کے

قدموں پر نثار ہیں۔ اس خانۂ تاریک کو اپنے قدموں سے روشن کیجئے۔"
ساوھو۔ فقیروں کو محل اور دھن دولت سے کیا کام؟ میں اس گھر میں قدم نہیں رکھ سکتا۔
تارا۔ دُنیا کی ساری نعمتیں آپ کے لئے حاضر ہیں۔
ساوھو۔ مجھے نعمتوں کی ضرورت نہیں۔
تارا۔ میں تا دمِ آخر آپ کی کنیز بنی رہوں گی۔
یہ کہہ کر تارا نے آرسی میں اپنے حسنِ تاباں کا جلوہ دیکھا اور غرور سے اس کی آنکھوں میں نشہ آگیا۔
ساوھو۔ نہیں تارا کنور میں اس لائق نہیں ہوں۔
یہ کہہ کر ساوھو نے بین اٹھائی۔ اور دروازہ کی طرف چلا۔ تارا کا غرور پامال ہو گیا۔ ندامت سے اس کا سر جھک گیا اور وہ بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ میں جو ثروت میں۔ دولت میں حُسن میں اپنا نظیر نہیں رکھتی۔ ایک فقیر کی نگاہوں میں اتنی ناچیز ہوں۔"

(۴)

تارا کو اب کسی پہلو قرار نہ تھا۔ اُسے اپنے محل اور اسباب عیش سے وحشت ہوتی۔ ساوھو کا پُر جلال چہرہ آنکھوں میں بسا رہتا۔ اور اس کے بہشتی نغمے کانوں میں گونجا کرتے۔ اس نے اپنے مخبروں کو بلا کر ساوھو کا سراغ لگانے کا حکم دیا۔ بہت تلاش کے بعد اس کی کٹی کا پتہ ملا۔ تارا روز اپنے ہوائی جہاز پر بیٹھ کر ساوھو کے پاس جاتی۔ کبھی اس پر لعل و جواہر لٹاتی۔ کبھی اپنے ثروت کے کرشمے دکھاتی کبھی برق خاں۔ کبھی اگن سنگھ۔ کبھی مسٹر ریڈیم کے جلوہ میں ہوتے۔ وہ نت نئے روپ

بھرتی۔ اپنے زاہد فریب۔ جہاں سوز حسن کے جلوے دکھاتی۔ لیکن سادھو اس سے ذرا بھی مخاطب نہ ہوتا۔ اس کے نالۂ بے تاب اور فغان درد اس پر مطلق اثر نہ کرتے ۔

تب تارا کنور پھر درگا کے مندر میں گئی۔ اور دیوی کے پیروں پر سر رکھ کر بولی۔ "ماتا! تم نے مجھے دنیا کی سب نعمتیں عطا کیں۔ لیکن مجھے وہ بے خلل عیش نصیب نہ ہوا۔ جس کی میں نے امید کی تھی۔ میں نے سمجھا تھا۔ ثروت میں دنیا کو رام کرنے کی طاقت ہے۔ حسن میں پتھر کو پگھلانے کی قدرت ہے۔ دولت میں تسخیر کا جادو ہے۔ پر مجھے اب معلوم ہوا کہ محبت پر دولت اور حسن کا مطلق بس نہیں ہے۔ اب ایک بار مجھ پر پھر وہی نگاہ کرم ہو۔ کچھ ایسا کیجئے کہ جس بے رحم کے پریم میں مری جاتی ہوں وہ بھی مجھ پر دیوانہ ہو جائے۔ اسے بھی مجھے دیکھے بغیر چین نہ آئے اس کی آنکھوں میں بھی نیند حرام ہو جائے۔ وہ بھی میری الفت کے نشہ سے سرشار ہو ۔

دیوی کے ہونٹ کھلے۔ مسکرائیں۔ غنچہ کو شعاع زریں نے بوسہ دیا۔ آواز آئی "تارا! میں دنیا کی سب نعمتیں عطا کر سکتی ہوں۔ لیکن جنت کی نعمتیں میرے بس کی نہیں پریم جنت کی اعلےٰ ترین نعمت ہے"۔

تارا "دنیا کی سب نعمتیں میرے لئے وبال جان ہیں۔ میں اپنے پیارے کو کیسے پاؤں گی"؟

دیوی "اس کا ایک ہی راستہ ہے۔ مگر وہ بہت کٹھن ہے۔ تم اس پر چل سکو گی؟"

تارا "وہ کتنا ہی کٹھن ہو۔ میں اس پر چلوں گی"!

دیوی "وہ خدمت کا راستہ ہے۔ خدمت کرو۔ پریم خدمت ہی سے

مل سکتا ہے"۔

(۵)

تارا نے اپنے بیش بہا کپڑے اور مرصع زیورات اتار دیئے۔ کنیزوں سے جدا ہوئی۔ اسباب عیش اور قصر شاہی کو خیر باد کہی۔ اور بکیرہ و تنہا سادھو کی کٹی میں چلی آئی۔ اسے راہِ خدمت پر چلنے کی لو لگی ہوئی تھی۔

وہ کچھ رات رہے اُٹھتی۔ کٹی میں جھاڑو دیتی۔ سادھو کے لئے گنگا سے پانی لاتی جنگلوں سے پھول چنتی۔ سادھو نیند میں ہوتے۔ تو وہ ان کے پاس بیٹھی ہوئی آنچل سے پنکھا جھلتی۔ جنگلی پھل توڑ لاتی۔ اور کیلے کے پتل بنا کر سادھو کے سامنے رکھتی۔ سادھو ندی میں اشنان کرنے جایا کرتے تھے۔ تارا راستہ سے کنکر چنتی۔ اس نے کٹی کے چاروں طرف پھول لگائے۔ گنگا سے پانی لالا کر انہیں سینچتی۔ انہیں ہرا بھرا دیکھ کر خوش ہوتی۔ اس نے مدار کی روئیاں بٹوریں۔ اور سادھو کے لئے نرم گدے تیار کئے۔ اُسے کسی صلہ کی خواہش نہ تھی۔ خدمت آپ ہی اپنا صلہ، اپنا انعام تھی۔

تارا کو کئی کئی دن فاقے کرنا پڑتے۔ ہاتھوں میں گھٹے پڑ گئے۔ پیر کانٹوں سے چھلنی ہو گئے۔ دھوپ سے گل عارض مرجھا گئے۔ گلاب سا جسم سوکھ گیا۔ مگر اس کے دل میں اب خود پرستی اور غرور کی حکومت نہ تھی۔ وہاں اب پریم کا راج تھا۔ وہاں خدمت کی بو تھی۔ جس سے تلخیوں میں شیرینی آ جاتی ہے اور کانٹے پھول بن جاتے ہیں۔ جہاں آنسو کی جگہ آنکھوں سے آبِ حیات کی بارش ہوتی ہے۔ فغانِ درد کی جگہ آنند کے راگ نکلتے ہیں۔ جہاں کے پتھر روئی سے زیادہ نرم ہیں اور لو نسیم سے زیادہ روح پرور۔ تارا بھول گئی کہ میں حسن میں یکتائے روزگار ہوں۔ دولت اور ثروت میں لاثانی۔ وہ اب پریم کی لونڈی تھی۔

ساؤھو کو جنگل کے چرند و پرند سے عشق تھا۔ وہ کٹی کے پاس جمع ہو جاتے تارا انہیں پانی پلاتی۔ دانے چگاتی۔ گود میں لے کر پیار کرتی۔ زہریلے سانپ اور خون خوار درندے اس کی محبت کے اثر سے رام ہو گئے۔

ساؤھو کی دعا سے شفا پانے کے لئے اکثر مریض آتے رہتے تھے۔ تارا مریضوں کی تیمارداری کرتی۔ جنگل سے جڑی بوٹیاں ڈھونڈ لاتی۔ ان کے لئے دوائیں بناتی۔ ان کے زخم دھوتی۔ زخموں پر مرہم رکھتی۔ رات رات بھر بیٹھی انہیں پنکھا جھلتی۔ ساؤھو کی دعا اور دوا میں اس کی خدمت سے اور بھی تاثیر ہو جاتی تھی۔

اس طرح کتنے ہی دن گزر گئے۔ گرمی کے دن تھے۔ آگ کے جھونکے چل رہے تھے۔ زمین توے کی طرح جلتی تھی۔ ہرے بھرے درخت سوکھے جاتے تھے سانپ بانبی سے نکل نکل کر موروں کے پروں کے نیچے پناہ لیتے تھے۔ گنگا گرمی سے پھیلنے کے بجائے سمٹ گئی تھی۔ تارا کو پانی لانے کے لئے بہت دور ریت میں چلنا پڑتا۔ اس کا نازک جسم چور چور ہو جاتا۔ جلتی ہوئی ریت میں تلوے بھن جاتے۔ اسی حالت میں ایک دن وہ بے دم ہو کر ایک درخت کے نیچے ذرا دم لینے کے لئے بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ اس نے دیکھا کہ دیوی اس کے سامنے کھڑی نگاہ رحم سے اس کی طرف تاک رہی ہیں۔ تارا نے دوڑ کر ان کے قدموں کو بوسہ دیا۔

دیوی نے پوچھا "تارا! تیری مراد پوری ہوئی؟"

تارا "ہاں ماتا میری مراد پوری ہو گئی"۔

دیوی "تجھے پریم مل گیا؟"

تارا۔ نہیں ماتا۔ مجھے اس سے بھی بڑی نعمت مل گئی۔ مجھے پریم کے ہیرے کے بدلے خدمت کا پارس مل گیا۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ پریم خدمت کا چاکر ہے۔ خدمت کے سامنے سر جھکا کر اب میں پریم کی آرزومند نہیں۔ اب مجھے کسی دوسری

نعمت کی خواہش نہیں۔ خدمت نے مجھے محبت۔ عزت۔ آرام سب سے بے نیاز بنا دیا ۔

دیوی اب کی بار انداز تمسخر سے مسکرائیں نہیں۔ انہوں نے تارا کو گلے لگا لیا۔ اور نظروں سے غائب ہوگئیں ۔

(۶)

شام کا وقت تھا۔ شفق میں تارے یوں چمکتے تھے۔ جیسے کمل پر پانی کی بوند چمکتی ہے۔ ہوا میں ایک دلکش خنکی آگئی تھی۔ تارا ایک درخت کے نیچے کھڑی چڑیوں کو دانہ چگا رہی تھی کہ یکایک سادھو نے آکر اس کے قدموں پر سر جھکایا۔ اور بولا "تارا! تم نے مجھے جیت لیا۔ تمہاری دولت اور ثروت۔ تمہارا حسن اور انداز جو کچھ نہ کر سکا۔ وہ تمہاری خدمت نے کر دکھایا۔ تم نے مجھے اپنا دیوانہ بنا دیا۔ اب میں تمہارا خادم ہوں۔ تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟ تمہارے اشارے پر میں اپنا یوگ اور ویراگ۔ ترک اور زہد سب کچھ نثار کر دونگا ۔

تارا۔ سوامی جی! مجھے اب کوئی ہوس نہیں ہے۔ میں صرف خدمت کی اجازت چاہتی ہوں۔

سادھو۔ میں دکھا دوں گا کہ جوگ سادھ کر بھی انسان کا دل مردہ نہیں ہوتا میں بھونرے کی طرح تمہارے حسن پر منڈلاؤں گا۔ پپیہے کی طرح تمہاری پریم کی رٹ لگاؤں گا۔ ہم دونوں لعنت کی ناؤ پر بیٹھ کر دولت اور ثروت کی ندی کی سیر کرینگے۔ محبت کے کنجوں میں بیٹھ کر پریم کے دور چلائیں گے۔ آنند کے راگ گائیں گے ۔

تارا نے کہا "سوامی جی! راہ خدمت پر چل کر میں منزل مقصود پر پہنچ

گئی۔ اب دل میں کوئی آرزو کوئی ہوس نہیں ہے۔

سادھو نے پھر تارا کے قدموں پر سر جھکایا۔ اور گنگا کی طرف چل دیا۔

حج اکبر

(۱)

منشی صابر حسین کی آمدنی کم تھی۔ اور خرچ زیادہ۔ اپنے بچہ کے لئے دایہ رکھنا گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن ایک تو بچہ کی صحت کی فکر اور دوسرے اپنے برابر والوں سے ہیٹے بن کر رہنے کی ذلت اس خرچ کو برداشت کرنے پر مجبور کرتی تھی۔ بچہ دایہ کو بہت چاہتا تھا۔ ہر دم اس کے گلے کا ہار بنا رہتا۔ اس وجہ سے دایہ اور بھی ضروری معلوم ہوتی تھی۔ مگر شاید سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ وہ مروت کے باعث دایہ کو جواب دینے کی جرأت نہ کر سکتے تھے۔ بڑھیا ان کے یہاں تین سال سے نوکر تھی۔ اس نے ان کے اکلوتے بچے کی پرورش کی تھی۔ اپنا

کام دل و جان سے کرتی تھی۔ اسے نکالنے کا کوئی حیلہ نہ تھا اور خواہ مخواہ کھچڑ نکالنا صابر جیسے حلیم شخص کے لئے غیر ممکن تھا۔ مگر شاکرہ اس معاملہ میں اپنے شوہر سے متفق نہ تھی۔ اسے شک تھا کہ دایہ ہم کو لوٹے لیتی ہے۔ جب دایہ بازار سے لوٹتی۔ تو وہ دہلیز میں چھپی رہتی کہ دیکھوں آٹا چھپا کر تو نہیں رکھ دیتی۔ لکڑی تو نہیں چھپا دیتی۔ اس کی لائی ہوئی چیز کو گھنٹوں دیکھتی۔ پچھتاتی۔ بار بار پوچھتی اتنا ہی کیوں؟ کیا بھاؤ ہے؟ کیا اتنا مہنگا ہو گیا؟ دایہ کبھی تو ان بدگمانیوں کا جواب ملائمت سے دیتی۔ لیکن جب بیگم زیادہ تیز ہو جاتیں، تو وہ بھی کڑی پڑ جاتی تھی۔ قسمیں کھاتی۔ صفائی کی شہادتیں پیش کرتی۔ تردید اور حجت میں گھنٹوں لگ جاتے۔ قریب قریب روزانہ یہی کیفیت رہتی تھی اور روز یہ ڈراما دایہ کی خفیف سی اشک ریزی کے بعد ختم ہو جاتا تھا۔ دایہ کا اتنی سختیاں جھیل کر پڑے رہنا شاکرہ کے شکوک کی آب ریزی کرتا تھا۔ اسے کبھی یقین نہ آتا تھا کہ یہ بڑھیا محض بچے کی محبت سے پڑی ہوئی ہے۔ وہ دایہ کو ایسے لطیف جذبہ کا اہل نہیں سمجھتی تھی۔

(۲)

اتفاق سے ایک روز دایہ کو بازار سے لوٹنے میں ذرا دیر ہو گئی۔ وہاں دو کنجڑنوں میں بڑے جوش و خروش سے مناظرہ تھا۔ ان کا مصور طرز ادا۔ ان کا اشتعال انگیز استدلال۔ ان کی متشکل تضحیک۔ ان کی روشن شہادتیں، اور منور روایتیں ان کی تعریض اور تردید سب بے مثال تھیں۔ زہر کے دو دریا تھے۔ یا دو شعلے۔ جو دونوں طرف سے امڈ کر باہم گتھ گئے تھے۔ کیا روانی زبان تھی۔ گویا کوزے میں دریا بھرا ہوا۔ ان کا جوش اظہار ایک دوسرے کے بیانات کو

سُننے کی اجازت نہ دیتا تھا۔ ان کے الفاظ کی ایسی رنگینی۔ تخیل کی ایسی نوعیت۔ اسلوب کی ایسی جدت۔ مضامین کی ایسی آمد۔ تشبیہات کی ایسی موزونیت۔ اور فکر کی ایسی پرواز پر ایسا کون سا شاعر ہے۔ جو رشک نہ کرتا۔ صفت یہ تھی۔ کہ اس مباحثہ میں تلخی یا دلآزاری کا شائبہ کبھی نہ تھا۔ دونوں بلبلیں اپنے اپنے ترانوں میں محو تھیں۔ ان کی متانت۔ ان کا ضبط۔ ان کا اطمینانِ قلب حیرت انگیز تھا۔ ان کے ظرف دل میں اس سے کہیں زیادہ کہنے کی اور بدرجہا زیادہ سننے کی گنجائش معلوم ہوتی تھی۔ الغرض یہ خالص دماغی۔ ذہنی مناظرہ تھا۔ اپنے اپنے کمالات کے اظہار کے لئے۔ ایک خالص زور آزمائی تھی اپنے اپنے کرتب اور فن کے جوہر دکھانے کے لئے۔

تماشائیوں کا ہجوم تھا۔ وہ مبتذل کنایات و اشارے جن پر بے شرمی کو شرم آتی۔ وہ کلمات رکیک جن سے عفونت بھی دُور بھاگتی۔ ہزاروں رنگین مزاجوں کے لئے محض باعثِ تفریح تھے۔

دایہ بھی کھڑی ہو گئی کہ دیکھوں کیا ماجرا ہے۔ پر تماشا اتنا دلاویز تھا۔ کہ اُسے وقت کا مطلق احساس نہ ہوا۔ یکایک نو بجنے کی آواز کان میں آئی تو سحر ٹوٹا۔ وہ لپکی ہوئی گھر کی طرف چلی۔

شاکرہ بھری بیٹھی تھی۔ دایہ کو دیکھتے ہی تیور بدل کر بولی۔ کیا بازار میں کھو گئی تھیں؟ دایہ نے خطاوارانہ انداز سے سر جھکا لیا۔ اور بولی۔ "بیوی ایک جان پہچان کی ماما سے ملاقات ہو گئی۔ اور باتیں کرنے لگی۔"

شاکرہ جواب سے اور بھی برہم ہوئی۔ یہاں دفتر جانے کو دیر ہو رہی ہے تمہیں سیر سپاٹے کی سُوجھی ہے۔ مگر دایہ نے اس وقت دبنے میں خیریت سمجھی۔ بچہ کو گود میں لینے چلی۔ پر شاکرہ نے جھڑک کر کہا "رہنے دو۔ تمہارے بغیر

بے حال نہیں ہوا جاتا ؛

دایہ نے اس حکم کی تعمیل ضروری نہ سمجھی ۔ بیگم صاحبہ کا غصہ فرو کرنے کی اس سے زیادہ کارگر کوئی تدبیر ذہن میں نہ آئی ۔ اس نے نصیر کو اشارے سے اپنی طرف بلایا ۔ وہ دونوں ہاتھ پھیلائے لڑکھڑاتا ہوا اس کی طرف چلا ۔ دایہ نے اسے گود میں اٹھا لیا ۔ اور دروازہ کی طرف چلی ۔ لیکن شاکرہ باز کی طرح جھپٹی اور نصیر کو اس کی گود سے چھین کر بولی "تمہارا یہ مکر بہت دنوں سے دیکھ رہی ہوں ۔ یہ تماشے کسی اور کو دکھایئے ۔ یہاں طبیعت سیر ہو گئی ؛

دایہ نصیر پر جان دیتی تھی اور سمجھتی تھی ۔ کہ شاکرہ اس سے بے خبر نہیں ہے اس کی سمجھ میں شاکرہ اور اس کے درمیان یہ ایسا مضبوط تعلق تھا ۔ جسے معمولی تُرشیاں کمزور نہ کر سکتی تھیں ۔ اسی وجہ سے باوجود شاکرہ کی سخت زبانیوں کے اسے یقین نہ آتا تھا کہ وہ واقعی مجھے نکالنے پر آمادہ ہے ۔ پر شاکرہ نے یہ باتیں کچھ اس بے رحمی سے کہیں اور بالخصوص نصیر کو اس بے دردی سے چھین لیا کہ دایہ سے ضبط نہ ہو سکا ۔ بولی "بیوی مجھ سے کوئی ایسی بڑی خطا تو نہیں ہوئی ۔ بہت ہو گا ۔ تو پاؤ گھنٹہ کی دیر ہوئی ہو گی ۔ اس پر آپ اتنا جھلا رہی ہیں ۔ صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیتیں کہ دوسرا دروازہ دیکھو ۔ اللہ نے پیدا کیا ہے ۔ تو رزق بھی دے گا ۔ مزدوری کا کال تھوڑا ہی ہے"۔

شاکرہ ۔ تو یہاں تمہاری کون پروا کرتا ہے ۔ تمہاری جیسی مامائیں گلی گلی ٹھوکریں کھاتی پھرتی ہیں ؛

دایہ ۔ ہاں خدا آپ کو سلامت رکھے ۔ مامائیں دائیاں بہت ملیں گی ۔ جو کچھ خطا ہوئی ہو ۔ معاف کیجئے گا ۔ میں جاتی ہوں ۔

شاکرہ ۔ جا کر مردانے میں اپنی تنخواہ کا حساب کر لو ؛

دایہ ۔ میری طرف سے نصیر میاں کو اس کی مٹھائیاں منگوا دیجئے گا ۔

اتنے میں صابر حسین بھی باہر سے آ گئے ۔ پوچھا کیا ہے ؟

دایہ "۔ کچھ نہیں ۔ بیوی نے جواب دے دیا ہے ۔ گھر جاتی ہوں"

صابر حسین خانگی تردداتِ سے یوں بچتے تھے ۔ جیسے کوئی برہنہ پا کانٹوں سے بچے ۔ انہیں سارے دن ایک ہی جگہ کھڑے رہنا منظور تھا ۔ پر کانٹوں میں پَیر رکھنے کی جرأت نہ تھی ۔ چیں بہ جبیں ہو کر بولے "بات کیا ہوئی" ؟

شاکرہ ۔ کچھ نہیں ۔ اپنی طبیعت ۔ نہیں جی چاہتا نہیں رکھتے ۔ کسی کے ہاتھوں بک تو نہیں گئے ۔

صابر ۔ تمہیں بیٹھے بٹھائے ایک نہ ایک کھچڑ سوجھتی رہتی ہے ۔

شاکرہ ۔ ہاں مجھے تو اس بات کا جنون ہے ۔ کیا کروں خصلت ہی ایسی ہے تمہیں یہ بہت پیاری ہے ۔ تو لے جا کر گلے باندھو ! میرے یہاں ضرورت نہیں ہے ۔

دایہ گھر سے نکلی ۔ تو اس کی آنکھیں لبریز تھیں ۔ دل نصیر کے لئے تڑپ رہا تھا کہ ایک بار بچے کو گود میں لے کر پیار کر لوں ۔ پر یہ حسرت لئے اسے گھر سے نکلنا پڑا ۔

(۳)

نصیر دایہ کے پیچھے پیچھے دروازے تک آیا ۔ لیکن جب دایہ نے دروازہ باہر سے بند کر دیا تو مچل کر زمین پر لیٹ گیا ۔ اور انا انا کہہ کر رونے لگا ۔ شاکرہ نے چمکارا ۔ پیار کیا ۔ گود میں لینے کی کوشش کی ۔ مٹھائی کا لالچ دیا ۔ میلہ دکھانے کا وعدہ کیا ۔ اس سے کام نہ چلا تو بندر اور سپاہی اور لولو اور ہوّا کی دھمکی دی ۔

مگر نصیر پر مطلق اثر نہ ہوا۔ یہاں تک کہ شاکرہ کو غصہ آ گیا۔ اس نے بچے کو وہیں چھوڑ دیا۔ اور آ کر گھر کے دھندوں میں مصروف ہو گئی۔ نصیر کا منہ اور گال لال ہو گئے۔ آنکھیں سُوج گئیں۔ آخر وہ وہیں زمین پر سسکتے سسکتے سو گیا +

شاکرہ نے سمجھا تھا۔ تھوڑی دیر میں بچہ رو دھو کر چپ ہو جائے گا۔ پر نصیر نے جاگتے ہی پھر انا کی رٹ لگائی۔ تین بجے صابر حسین دفتر سے آئے اور بچے کی یہ حالت دیکھی۔ تو بیوی کی طرف قہر کی نگاہوں سے دیکھ کر اسے گود میں اُٹھا لیا۔ اور بہلانے لگے۔ آخر نصیر کو جب یقین ہو گیا کہ دایہ مٹھائی لینے گئی ہے تو اسے تسکین ہوئی۔ مگر شام ہوتے ہی اس نے پھر چیخنا شروع کیا۔ انا مٹھائی لائی ؟"

اس طرح دو تین دن گزر گئے۔ نصیر کو انا کی رٹ لگانے اور رونے کے سوا اور کوئی کام نہ تھا۔ وہ بے ضرر کتا جو ایک لمحہ کے لئے اس کی گود سے جُدا نہ ہوتا تھا۔ وہ بے زبان بلی جسے طاق پر بیٹھے دیکھ کر وہ خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا۔ وہ طائر بے پرواز جس پر وہ جان دیتا تھا۔ سب اس کی نظروں سے گر گئے۔ وہ ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا۔ انا جیسی جیتی جاگتی پیار کرنے والی۔ گود میں لے کر گھمانے والی۔ تھپک کر سلانے والی گا گا کر خوش کرنے والی چیز کی جگہ ان بے جان۔ بے زبان چیزوں سے پُر نہ ہو سکتی تھی۔ وہ اکثر سوتے سوتے چونک پڑتا۔ اور انا انا پکار کر رونے لگتا۔ کبھی دروازہ پر جاتا اور انا انا پکار کر ہاتھوں سے اشارہ کرتا۔ گویا اسے بُلا رہا ہے۔ انا کی خالی کوٹھڑی میں جا کر گھنٹوں بیٹھا رہتا۔ اُسے امید ہوتی تھی کہ انا یہاں آتی ہو گی۔ اس کوٹھڑی کا دروازہ بند پاتا۔ تو جا کر کواڑ کھٹکھٹاتا۔ کہ شاید انا اندر چھپی بیٹھی ہو۔ صدر دروازہ کھلتے سنتا۔ تو انا انا کہہ کر دوڑتا۔ سمجھتا کہ انا آ گئی۔ اس کا گدرایا ہوا بدن گُھل گیا۔ گلاب کے

سے رخسار سُوکھ گئے۔ ماں اور باپ دونوں اس کی موہنی ہنسی کے لئے ترس ترس کر رہ جاتے ۔ اگر بہت گُدگُدانے اور چھیڑنے سے ہنستا بھی۔ تو ایسا معلوم ہوتا دل سے نہیں محض دل رکھنے کے لئے ہنس رہا ہے۔ اسے اب دودھ سے رغبت تھی نہ مصری سے۔ نہ میوہ سے نہ میٹھے بسکٹ سے ۔ نہ تازی امرتیوں سے۔ اُن میں مزہ تھا۔ جب انّا اپنے ہاتھوں سے کھلاتی تھی ۔ اب ان میں مزہ نہ تھا۔ دو سال کا ہونہار لہلہاتا ہوا شاداب پودا مُرجھا کر رہ گیا ۔ وہ لڑکا جسے گود میں اُٹھاتے ہی نرمی گرمی اور وزن کا احساس ہوتا تھا۔ اب استخواں کا ایک پُتلا رہ گیا تھا۔ شاکرہ بچہ کی یہ حالت دیکھ دیکھ کر اندر ہی اندر کُڑھتی اور اپنی حماقت پر پچھتاتی۔ صابر حسین جو فطرتاً خلوت پسند آدمی تھے اب نصیر کو گود سے جُدا نہ کرتے تھے ۔ اسے روز ہوا کھلانے جاتے ۔ نت نئے کھلونے لاتے ۔ پر مُرجھایا ہوا پودا کسی طرح نہ پنپتا تھا ۔ دایہ اس کی دُنیا کا آفتاب تھی ۔ اس قدرتی حرارت اور روشنی سے محروم ہوکر سبزی کی بہار کیونکر دکھاتا ؟ دایہ کے بغیر اسے چاروں طرف اندھیرا سناٹا نظر آتا تھا ۔ دوسری انّا تیسرے ہی دن رکھ لی تھی ۔ پر نصیر اس کی صورت دیکھتے ہی منہ چھُپا لیتا تھا۔ گویا وہ کوئی دیونی یا بھُتنی ہے ۔

عالم وجود میں دایہ کو نہ دیکھ کر نصیر اب زیادہ تر عالم خیال میں رہتا۔ وہاں اس کی اپنی انّا چلتی پھرتی نظر آتی تھی ۔ اس کی وہی گود تھی ۔ وہی محبت۔ وہی پیاری باتیں ۔ وہی پیارے پیارے گیت ۔ وہی مزے دار مٹھائیاں ۔ وہی سہانا سنسار وہی دل کش لیل و نہار۔ اکیلے بیٹھے انّا سے باتیں کرتا ۔ انّا کتا بھونکے انّا گائے دودھ دیتی ۔ انّا اُجلا اُجلا گھوڑا دوڑتا ۔ سویرا ہوتے ہی لوٹا لے کر دایہ کی کوٹھڑی میں جاتا اور کہتا ” انّا پانی پی“۔ دودھ کا گلاس لے کر اس کی کوٹھڑی میں رکھ آتا۔ اور کہتا ” انّا دودھ پلا“ ۔ اپنی چارپائی پر تکیہ رکھ کر چادر سے ڈھانک دیتا ۔ اور کہتا ۔

"انا سوتی"۔ شاکرہ کھانے بیٹھتی تو رکابیاں اٹھا اٹھا انا کی کوٹھڑی میں لے جاتا اور کہتا انا کھانا کھائے گی" انا اس کے لئے اب ایک آسمانی وجود تھی۔ جس کی واپسی کی اُسے مطلق اُمید نہ تھی۔ وہ محض گذشتہ خوشیوں کی دل کش یادگار تھی۔ جس کی یاد ہی اس کا سب کچھ تھی۔ نصیر کے انداز میں رفتہ رفتہ طفلانہ شوخی اور بے تابی کی جگہ ایک حسرتناک توکل ایک مایوسانہ خوشی نظر آنے لگی۔ اس طرح تین ہفتے گزر گئے۔ برسات کا موسم تھا۔ کبھی شدت کی گرمی۔ کبھی ہوا کے ٹھنڈے جھونکے۔ بخار اور زکام کا زور تھا۔ نصیر کی نحافت ان موسمی تغیرات کو برداشت نہ کرسکی۔ شاکرہ احتیاطاً اسے فلالین کا کرتا پہنائے رکھتی۔ اُسے پانی کے قریب نہ جانے دیتی ننگے پاؤں ایک قدم نہ چلنے دیتی۔ مگر رطوبت کا اثر ہو ہی گیا۔ نصیر کھانسی اور بخار میں مبتلا ہو گیا۔

(۴)

صبح کا وقت تھا۔ نصیر چارپائی پر آنکھیں بند کئے پڑا تھا۔ ڈاکٹروں کا علاج بے سود ہو رہا تھا۔ شاکرہ چارپائی پر بیٹھی اس کے سینہ پر تیل کی مالش کر رہی تھی۔ اور صابر حسین صورت غم بنے ہوئے بچہ کو پُر درد نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ اس طرف وہ شاکرہ سے بہت کم بولتے تھے۔ انہیں اُس سے ایک نفرت سی ہوتی تھی۔ وہ نصیر کی اس بیماری کا سارا الزام اسی کے سر رکھتے تھے۔ وہ ان کی نگاہوں میں نہایت کم ظرف۔ سفلہ مزاج بے حس عورت تھی۔

شاکرہ نے ڈرتے ڈرتے کہا "آج بڑے حکیم صاحب کو بلا لیتے۔ شاید انہیں کی دوا سے فائدہ ہو۔ صابر حسین نے کالی گھٹاؤں کی طرف دیکھ کر ترشی سے جواب دیا "بڑے حکیم نہیں۔ لقمان بھی آئیں تو اُسے کوئی فائدہ نہ ہوگا"

شاکرہ "تو کیا اب کسی کی دوا ہی نہ ہوگی؟"

صابر۔ بس اس کی ایک ہی دوا ہے اور وہ نایاب ہے۔

شاکرہ۔ تمہیں تو وُہی دُھن سوار ہے۔ کیا عباسی امرت پلا دے گی ؟

صابر۔ ہاں وہ تمہارے لئے چاہے زہر ہو۔ لیکن بچے کے لئے امرت ہی ہوگی۔

شاکرہ۔ میں نہیں سمجھتی کہ اللہ کی مرضی میں اسے اتنا دخل ہے۔

صابر۔ اگر نہیں سمجھتی ہو۔ اور اب تک نہیں سمجھا تو روؤگی۔ بچے سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔

شاکرہ۔ چپ بھی رہو۔ کیسا شگون زبان سے نکالتے ہو۔ اگر ایسی جلی کٹی سناتی ہیں تو یہاں سے چلے جاؤ۔

صابر۔ ہاں تو میں جاتا ہوں۔ مگر یاد رکھو یہ خون تمہاری گردن پر ہوگا۔ اگر لڑکے کو پھر تندرست دیکھنا چاہتی ہو۔ تو اس عباسی کے پاس جاؤ۔ اس کی منت کرو۔ التجا کرو۔ تمہارے بچے کی جان اسی کے رحم پر منحصر ہے۔

شاکرہ نے کچھ جواب نہ دیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

صابر حسین نے پُوچھا "کیا مرضی ہے۔ جاؤں اسے تلاش کروں"؟

شاکرہ۔ تم کیوں جاؤ گے۔ میں خود چلی جاؤں گی۔

صابر۔ نہیں۔ معاف کرو۔ مجھے تمہارے اوپر اعتبار نہیں ہے۔ نہ جانے تمہارے منہ سے کیا نکل جائے کہ وہ آتی بھی ہو۔ تو نہ آئے۔

شاکرہ نے شوہر کی طرف نگاہِ ملامت سے دیکھ کر کہا۔ "ہاں اور کیا۔ مجھے اپنے بچے کی بیماری کا قلق تھوڑے ہی ہے۔ میں نے شرم کے مارے تم سے کہا نہیں لیکن میرے دل میں بار بار یہ خیال پیدا ہوا ہے۔ اگر مجھے دایہ کے مکان کا پتہ معلوم ہوتا تو میں اسے کب کی منا لاتی ہوتی۔ وہ مجھ سے کتنی ہی ناراض ہو۔ لیکن نصیر سے

اُسے محبت تھی۔ میں آج ہی اس کے پاس جاؤں گی۔ اس کے قدموں کو آنسوؤں سے تر کروں گی۔ اور وہ جس طرح راضی ہو گی اُسے راضی کروں گی۔

شاکرہ نے بہت ضبط کر کے یہ باتیں کہیں۔ مگر اُمڈے ہوئے آنسو اب نہ رُک سکے۔ صابر حسین نے بیوی کی طرف ہمدردانہ نگاہ سے دیکھا اور نادم ہو کر بولے "میں تمہارا جانا مناسب نہیں سمجھتا۔ میں خود ہی جاتا ہوں"۔

(۵)

عباسی دنیا میں اکیلی تھی۔ کسی زمانے میں اس کا خاندان گلاب کا سرسبز شاداب درخت تھا۔ مگر رفتہ رفتہ خزاں نے سب پتیاں گرا دیں۔ بادِ حوادث نے درخت کو پامال کر دیا۔ اور اب یہی ایک سوکھی ٹہنی ہرے بھرے درخت کی یادگار باقی تھی۔

مگر نصیر کو پا کر اس کی سوکھی ٹہنی میں جان سی پڑ گئی تھی۔ اس میں ہری ہری پتیاں نکل آئی تھیں۔ وہ زندگی جو اب تک خشک اور پامال تھی۔ اس میں پھر رنگ و بُو کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔ اندھیرے بیابان میں بھٹکے ہوئے مسافر کو شمع کی جھلک نظر آنے لگی تھی۔ اب اس کا جُوئے حیات سنگ ریزوں سے نہ ٹکراتا تھا۔ وہ اب ایک گلزار کی آبیاری کرتا تھا۔ اب اس کی زندگی مہمل نہیں تھی۔ اس میں معنی پیدا ہو گئے تھے۔

عباسی نصیر کی بھولی بھولی باتوں پر نثار ہو گئی۔ مگر وہ اپنی محبت کو شاکرہ سے چھپاتی تھی۔ اس لئے کہ ماں کے دل میں رشک نہ ہو۔ وہ نصیر کے لئے ماں سے چھپ کر مٹھائیاں لاتی اور اُسے کھلا کر خوش ہوتی۔ وہ دن میں دو دو تین تین بار اُسے اُبٹن ملتی۔ کہ بچہ خوب پروان چڑھے۔ وہ اسے دوسروں کے سامنے کوئی چیز نہ کھلاتی۔ کہ بچے کو نظر نہ لگ جائے۔ ہمیشہ دوسروں سے بچے کی کم خوری کا رونا

رویا کرتی۔ اسے نظر بد سے بچانے کے لئے تعویز اور گنڈے لاتی رہتی۔ یہ اس کی خالص مادرانہ محبّت تھی۔ جس میں اپنے روحانی اختلاط کے سوا اور کوئی غرض نہ تھی۔

اس گھر سے نکل کر آج عباسی کی وہ حالت ہو گئی۔ جو ٹھیٹر میں یکایک بجلیوں کے گل ہو جانے سے ہوتی ہے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے وہی صورت ناچ رہی تھی۔ کانوں میں وہی پیاری پیاری باتیں گونج رہی تھیں۔ اسے اپنا گھر پھاڑے کھاتا تھا۔ اس کال کوٹھڑی میں دم گھٹا جاتا تھا۔

رات جوں توں کر کے کٹی۔ صبح کو وہ مکان میں جھاڑو دے رہی تھی۔ یکایک تازے حلوے کی صدا سن کر بے اختیار باہر نکل آئی۔ معاً یاد آ گیا۔ آج حلوہ کون کھائے گا؟ آج گود میں بیٹھ کر کون چہکے گا؟ وہ نغمہ مسرت سننے کے لئے جو حلوا کھاتے وقت نصیر کی آنکھوں سے۔ ہونٹوں سے اور جسم کے ایک ایک عضو سے برستا تھا۔ عباسی کی روح تڑپ اٹھی۔ وہ بے قراری کے عالم میں گھر سے نکلی کہ چلوں۔ نصیر کو دیکھ آؤں۔ پر آدھے راستہ سے لوٹ گئی۔

نصیر عباسی کے دھیان سے ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں اترتا تھا۔ وہ سوتے سوتے چونک پڑتی۔ معلوم ہوتا نصیر ڈنڈے کا گھوڑا دبائے چلا آتا ہے۔ پڑوسنوں کے پاس جاتی تو نصیر ہی کا چرچا کرتی۔ اس کے گھر کوئی آتا۔ تو نصیر ہی کا ذکر کرتی۔ نصیر اس کے دل اور جان میں بسا ہوا تھا۔ شاکرہ کی بے رخی اور بدسلوکی کے ملال کے لئے اس میں جگہ نہ تھی۔

وہ روز ارادہ کرتی کہ آج نصیر کو دیکھنے جاؤں گی۔ اس کے لئے بازار سے کھلونے اور مٹھائیاں لاتی۔ گھر سے چلتی۔ لیکن کبھی آدھے راستہ سے لوٹ آتی۔ کبھی دو چار قدم سے آگے نہ بڑھا جاتا۔ کون منہ لے کر جاؤں؟ جو محبت کو فریب سمجھتا ہو۔ اُسے کون منہ دکھاؤں۔ کبھی سوچتی کہیں نصیر مجھے نہ پہچانے تو بچوں کی محبت کا اعتبار کیا؟

نئی وابیہ سے پرچ گیا ہو - یہ خیال اس کے پیروں پر زنجیر کا کام کر جاتا تھا ۔

اس طرح دو ہفتے گزر گئے - عباسی کا دل ہر دم اچاٹ رہتا - جیسے اُسے کوئی لمبا سفر در پیش ہو - گھر کی چیزیں جہاں کی تہاں پڑی رہتیں - نہ کھانے کی فکر نہ کپڑے کی - بدنی ضروریات بھی خلاء دل کو پُر کرنے میں لگی ہوئی تھیں - اتفاق سے اسی اثنا میں حج کے دن آگئے - محلہ میں کچھ لوگ حج کی تیاریاں کرنے لگے - عباسی کی حالت اس وقت پالتو چڑیا کی سی تھی - جو قفس سے نکل کر پھر کسی گوشہ کی تلاش میں ہو - اُسے اپنے تئیں بھلا دینے کا یہ ایک بہانہ مل گیا - آمادہ سفر ہو گئی ۔

(۶)

آسمان پر کالی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں - اور ہلکی ہلکی پھواریں پڑ رہی تھیں - دہلی اسٹیشن پر زائرین کا ہجوم تھا - کچھ گاڑیوں میں بیٹھے تھے - کچھ اپنے گھر والوں سے رخصت ہو رہے تھے - چاروں طرف ایک کہرام سا مچا ہوا تھا - دنیا اس وقت بھی جانے والوں کے دامن پکڑے ہوئے تھی - کوئی بیوی سے تاکید کر رہا تھا - دھان کٹ جائے تو تالاب والے کھیت میں مٹر بو دینا اور باغ کے پاس گیہوں - کوئی اپنے جوان لڑکے کو سمجھا رہا تھا - اسامیوں پر بقایا لگان کی نالش کرنے میں دیر نہ کرنا اور دو روپیہ سیکڑہ سود ضرور مجرا کر لینا - ایک بوڑھے تاجر صاحب اپنے منیم سے کہہ رہے تھے - مال آنے میں دیر ہو تو خود چلے جایئے گا - اور چلتو مال لیجئے گا - ورنہ روپیہ پھنس جائے گا - مگر خال خال ایسی صورتیں بھی نظر آتی تھیں جن پر مذہبی ارادت کا جلوہ تھا - وہ یا تو خاموش آسمان کی طرف تاکتی تھیں یا محوِ تسبیح خوانی تھیں - عباسی بھی ایک گاڑی میں بیٹھی سوچ رہی تھی - ان بھلے آدمیوں کو اب بھی دنیا کی فکر نہیں چھوڑتی - وہی خرید و فروخت لین دین کے

چرچے نصیر اس وقت یہاں ہوتا تو بہت روتا۔ میری گود سے کسی طرح نہ اترتا۔ لوٹ کر ضرور اسے دیکھنے جاؤں گی۔ یا اللہ کسی طرح گاڑی چلے۔ گرمی کے مارے کلیجہ پھنکا جاتا ہے۔ اتنی گھٹا امڈی ہوئی ہے۔ برسنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ معلوم نہیں۔ یہ ریل والے کیوں دیر کر رہے ہیں؟ جھوٹ موٹ اِدھر اُدھر دوڑتے پھرتے ہیں یہ نہیں۔ کہ چٹ پٹ گاڑی کھول دیں۔ مسافروں کی جان میں جان آئے۔ یکایک اس نے صابر حسین کو بائیسکل لئے پلیٹ فارم پر آتے دیکھا۔ ان کا چہرہ اترا ہوا تھا اور کپڑے تر تھے۔ وہ گاڑیوں میں جھانکنے لگے۔ عباسی محض یہ دکھانے کے لئے کہ میں بھی حج کرنے جا رہی ہوں۔ گاڑی سے باہر نکل آئی۔ صابر حسین اُسے دیکھتے ہی لپک کر قریب آئے اور بولے "کیوں عباسی تم بھی حج کو چلیں"؟

عباسی نے فخریہ انکسار سے کہا "ہاں! یہاں کیا کروں؟ زندگی کا کوئی ٹھکانا نہیں۔ معلوم نہیں کب آنکھیں بند ہو جائیں۔ خدا کے یہاں منہ دکھانے کے لئے بھی تو کوئی سامان چاہئے۔ نصیر میاں تو اچھی طرح ہیں؟"

صابر۔ اب تو تم جا ہی رہی ہو۔ نصیر کا حال پوچھ کر کیا کرو گی۔ اس کے لئے دُعا کرتی رہنا۔

عباسی کا سینہ دھڑکنے لگا۔ گھبرا کر بولی "کیا دشمنوں کی طبیعت اچھی نہیں ہے؟"

صابر۔ اس کی طبیعت تو اسی دن سے خراب ہے۔ جس دن تم وہاں سے نکلیں۔ کوئی دو ہفتہ تک تو شب و روز انّا انّا کی رٹ لگاتا رہا۔ اور اب ایک ہفتہ سے کھانسی اور بخار میں مبتلا ہے۔ ساری دوائیں کر کے ہار گیا۔ کوئی نفع ہی نہیں ہوتا۔ میں نے ارادہ کیا تھا۔ چل کر تمہاری منت سماجت کر کے لے چلوں۔ کیا جانے تمہیں دیکھ کر اس کی طبیعت کچھ سنبھل جائے۔ لیکن تمہارے گھر پر

آیا۔ تو معلوم ہوا۔ کہ تم حج کرنے جارہی ہو۔ اب کس منہ سے چلنے کو کہوں۔ تمہارے ساتھ سلوک ہی کون سا اچھا کیا تھا؟ کہ اتنی جرأت کرسکوں اور پھر کارِ ثواب میں رخنہ ڈالنے کا بھی خیال ہے۔ جاؤ! اس کا خدا حافظ ہے۔ حیات باقی ہے۔ تو صحت ہو ہی جائے گی۔ ورنہ مشیت ایزدی سے کیا چارہ؟"

عباسی کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ سامنے کی چیزیں تیرتی ہوئی معلوم ہوئیں۔ دل پر ایک عجیب وحشت کا غلبہ ہوا۔ دل سے دعا نکلی۔ "اللہ میری جان کے صدقے۔ میرے نصیر کا بال بیکا نہ ہو۔" رقت سے گلا بھر آیا۔ میں کیسی سنگ دل ہوں۔ پیارا بچہ درد کر ہلکان ہوگیا اور میں اُسے دیکھنے تک نہ گئی۔ شاکرہ بدمزاج سہی۔ بدزبان سہی۔ نصیر نے میرا کیا بگاڑا تھا؟ میں نے ماں کا بدلہ نصیر سے لیا۔ یا خدا میرا گناہ بخشؤ! پیارا نصیر میرے لئے تڑپ رہا ہے (اس خیال سے عباسی کا کلیجہ مسوس اٹھا اور آنکھوں سے آنسو بہ نکلے) مجھے کیا معلوم تھا کہ اسے مجھ سے اتنی محبت ہے۔ ورنہ شاکرہ کی جوتیاں کھاتیں اور گھر سے قدم نہ نکالتی۔ آہ! نہ معلوم بچارے کی کیا حالت ہے؟ انداز وحشت سے بولی "دودھ تو پیتے ہیں نا؟"

صابر۔ تم دودھ پینے کو کہتی ہو۔ اس نے دو دن سے آنکھیں تو کھولیں نہیں۔

عباسی۔ یا میرے اللہ! ارے او قُلّی قلی! بیٹا!! آکے میرا اسباب گاڑی سے اتار دے۔ اب مجھے حج وج کی نہیں سوجھتی۔ ہاں بیٹا! جلدی کر۔ میاں دیکھئے کوئی یکہ ہو تو ٹھیک کر لیجئے!

یکہ روانہ ہوا۔ سامنے سڑک پر کئی بگھیاں کھڑی تھیں۔ گھوڑا آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ عباسی بار بار جھنجلاتی تھی۔ اور یکہ بان سے کہتی تھی۔ بیٹا جلدی کر!

میں تجھے کچھ زیادہ دے دوں گی۔ راستے میں مسافروں کی بھیڑ دیکھ کر اُسے غصہ آتا تھا اس کا جی چاہتا تھا۔ گھوڑے کے پر لگ جاتے۔ لیکن جب صابر حسین کا مکان قریب آگیا۔ تو عباسی کا سینہ زور سے اُچھلنے لگا۔ بار بار دل سے دعا نکلنے لگی۔ خدا کرے۔ سب خیر و عافیت ہو۔

یکہ صابر حسین کی گلی میں داخل ہوا۔ دفعتہً عباسی کے کان میں کسی کے رونے کی آواز آئی۔ اس کا کلیجہ منہ کو آگیا۔ سر تیورا گیا۔ معلوم ہوا۔ دریا میں ڈوبی جاتی ہوں جی چاہا۔ یکہ سے کود پڑوں۔ مگر ذرا دیر میں معلوم ہوا کہ عورت میکہ سے بدا ہو رہی ہے۔ تسکین ہوئی۔

آخر صابر حسین کا مکان آپہنچا۔ عباسی نے ڈرتے ڈرتے دروازے کی طرف تاکا۔ جیسے کوئی گھر سے بھاگا ہوا یتیم لڑکا شام کو بھوکا پیاسا گھر آئے۔ اور دروازے کی طرف سہمی ہوئی نگاہ سے دیکھے کہ کوئی بیٹھا تو نہیں ہے۔ دروازہ پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ باورچی بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ عباسی کو ذرا ڈھارس ہوئی۔ گھر میں داخل ہوئی۔ تو دیکھا کہ نئی دایہ بیٹھی پولٹس پکا رہی ہے۔ کلیجہ مضبوط ہوا۔ شاکرہ کے کمرے میں گئی۔ تو اس کا دل گرما کی دوپہری دھوپ کی طرح کانپ رہا تھا۔ شاکرہ نصیر کو گود میں لئے دروازے کی طرف ٹکٹکی لگائے تاک رہی تھی۔ غم اور یاس کی زندہ تصویر۔

عباسی نے شاکرہ سے کچھ نہیں پوچھا۔ نصیر کو اس کی گود سے لے لیا۔ اور اس کے منہ کی طرف چشم پُرنم سے دیکھ کر کہا۔ "بیٹا! نصیر آنکھیں کھولو!"

نصیر نے آنکھیں کھولیں۔ ایک لمحہ تک دایہ کو خاموش دیکھتا رہا۔ تب یکایک دایہ کے گلے سے لپٹ گیا۔ اور بولا۔ "انا آئی۔ انا آئی!"

نصیر کا زرد مرجھایا ہوا چہرہ روشن ہو گیا۔ جیسے بجھتے ہوئے چراغ میں تیل

جائے۔ ایسا معلوم ہوا۔ گویا وہ کچھ بڑھ گیا ہے۔

ایک ہفتہ گذر گیا۔ صبح کا وقت تھا۔ نصیر آنگن میں کھیل رہا تھا۔ صابر حسین نے آکر اسے گود میں اٹھا لیا۔ اور پیار کر کے بولے "تمہاری امّاں کو مار کر بھگا دیں"؟

نصیر نے منہ بنا کر کہا "نہیں روئے گی"۔

عباسی بولی "کیوں بیٹا! مجھے تو تو نے کعبہ شریف نہ جانے دیا۔ میرے حج کا ثواب اب کون دے گا"؟

صابر حسین نے مسکرا کر کہا "تمہیں اس سے کہیں زیادہ ثواب ہو گیا۔ اس حج کا نام حج اکبر ہے"۔

آتمارام

(۱)

موضع بیندو میں مہادیو سنار ایک نمایاں وجود تھا۔ وہ اپنے کھپریل کے بوسیدہ سائبان میں انگیٹھی کے سامنے بیٹھا ہوا صبح سے پہر رات ہتھوڑا لئے کھٹ کھٹ کیا کرتا تھا۔ اس صدائے پیہم کے لوگ اس قدر عادی ہو گئے تھے کہ جب کسی وجہ سے یہ آوازیں بند ہو جائیں۔ تو ایسا معلوم ہوتا۔ گویا کوئی چیز غائب ہو گئی ہے۔ وہ روز ایک بار صبح کو اپنے طوطے کا پنجرہ لئے کوئی بھجن گاتا ہوا تالاب کی طرف جاتا تھا۔ اس وقت اندھیرے میں اس کی جھکی ہوئی کمر اور اس کا جسم نحیف دیکھ کر کسی اجنبی شخص کو اس پر شیطانی وجود کا دھوکا ہو سکتا تھا اس کے یہ بھجن تعین وقت کے اعتبار سے صدائے مرغ کا کام دیتے تھے۔

جوں ہی کانوں میں آواز آتی "ست گرو ست شیو ست داتا" لوگ سمجھ جاتے کہ سویرا ہوگیا۔ اس کی یہی حرکت اس کے تکمیل اعضاء کا ثبوت تھی۔ ورنہ طلوع سحر کے بعد پھر اسے ایک متحرک بت خیال کرنے میں اگر کوئی امر مانع تھا۔ تو یہ وہی ست گرو ست کا کلمۂ وحدت تھا۔ جس سے وہ اپنے طوطے کو عبادت کی تلقین کیا کرتا تھا۔ فی الواقع مہادیو بے کار ہستی کا ایک نادر مجسمہ تھا۔ جو شکستوں اور ناکامیوں سے بے خبر۔ زخموں اور چرکوں سے بے پروا۔ ابھی تک شمشیر بکف میدان میں مردانہ وار کھڑا تھا۔ جو اس کا میسرہ منتشر ہو کر دانتوں کا دستہ پامال کمر کا میمنہ متزلزل غول قلب پریشان ہو چکا تھا۔ مگر ہمت وہی تھی۔ استقلال وہی۔ استحکام وہی جس پر شباب کو رشک ہو سکتا تھا۔

مہادیو خوش نصیب بھی تھا اور کم نصیب بھی۔ خوش نصیب اس لئے کہ اس کے تین لڑکے تھے۔ تین بہوئیں تھیں اور بہوؤں کے لڑکے تھے۔ لڑکے کہتے ابھی جب تک دادا جیتے ہیں۔ تب تک تو زندگی کا لطف اٹھالیں۔ پھر تو یہ ڈھول گلے پڑے گی ہی۔ ممکن تھا کہ لڑکے اپنے باپ کی کچھ مدد کرتے۔ لیکن چونکہ مہادیو اپنے بزرگانہ اختیارات سے مستعفی نہ ہوتا تھا۔ اس لئے لڑکے اس کی ذمہ داریوں میں مخل ہونے کی ضرورت بھی نہ سمجھتے تھے اور اس لازم و ملزوم کی چکی میں پڑا ہوا وہ نیم جان۔ خستہ حال بڈھا پِسا جاتا تھا۔ اس پر لطف یہ کہ انقضاء عمر کے ساتھ ان ذمہ داریوں کی نسبت معکوس تھی۔ دائرہ کفالت روز بہ روز وسیع اور وسائل معاش روز بروز تنگ ہوتے جاتے تھے۔ پہلے کوزہ کا ذوق مہادیو کی ذات تک محدود تھا۔ پر اب سعادت مند بیٹے بھی باپ کے نقش قدم پر چلنے لگے تھے۔ مہادیو کو ساتی اور بسا اوقات ساتی "ناکام" کا پارٹ ادا کرنا پڑتا تھا۔ بیٹے اس وقت جذبات حریت اور مساوات کے ایسے پرشور مناظرے

کرتے کہ کبھی کبھی یہ جوش فرزندانہ سعادت مندی پر بھی غالب آجاتا تھا۔ اور اس وقت تک فرو نہ ہوتا تھا۔ جب تک کہ ماکولات کی مساوی مقدار ان کی تسکین قلب کے لئے نہ پہنچ جاتی۔ بے چارہ مہادیو کبھی کبھی اس شور قیامت سے تنگ آکر بھوکا اٹھ آتا۔ اور اپنے غمگسار حقے کا نغمۂ شیریں سُنتا سُنتا سو جاتا۔ افسوس یہی ہے کہ باہر بھی اُسے ان باغیانہ مناظروں سے نجات نہ تھی۔ باوجودیکہ وہ اپنے فن میں یگانہ روزگار تھا۔ اس کی گھٹاوروں سے کہیں زیادہ دیر اثر تھی۔ اس کی صفائی کہیں زیادہ وقت طلب اور اس کے کیمیائی عمل کہیں زیادہ قوی التاثیر۔ تاہم اسے بے صبر اور وہمی اشخاص کی بدزبانیوں کا آئے دن نشانہ بننا پڑتا تھا۔ پر مہادیو عابدانہ توکل کے ساتھ سر جھکائے ہوئے چاروں طرف کی بوچھاڑیں سہا کرتا۔ اس کے کان روزانہ نفریں اور دشنام طعن و تشنیع کے اس قدر عادی ہو گئے تھے کہ اسے اب اُن کا احساس ہی نہ ہوتا تھا۔ جوں ہی یہ طوفان فرو ہوتا۔ وہ اپنے طوطے کی طرف دیکھ کر پکار اُٹھتا۔ "ست گرودت شیو دت داتا۔" اس اسم اعظم کا وِرد اس کی تشفی کامل کا وسیلہ بن جاتا تھا۔ یہ جھونکے اس کی زندگی کے ایک جزو لازم بن گئے تھے۔ ان سے اس کے سکون میں مطلق فرق نہ پڑتا تھا۔

(۲)

ایک روز اتفاق سے کسی لڑکے نے پنجرے کا دروازہ کھول دیا۔ طوطا اُڑ گیا۔ مہادیو نے سر اُٹھاکر پنجرے کی طرف دیکھا۔ اور اس کا کلیجہ سن سے ہو گیا۔ ایں! طوطا کہاں گیا؟ اس نے پھر پنجرے کی طرف دیکھا۔ طوطا غائب تھا۔ وہ گھبرا کر اٹھا۔ اور اِدھر اُدھر کھپریلوں پر نظر دوڑانے لگا۔ اُسے دنیا میں اگر کوئی چیز پیاری تھی۔ تو یہ طوطا تھا۔ لڑکے بالوں۔ ناتی پوتوں سے اس کی طبیعت آسودہ

ہو گئی تھی - وہ کبھی کسی بچہ کو گود میں نہ لیتا - بچوں کی شرارت سے اس کے کام میں ہرج ہوتا تھا - کوئی ہتھوڑا چھین لیتا - کوئی سنسی اٹھا لیتا - اس لئے وہ اپنے قریب بھی نہ آنے دیتا تھا - بیٹوں سے اسے مطلق انس نہ تھا - نہ اس لئے کہ وہ کاہل وجود تھے بلکہ اس لئے کہ وہ اس کے شریک کوزہ ہو جاتے تھے - محلہ کے آدمیوں سے اسے چڑ تھی - اس لئے کہ وہ اس کی بھٹی سے آگ نکال لے جاتے تھے - اس تمام مجمع شر سے اس کے لئے کوئی پناہ تھی - تو وہ یہی طوطا تھا - جس کی ذات سے اسے کوئی تکلیف - کوئی الجھن - کوئی پریشانی نہ ہوتی تھی - وہ اب زندگی کی اس منزل پر پہنچ گیا تھا - جب انسان کی نگاہوں میں عافیت کی - گوشۂ امن کی وقعت دُنیا کی اور سب چیزوں سے زیادہ ہو جاتی ہے ؎

طوطا ایک کھپریل پر بیٹھا تھا - مہادیو نے پنجرا اُتار لیا - اور اسے دکھا کر کہنے لگا "آ - آ ست گرو دت - بشیوودت داتا - آ - آ" - لیکن گاؤں اور گھر کے کئی لڑکے جمع ہو کر چلانے اور تالیاں بجانے لگے - اوپر سے کوؤں نے کائیں کائیں شروع کی - طوطا اڑا - اور گاؤں سے باہر نکل کر ایک درخت پر جا بیٹھا - مہادیو بھی خالی پنجرا لئے اس کی طرف دوڑا - ہاں دوڑا ! لوگ اس کی تیز گامی پر عش عش کرتے تھے - ہوس کی اس سے بہتر - اس سے جامع - اس سے زندہ تصویر شاید کسی مصور کے خیال میں نہیں آ سکتی - پشتِ دوتا اور سرعت گام میں کوئی نفاق نہیں ہے - اس کی تصدیق ہو گئی ؎

دوپہر ہو گئی تھی - کسان پُر چھوڑ چھوڑ کر چلے آتے تھے - اس موقع تفریح کو کیوں ہاتھ سے جانے دیتے - مہادیو کی دل آزاری میں ہر شخص کو مزہ آتا تھا - بالخصوص اس کی تنگا پوئے پُر خم کا نظارہ نہایت فرحت انگیز تھا - لوگوں نے کنکر پھینکے - تالیاں بجائیں - طوطا پھر اڑا - اور اس درخت سے دُور آم کے گھنے باغ میں ایک

درخت کی چوٹی پر جا بیٹھا۔ مہادیو پھر خالی پنجرا لئے آ۔ آکر تا طوطے کی طرف ٹکٹکی لگائے مینڈک کی طرح اچکتا ہوا چلا۔ کسانوں کا غول بھی ہو حق مچاتا ہوا اس کے پیچھے دوڑا۔ مگر اس کی سرگرمی طلب ان کے شوق تفریح پر غالب آئی۔ جب وہ اس گھنے باغ میں پہنچا۔ تو اکیلا تھا۔ اس نے سایہ میں ذرا دم لیا۔ پیر کے تلووں سے آگ نکل رہی تھی۔ جب ہوش بجا ہوئے۔ تو اس نے پھر پنجرا اٹھایا۔ اور پھر کہنے لگا۔ "ست گرودت شیو دت داتا۔ آ۔ آ"!

طوطا پھنگی سے اتر کر نیچے کی ایک شاخ پر آ بیٹھا۔ مگر مہادیو کی طرف مشتبہ نگاہوں سے دیکھ کر پھر اڑا اور دوسری شاخ پر جا بیٹھا۔ مہادیو نے سمجھا مجھ سے ڈر رہا ہے۔ وہ پنجرے کو چھوڑ کر آپ ایک دوسرے درخت کی آڑ میں چھپ گیا۔ طوطے نے چاروں طرف غور سے دیکھا۔ اُسے یقین ہو گیا کہ اب کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ اترا اور آکر پنجرے کے اوپر بیٹھ گیا۔ مہادیو کا کلیجہ اچھلنے لگا۔ ست گرودت شیو دت کا ورد کرتا ہوا آہستہ آہستہ طوطے کے قریب آیا۔ اور تب ایک جست مار کر لپکا کہ طوطے کو پکڑ لے۔ مگر طوطا ہاتھ نہ آیا۔ پھر اڑ کر درخت پر جا بیٹھا *

شام تک یہی کیفیت رہی۔ طوطا کبھی اس شاخ پر جاتا۔ کبھی اس شاخ پر۔ کبھی پنجرے پر آتا کبھی پنجرے کے دروازے پر بیٹھ کر اپنے دانہ پانی کی پیالیوں کو دیکھتا۔ مگر جونہی مہادیو اس کی طرف آتا۔ وہ پھر اڑ جاتا۔ بڈھا اگر پیکر ہوس تھا تو طوطا طائر آرزو۔ یہاں تک کہ شام سیاہ نے ہوس اور آرزو کی اس کش مکش پر پردہ ڈال دیا *

(۳)

رات ہو گئی۔ چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔ طوطا معلوم نہیں۔ پتوں میں کہاں

چھپا بیٹھا تھا ۔ مہادیو خوب جانتا تھا کہ رات کو طوطا کہیں اُڑ کر نہیں جا سکتا اور نہ پنجرے میں آ سکتا ہے ۔ تاہم وہ اس درخت کے نیچے سر جھکائے پنجرے کو پہلو میں رکھے بیٹھا ہوا تھا ۔ آج اُس نے دن بھر کچھ نہیں کھایا ۔ رات کے کھانے کا وقت بھی نکل گیا ۔ ایک بوند پانی بھی اس کے حلق میں نہیں گئی ۔ لیکن اُسے نہ بھوک تھی نہ پیاس ۔ طوطے کے بغیر اُسے اپنی زندگی ویران ۔ خشک دشوار معلوم ہوتی تھی ۔ وہ شب و روز مشقت کرتا تھا ۔ اس لئے کہ یہ اس کی تحریک طبعی تھی ۔ زندگی کے اور سب کام اس لئے کرتا تھا کہ اس کی عادت تھی ۔ ان کاموں میں اسے حیات کا مطلق احساس نہ ہوتا تھا ۔ طوطا ہی ایک ایسی چیز تھا ۔ جو اُسے اس کی حیات کی یاد دلاتا تھا ۔ عملاً وہ ایک مردہ وجود تھا ۔ کوئی شوق نہیں ۔ کوئی آرزو نہیں ۔ کوئی فکر نہیں ۔ کوئی ہوس نہیں ۔ اس حیات مطلق میں یہی طائر خوش رنگ و خوش نوا اسے علائق زیست کی خبر دیتا تھا ۔ اس تاریکی میں یہی ایک روشنی تھی ۔ اس سناٹے میں یہی ایک صدا ۔ اس کا ہاتھ سے جانا اپنے وجود سے بے خبر ہونا تھا ۔

مہادیو دن بھر کا بھوکا پیاسا تھکا ماندہ رہ رہ کر جھپکیاں لے لیتا تھا ۔ مگر ذرا ہی دیر میں وہ چونک کر پھر آنکھیں کھول دیتا ۔ اور اس فضاء تاریک میں اس کی آواز سنائی دیتی ۔ "ست گرُدت شیودت داتا" ۔

آدھی رات گزر گئی تھی ۔ یک بارگی وہ کوئی آہٹ پاکر چونکا ۔ تو دیکھا ۔ کہ ایک دوسرے درخت کے نیچے ایک دھندلا سا چراغ جل رہا ہے اور کئی آدمی بیٹھے ہوئے آپس میں آہستہ آہستہ کچھ باتیں کر رہے ہیں ۔ وہ سب شاید چلم پی رہے تھے تمباکو کی مہک نے مہادیو کو بے تاب کر دیا ۔ بلند آواز سے بولا ۔ "ست گرُدت شیودت داتا" ۔ اور ان آدمیوں کی طرف چلا ۔ مگر جس طرح بندوق کی آواز سنتے ہی ہرن بھاگ جاتے ہیں ۔ اسی طرح وہ سب کے سب اٹھ کر بھاگے ۔ کوئی اِدھر

گیا۔ کوئی اُدھر۔ مہادیو نے زور زور سے پکارنا شروع کیا۔ ٹھہرو! ٹھہرو! دفعتہً اسے خیال آ گیا کہ یہ سب چور ہیں۔ وہ زور سے چلّانے لگا۔ چور چور! پکڑو! چوروں نے پیچھے پھر کر بھی نہ دیکھا۔

مہادیو چراغ کے پاس گیا۔ تو اُسے ایک کلسا رکھا ہوا ملا۔ وہ زنگ سے سیاہ ہو رہا تھا۔ مہادیو کا سینہ اُچھلنے لگا۔ اُس نے کلسے میں ہاتھ ڈالا تو اشرفیاں تھیں۔ اس نے ایک اشرفی باہر نکالی۔ اور چراغ کے اُجالے میں غور سے دیکھا ہاں اشرفی تھی۔ اس نے کلسا اٹھا لیا۔ چراغ بجھا دیا۔ اور درخت کے نیچے چھپ کر بیٹھ رہا۔ مال حرام نے شاہ سے چور بنا دیا۔

اُسے پھر اندیشہ ہوا کہ ایسا نہ ہو چور واپس آ جائیں۔ اور مجھے تنہا دیکھ کر کلسا چھین لیں۔ اس نے کچھ اشرفیاں نکال کر کمر میں باندھیں۔ پھر ایک سُوکھی لکڑی سے زمین کی مٹی ہٹا کر کئی جگہ گڑھے بنائے اور انہیں اشرفیوں سے بھر کر مٹی سے ڈھانک دیا۔ اور حالانکہ ابھی زیادہ تعداد کلسے ہی میں تھی۔ لیکن اس کی کمر اور گڑھوں میں دو سو سے کم نہ تھیں۔

(۴)

مہادیو کی نظروں کے سامنے اب ایک دوسری دُنیا تھی۔ نامی روشن۔ ذی حیات۔ فکریں۔ تمنائیں اور ارادے اُگے بڑھے اور لہرانے لگے۔ افلاس کی سیاہ گھٹا ہٹتے ہی بزمِ انجم آراستہ نظر آئی۔ حالانکہ ابھی خزانے کے ہاتھ سے نکل جانے کا اندیشہ باقی تھا۔ پرنامیہ کو معترض گلچیں کی کیا پروا؟ ایک پختہ مکان بن گیا۔ صرافہ کی ایک شاندار دکان کھل گئی۔ عزیز و بیگانہ گلوگیر ہو گئے۔ بادۂ گلگوں کے دور چلنے لگے۔ عیش و تکلف کے سامان فراہم ہو گئے۔ پھر تیرتھ جاترا کو چلے۔

اور واپسی پر فیاضانہ دعوت عام ہونے لگی - اس کے بعد ایک شوالہ اور پختہ کنواں تعمیر ہو گیا - اور وہ روز شام کو بیٹھ کر وہاں کتھا پران سننے لگا - سادھو سنتوں کی محفل سج گئی - دورۂ زندگی کا نقشہ مکمل ہو گیا "آنندہ" کا ساز نغمہ ریز ہو گیا -

دفعتہً اُسے خیال آیا کہ کہیں چور نہ آ جائیں - تو میں کلسا لے کر بھاگوں گا کیونکر؟ اس نے امتحاناً کلسے کو بغل میں دبا لیا - اور ایک دو سو قدم تک بے تحاشا دوڑا ہوا چلا - معلوم ہوتا تھا - اس کے پیروں میں پر لگ گئے ہیں - اطمینان ہو گیا +

انہیں منصوبوں میں رات ختم ہو گئی - سفیدۂ صبح نمودار ہو گیا - ہوا جاگی - سوئے ہوئے درخت بیدار ہوئے - چڑیاں گانے لگیں - ناگاہ مہادیو کے کانوں میں آواز آئی :-

" ست گُروت شیو دت داتا - رام کے چرن میں چت لاگا "

یہ بول ہمیشہ مہادیو کے ورد زبان رہتا تھا - دن میں ہزاروں بار یہ الفاظ اُس کی زبان سے نکلتے تھے - پر ان کی باطنی کیفیت نے اس کے دل پر کبھی اثر نہ کیا تھا - جیسے کسی باجے سے آواز نکلتی ہے - اسی طرح یہ پد اس کی زبان سے نکلتا تھا - بے معنی اور بے اثر - اس کا دل بے برگ و بار اس ہوائے لطیف سے بے حس رہتا تھا - لیکن اب اس میں پتیاں اور کونپلیں نکل آئیں تھیں - اس ہوا سے جھوم اُٹھا - محو ترنم ہو گیا +

ایک طرف طلوع سحر کی معرفت تنویر تھی - دوسری طرف دریا کا روحانی نغمہ اور سطح آب کا عارفانہ سکون - فضائے محیط ایک نورانی راگ میں ڈوبی ہوئی تھی - عین اسی وقت طوطا شاخ بلند سے پروں کو جوڑے ہوئے اترا - جیسے آسمان سے کوئی تارا ٹوٹے - اور آ کر پنجرے میں بیٹھ گیا - مہادیو فرط مسرت سے دوڑا - اور پنجرے کو اٹھا کر بولا " آؤ آتما رام! اب تمہیں چاندی کے پنجرے میں رکھوں گا -

اور سونے سے مڑھ دونگا۔ احسان اور تشکر سے اس کا سینہ لبریز ہوگیا۔ پرماتما کتنا دیا وان ہے۔ کتنا بے کس نواز۔ یہ اس کی عین رحمت ہے۔ ورنہ مجھ جیسا عاصی۔ سرتا پا گناہوں میں ڈوبا ہوا۔ کب اس عطاء بے کراں کے قابل تھا؟ ہاں یہ اُس کا فضل و کرم ہے۔ ان خیالات سے اس کا دل امڈ آیا۔ اس پر ایک سرور کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ وہ ایک خودمستی کے عالم میں بول اُٹھا +

"ست گرُدت شیودت داتا۔ رام کے چرن میں چت لاگا"

اس نے ایک ہاتھ میں پنجرا لٹکایا۔ بغل میں کلسا دبایا گھر چلا +

(۵)

مہادیو اپنے مکان پر پہنچا۔ تو ابھی کچھ اندھیرا تھا۔ گھر کے لوگ خواب سحر کا لطف اٹھا رہے تھے۔ راستے میں بجز ایک کُتے کے اور کسی سے اس کی مڈبھیڑ نہ ہوئی۔ اور کُتے کو اشرفیوں سے کوئی خاص رغبت نہیں ہوتی۔ گھر پہنچتے ہی اس نے کلسے کو ایک مٹی کی ناند میں چھپا دیا۔ اور اسے کوئلہ سے اچھی طرح ڈھانک کر اس کوٹھڑی میں رکھ دیا۔ جس میں اس کے اوزار اور نیم مرتب زیورات رکھے جاتے تھے۔ جب ذرا دن نکل آیا۔ تو وہ سیدھا پروہت جی کے مکان پر جا پہنچا۔ پروہت جی پوُجا پر بیٹھے ہوئے سوچ رہے تھے۔ کل ہی مقدمہ کی پیشی ہے۔ اور ابھی تک روپیہ کی کوئی سبیل نہ کر سکا۔ کیونکر کام چلے گا۔ ججمانوں میں کوئی سانس ہی نہیں لیتا کہ اتنے میں مہادیو نے پہنچ کر پالاگن کیا۔ پروہت جی نے اسے دیکھ کر منہ پھیر لیا۔ یہ اپنی منحوس صورت لے کر یہاں کیونکر آ کھڑا ہوا؟ معلوم نہیں آج دانہ بھی میسر ہوگا یا نہیں۔ کچھ ترش ہو کر پوُچھا "کیا ہے جی! کیا کہتے ہو! کیا جانتے نہیں کہ ہم اس بکھت پوجا پر رہتے ہیں"؟ مہادیو نے کہا۔ "مہاراج

آج میرے یہاں ستیہ نارائن کی کتھا ہے"۔

پروہت جی متحیر ہو گئے۔ انہیں اپنے کانوں پر اعتبار نہ آیا۔ مہادیو کے گھر کتھا کا ہونا اتنی ہی غیر معمولی بات تھی۔ جتنی اپنے گھر سے کسی بھکاری کے لئے بھیک کا نکلنا۔ پوچھا "آج کیا ہے؟"

مہادیو بولا "کچھ نہیں۔ ایسا ہی جی میں آیا کہ آج بھگوان کی کتھا سن لوں"۔

صبح ہی سے تیاریاں ہونے لگیں۔ بیندو اور قرب و جوار کے دوسرے موضعوں میں نویدیں پھری۔ ہر کس و ناکس خاص و عام کی دعوت تھی۔ جو سنتا تھا۔ تعجب کرتا تھا۔ لیکن تیاریاں اتنے وسیع پیمانہ پر ہو رہی تھیں کہ کسی کو شک و شبہ کی مطلق گنجائش نہ تھی۔ شام کو جب سب لوگ جمع ہو گئے اور پنڈت جی آ کر سنگھاسن پر رونق افروز ہوئے۔ تو مہادیو کھڑا ہو کر بلند آواز سے بولا "بھائیو! میری ساری عمر چھل کپٹ میں بیت گئی۔ میں نے نہ جانے کتنے آدمیوں کو دگا دی۔ کتنا کھرے کو کھوٹا کیا۔ یہاں تک کہ آپ لوگ صبح کو میرا منہ دیکھتے ہوئے ڈرتے تھے۔ پر اب بھگوان نے مجھ پر دیا کی ہے۔ وہ منہ کے کالک کو دور کرنا چاہتے ہیں۔ میں آپ سب بھائیوں سے للکار کر کہتا ہوں کہ جس کا میرے جمے کچھ نکلتا ہو جس کی جمع میں نے مار لی ہو۔ جس کے گہنے دبا لئے ہوں۔ جس کے چوکھے مال کو کھوٹا کر دیا ہو۔ وہ اپنے ایمان دھرم سے آ کر مجھ سے اپنی ایک ایک کوڑی چکا لے۔ اگر کوئی یہاں نہ آ سکا ہو۔ تو آپ لوگ اس سے کہہ دیجئے کہ وہ کل سے ایک مہینے تک جب جی چاہے آوے اور اپنا حساب چکتا کر لے۔ کوئی گواہی ساکھی درکار نہیں۔ بس لوگ اپنے ایمان دھرم سے جو کچھ کہہ دیں گے وہ میں نکال کر دے دونگا"۔

اس تقریر نے مجمع پر سکوت کی کیفیت طاری کر دی۔ سرگوشیاں ہونے

لگیں۔ کوئی پُر معنی انداز سے سر ہلا کر کہتا تھا "ہم کہتے نہ تھے؟" کوئی حاسدانہ انداز سے کہتا تھا "کوئی دفینہ ہاتھ آگیا"۔ کوئی بدگمانی سے کہتا تھا "کیا کھا کے دے گا۔ ہزاروں کا ٹوٹل ہو جائے گا"۔

ایک زندہ دل ٹھاکر نے مسکرا کر مہادیو سے پُوچھا۔" اور جو لوگ مر گئے؟"

مہادیو نے جواب دیا۔"ان کے گھر والے تو ہوں گے۔ وہ آ کر ایمان دھرم سے جو کچھ نکلتا ہو لے لیں"۔

مگر اس وقت کسی کو وصولی کی اتنی فکر نہ تھی۔ جتنی یہ جاننے کی کہ اسے اتنے روپے مل کہاں سے گئے۔ کچھ دیر تک یہی عالم سکوت رہا۔ لوگ ایک دوسرے کا منہ تاکتے تھے۔ ہر کسی کو مہادیو کے پاس آنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ دیہات کے آدمی تھے۔ جس نقصان کو ایک بار صبر کر چکے۔ اس کی یاد تازہ کرنا انکا خاصہ نہ تھا۔ پھر اکثر آدمیوں کو یاد بھی نہ تھا کہ ان کا کتنا نقصان ہوا۔ اور ایسے مقدس موقع پر غلط بیانی کا خوف ان کی زبان بند کئے ہوئے تھا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی۔ کہ مہادیو کی علو ہمتی اور نیک نیتی نے انہیں مرعوب کر لیا تھا۔

بحرِ سکوت میں ایک موج بھی نہ اُٹھی۔ دفعتہً پروہت جی بولے "تمہیں یاد ہے کہ میں نے تمہیں ایک کنٹھا بنانے کے لئے سونا دیا تھا اور تم نے کئی ماشے تول میں اڑا دیئے تھے۔ سونا بھی خراب کر دیا تھا"۔

مہادیو۔ ہاں یاد ہے۔ آپ کا کتنا نکسان ہوا ہوگا؟

پروہت جی۔ پچاس روپیہ سے کم نہ ہوگا۔

مہادیو نے کمر سے دو اشرفیاں نکالیں۔ اور جا کر پروہت جی کے سامنے رکھ دیں۔

پنڈت جی کی سخت گیری پر پھر سرگوشیاں ہونے لگیں۔ یہ ظلم ہے۔ زیادتی

ہے۔ زیادہ سے زیادہ دو چار روپے کا نقصان ہوا ہوگا۔ اس کے پچاس روپے اینٹھ لئے۔ کچھ نارائن کا بھی ڈر نہیں ہے۔ بننے کو پنڈت پر نیت ایسی خراب! رام! رام!!

ہر ایک دل میں مہادیو سے وہ ہمدردی پیدا ہوگئی۔ جو عقیدت سے مشابہ ہوتی ہے۔ اشرفیوں کی خوش آئند آواز نے بعض کمزور دلوں کو گدگدایا ضرور۔ پر عام ہمدردی اور خوف پشیمانی نے اس گدگدی کو سینہ ہی میں دبا دیا۔

ایک گھنٹہ گزر گیا۔ پر ہزاروں نفوس کے مجمع میں ایک شخص بھی نہ کھڑا ہوا۔ تب مہادیو نے پھر کھڑے ہو کر کہا "معلوم ہوتا ہے۔ آپ لوگ اپنا اپنا حساب بھول گئے ہیں۔ اس لئے آج کتھا ہونے دیجئے۔ میں ایک مہینہ تک آپ لوگوں کی راہ دیکھوں گا۔ اس کے بعد تیرتھ کرنے چلا جاؤنگا۔ آپ سب بھائیوں سے بینتی ہے کہ میرا ادھار کریں"۔

مہادیو کے چہرے پر ایک غیر معمولی جلال تھا۔ اور انداز گفتگو میں ایک شان توقیر۔ کتھا شروع ہوئی۔ اور ختم ہوگئی۔ مہادیو کی داد و دہش اور فیاضانہ سرگرمی نے لوگوں کی عقیدت کو احترام کی حد تک پہنچا دیا۔

مہادیو صبح سے شام تک اہل تقاضا کی راہ دیکھا کرتا۔ رات کو چوروں کے خوف سے نیند نہ آتی۔ اب وہ کوئی کام نہ کرتا۔ شراب کا چسکا بھی چھوٹا۔ ہاں سادھو فقیر جو دروازہ پر آجاتے۔ ان کی خاطر خواہ تواضع و تکریم کرتا۔ قرب و جوار میں اس کے بذل و ایثار کا شہرہ ہوگیا۔ یہاں تک کہ پورا ایک مہینہ گزر گیا۔ اور ایک دادخواہ بھی نظر نہ آیا۔ اب مہادیو کو اندازہ ہوگیا کہ دنیا میں کتنا تحمل کتنی پاک ہمتی ہے۔ اب اسے معلوم ہوا کہ دنیا بروں کے لئے بری ہے پر اچھوں کے لئے اچھی ہے۔

(۶)

اس واقعہ کو گزرے پچاس سال سے زائد ہو گئے۔ بیندو میں آپ جائیے تو دور ہی سے ایک رفیع اور طلائی کنگرہ نظر آتا ہے۔ یہ ٹھاکر دوارہ کا کلس ہے اس کے متصل ایک وسیع اور پختہ تالاب ہے۔ جس میں ہمیشہ کنول کھلے رہتے ہیں اس کی مچھلیاں کوئی نہیں پکڑتا۔ تالاب کے کنارے ایک عالی شان مقبرہ ہے یہی آتمارام کی یادگار ہے۔ اس جگہ وہ اپنے نقرئی پنجرے میں بیٹھے ہوئے محوِ خواب ہیں۔ ان کی نسبت مختلف روائیتیں مشہور ہیں۔ کوئی کہتا ہے۔ وہ بیٹھے نظروں سے غائب ہو گئے۔ پر حقیقت یہ ہے کہ مہادیو تیرتھ سے واپس آیا۔ تو ایک دن کسی گربۂ مسکین نے آتمارام کو لقمۂ دہن بنالیا۔ لوگ کہتے ہیں کہ اب بھی آدھی رات کو تالاب کے کنارے آواز آتی ہے:-

ست گُرُ دت شیو دت داتا

رام کے چرن میں چت لاگا

مہادیو کی نسبت بھی طرح طرح کے قصے مشہور ہیں۔ جن میں سب سے قرینِ قیاس یہ ہے کہ وہ آتمارام کے قفسِ عنصری سے پرواز کرنے کے بعد چند سنیاسیوں کے ساتھ ہمالہ کی طرف چلے گئے اور وہاں سے واپس نہ آئے۔ ان کا نام آتمارام مشہور ہو گیا۔

ابھی گاؤں میں وہ بڈھے موجود ہیں۔ جنہوں نے مہادیو کو آخری ایام میں دیکھا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ ان کا چہرہ پُرجلال تھا اور ان کی زبان سے جو کچھ نکلتا۔ وہ ضرور پورا ہوتا تھا۔ ان کے کشف و کرامات کی صدہا داستانیں زبان زد خاص و عام ہیں۔

خدا کے کتنے گنہگار بندے محض ایک صدائے غیب کی بدولت محض ایک اتفاقی وجد کے اثر سے محض ایک الہامی تحریک سے درجۂ کمال کو پہنچ گئے ہیں ٭

ایمان کا فیصلہ

(۱)

کان پور کے ضلع میں پنڈت بھرگودت مصر ایک بڑے زمیندار تھے۔ منشی ست نرائن لال ان کے مختارِ عام تھے۔ ساری ریاست کا سیاہ و سفید ان کے ہاتھ میں تھا۔ بڑے آقا پرست متدین آدمی تھے۔ لاکھوں روپیہ کا تحصیل وصول اور ہزاروں من غلہ کا لین دین انجام دیتے تھے۔ اور سارا انتظام اس خوب صورتی سے کرتے کہ ریاست روز بروز بڑھتی جاتی تھی۔ ایسے وفاکیش ملازم کی جتنی عزت ہونی چاہیئے تھی وہ ہوتی تھی۔ شادی و غم کی ہر ایک تقریب میں پنڈت جی ان کے ساتھ بڑی سیرچشمی سے پیش آتے تھے۔ رفتہ رفتہ ان پر اتنا اعتبار ہو گیا کہ

کاغذات کا سمجھنا بھی ترک کر دیا۔ خانگی مصارف کا حساب تک منشی جی کے ذمہ کر دیا گیا اسی اثنا میں پنڈت جی مرگ بے ہنگام کے شکار ہوئے۔ گنگا نہانے گئے تھے۔ معلوم نہیں کسی گڑھے میں پھسل پڑے یا کوئی جانور کھینچ لے گیا۔ ان کا پھر پتہ نہ چلا *

اب منشی ست نرائن لال کے اختیارات اور بھی وسیع ہوئے۔ بجز ایک بیوہ عورت اور دو تین چھوٹے چھوٹے بچوں کے خاندان میں اور کوئی نہ تھا مراسم وفات سے فرصت پانے کے بعد ایک روز بدنصیب بھان کنور نے انہیں بلایا اور رو کر بولی "لالہ سوامی جی تو ہمیں منجدھار میں چھوڑ کر چلے گئے۔ اب ڈونگا تمہیں پار لگاؤ۔ تو لگ سکتا ہے۔ یہ سب کھیتی تمہاری لگائی ہوئی ہے۔ اسے تمہارے اوپر چھوڑتی ہوں۔ یہ تمہارے بچے ہیں۔ ان کا منہ دیکھو۔ جب تک تمہارے مالک جئے تمہیں اپنا بھائی سمجھتے رہے۔ مجھے بھروسا ہے کہ تم اسی طرح اس بوجھ کو سنبھالے رہو گے"۔

ست نارائن لال نے روتے ہوئے جواب دیا "بھابی! بھیا کیا اٹھ گئے میری تقدیر پھوٹ گئی۔ نہیں تو مجھے آدمی بنا دیتے۔ میں انہیں کا جلایا جیا ہوں اور انہیں کی چاکری میں مروں گا۔ آپ اطمینان رکھیں۔ کسی طرح اندیشہ نہ کریں۔ میں مرتے دم تک آپ کا حق نمک ادا کروں گا۔ آپ صرف اتنا کیجئے گا کہ میں کارندہ یا ملازم کی آپ سے شکایت کروں۔ اس کی تنبیہہ ضرور کر دیجئے گا۔ ورنہ یہ لوگ شیر ہو جائیں گے *

(۲)

اس حادثہ کے بعد کئی سال تک منشی ست نرائن لال نے اس ریاست کو

سنبھالا۔ کبھی کسی معاملہ میں ایک کوڑی کا بَل نہیں پڑا۔ سارے ضلع میں انہیں کا رسوخ تھا۔ لوگ پنڈت جی مرحوم کو بھول سے گئے۔ درباروں میں کمیٹیوں میں انہیں کو دعوت ملتی۔ حکام ضلع ان سے اس طرح پیش آتے۔ گویا وہ زمیندار ہیں۔ ضلع کے دیگر رؤسا ان کا ادب اور لحاظ کرتے۔ مگر روز افزوں دقار اور رسوم کے ساتھ مصارف بھی بڑھتے جاتے تھے اور بھان کنور دوسری عورتوں کی طرح جُز رس تھی۔ انسانی طبائع کی پیچیدگیوں سے واقف نہ تھی۔ پنڈت جی مرحوم ہمیشہ انہیں انعام و اکرام عطا کرتے رہتے تھے۔ اور عنایات کا یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہتا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ روحانی طاقت کے بعد ایمان کا دوسرا ستون فارغ البالی ہے۔ اس کے سوا وہ خود کبھی کبھی کاغذات کی جانچ کر لیا کرتے تھے۔ برائے نام ہی سہی۔ مگر اس سے نگرانی کا خوف بنا رہتا تھا۔ کیونکہ طبعی خیانت کے بعد ایمان کا سب سے بڑا دشمن موقع ہے۔ بھان کنور یہ پیچکے نہ جانتی تھی۔ موقع اور احتیاج جیسے مہلک دشمنوں کے نرغہ میں پڑ کر منشی کی دیانت کیونکر جانبر ہو سکتی تھی؟

کان پور شہر سے متصل ایک بہت آباد اور زرخیز موقع تھا۔ عین گنگا کے کنارے۔ پنڈت جی اس گاؤں کی حسرت لیئے ہوئے دنیا سے کوچ کر گئے۔ پختہ گھاٹ اور مندر اور باغ اور بنگلہ کی آرزو دل ہی میں رہی۔ اتفاق سے اب یہ موضع بیع ہوا۔ اس کے زمیندار ایک ٹھاکر صاحب تھے۔ کسی فوجداری کے معاملہ میں ماخوذ ہو گئے تھے۔ مقدمہ کی پیروی کے لئے زر نقد کی اشد ضرورت تھی۔ منشی جی اپنے منصبی فرائض کے سلسلہ میں کچہری گئے ہوئے تھے۔ ٹھاکر صاحب نے اس کا ذکر کیا۔ منشی جی کو منہ مانگی مراد ملی۔ اسی وقت مول تول ہوا۔ بیعنامہ لکھا گیا۔ رجسٹری ہوئی۔ داخل خارج کی درخواست پیش ہو گئی۔ گو روپے موجود نہ تھے۔ مگر شہر میں ساکھ تھی۔ ایک مہاجن سے رقعہ لکھ کر بیس ہزار روپے منگوائے اور ٹھاکر صاحب

کے نذر کیئے۔ ہاں سہولیت کے خیال سے یہ سب معاملہ اپنے ہی نام سے طے کیا۔ کیونکہ نابالغوں کے نام سے بیع کرانے میں قانونی پیچیدگیاں پیدا ہوتیں۔ اور تاخیر سے شکار ہاتھ سے نکل جاتا ۔

منشی جی اس دن خوش خوش بیعنامہ لیئے ہوئے بھان کنور کے پاس آئے۔ پردہ کرایا۔ اور جاکر یہ مژدہ جانفزا سنایا۔ بھان کنور نے آنسوؤں سے شکریہ ادا کیا۔ پنڈت جی کے نام پر پختہ گھاٹ۔ مندر اور بنگلہ بنوانے کی یاد تازہ ہو گئی۔ منشی ست نرائن لعل دوسرے دن اس موضع میں گئے۔ اسامی حاضر ہوئے۔ نذریں گزاریں۔ ایک پرتکلف دعوت دی گئی۔ حکام اور روساء شہر مدعو ہوئے۔ اور کشتیوں کی خوب سیر رہی ۔

(۳)

حالانکہ اس موضع کو اپنے نام سے خریدتے وقت منشی کے دل میں دغا کا ذرا بھی خیال نہ تھا۔ لیکن دو ہی چار دنوں میں اس کے اکھوے نکل آئے۔ اس موضع کے آمد و خرچ کا حساب وہ علیحدہ لکھا کرتے اور اُسے اپنی مالکن کو سمجھانے کی مطلق ضرورت نہ سمجھتے۔ بھان کنور بھی ان معاملات میں زیادہ دخل دینا مصلحت کے خلاف سمجھتی تھی۔ اس معاملہ میں بالخصوص اسے منشی کے جذبات کا بہت زیادہ لحاظ تھا کہ کہیں انہیں یہ اندیشہ نہ ہو کہ میں ان سے بدگمان ہوں ۔

اس طرح کئی سال گزر گئے۔ اور اب رفتہ رفتہ دونو فریق کے دلوں میں چور بیٹھا۔ بھان کنور کو خوف ہوا کہ کہیں یہ سارے کا سارا موضع ہضم کرنے کی فکر میں تو نہیں ہیں۔ ادھر قانونی طاقت منشی جی کے اخلاقی احساس پر غالب آئی۔ انہوں نے اپنے دل میں فیصلہ کیا کہ موضع میرا ہے۔ زیادہ سے زیادہ میں بیس ہزار کا مقروض ہوں۔ کوئی بہت کرے گا اپنے روپے لے لے گا۔ اس کے سوا کوئی

کیا کر سکتا ہے؟ مگر یہ آگ اندر ہی اندر سلگتی رہی۔ منشی جی پیش قدمی کے انتظار میں مسلح بیٹھے تھے اور بھان کنور موقع کی منتظر تھی۔ ہاں تیر و تفنگ سے محترز رہنا چاہتی تھی +

ایک روز اس نے منشی جی کو اندر بلا کر کہا "لالہ جی۔ برگدا میں مندر کا کام کب سے شروع ہوگا۔ اُسے لیئے ہوئے آٹھ سال ہو گئے۔ اب کام لگ جائے تو اچھا ہو۔ زندگی کا کیا اعتبار ہے۔ جو کام کرنا ہے اُسے کر ہی ڈالنا چاہیئے"+

حملہ کا آغاز نہایت خوش اسلوبی سے ہوا۔ منشی جی بھی دل میں اس کے قائل ہو گئے۔ ذرا سوچ کر بولے۔ ارادہ تو میرا کئی بار ہوا۔ مگر موقع کی زمین نہیں ملتی۔ گنگا کے کنارے کی ساری زمین اسامیوں کی جوت میں ہے اور وہ اسے کسی طرح چھوڑنے پر راضی نہیں ہوتے"+

بھان کنور۔ یہ بات تو مجھے آج معلوم ہوئی۔ آٹھ سال ہوئے اس گاؤں کا آپ نے کبھی بھولے سے بھی تو ذکر نہیں کیا۔ معلوم نہیں کتنی تحصیل ہے۔ کتنا منافع۔ کیسا گاؤں ہے۔ کچھ سیر ہوتی ہے یا نہیں۔ جو کچھ کرتے ہیں آپ ہی کرتے ہیں۔ اور کرینگے۔ لیکن کچھ مجھے بھی تو معلوم ہونا چاہیئے۔ منشی جی سنبھل بیٹھے۔ مبارزانہ پیش قدمی شروع ہو گئی۔ بولے۔ آپ کو اس سے کچھ تعلق نہ تھا۔ اس لئے میں نے خواہ مخواہ آپ کو دق کرنا مناسب نہ سمجھا"+

بھان کنور کو سکتہ سا ہو گیا۔ پردہ سے باہر ہو گئی۔ اور منشی جی کی طرف دیکھ کر پوچھا "یہ آپ کیا کہتے ہیں۔ آپ نے گاؤں میرے لئے لیا تھا۔ یا اپنے لئے؟ روپیہ میں نے دیا۔ یا آپ نے؟ اس پر جو خرچ پڑا۔ وہ میرا یا آپ کا؟ مجھے یقین نہیں آتا۔ کہ آپ اس وقت ہوش میں ہیں"؟

ستّ نرائن لال نے سُن کر جواب دیا۔ یہ تو آپ جانتی ہی ہیں کہ موضع

میرے نام سے بیع ہوا۔ روپیہ ضرور آپ کا لگا۔ مگر اس کا میں دیندار ہوں۔ رہا تحصیل وصول کا خرچ۔ یہ سب میں نے ہمیشہ اپنی جیب سے کیا ہے۔ اس کا حساب کتاب۔ آمد و خرچ ہمیشہ الگ رکھتا گیا ہوں"۔

بھان کنور نے غصہ سے بل کھا کر کہا۔" اس دغا کا پھل آپ کو ضرور ملیگا۔ آپ اس طرح میرے بچوں کا گلا نہیں کاٹ سکتے۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ آپ نے پیٹ میں یہ چھری چھپا رکھی ہے۔ نہیں تو یہ نوبت ہی کیوں آتی؟ خیر اب سے میرا اور کرڑ اور کا غذات آپ کچھ نہ چھوئیں۔ میرا جو کچھ ہو گا۔ میں آپ سے لے لوں گی"۔

یہ کہہ کر بھان کنور پھر پردہ کی آڑ میں آ بیٹھی۔ لالہ صاحب کو کوئی جواب نہ سوجھا۔ خفیف ہو کر وہاں سے اٹھ آئے۔ اور دفتر میں جا کر کچھ کاغذات الٹ پلٹ کرنے لگے۔ مگر بھان کنور ان کے پیچھے پیچھے مردانے میں چلی آئی اور ڈانٹ کر بولی"۔ میرا کوئی کاغذ مت چھونا۔ ورنہ برا ہو گا۔ تم زہر بھرے ہوئے سانپ ہو۔ میں تمہارا منہ دیکھنا نہیں چاہتی"۔

لالہ صاحب کاغذوں میں کچھ ترمیم کرنا چاہتے تھے۔ مگر یہ حسرت دل ہی میں رہ گئی۔ خزانہ کی کنجی نکال کر پھینک دی۔ بہی کھاتے پٹک دئے۔ کواڑ دھڑاکے کے ساتھ بند کیا۔ اور ہوا کی طرح سن سے باہر نکل گئے۔

دوسرے مختاروں کارندوں نے یہ کیفیت سنی۔ تو پھولے نہ سمائے۔ منشی ست نرائن کے سامنے ان کی دال نہ گلنے پاتی تھی۔ آکر آگ پر تیل چھڑکنے لگے۔ نمک عجیب چیز ہے۔ پھوٹ کر نکلے گا۔

طرفین سے مقدمہ بازی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ ایک طرف قانون کا قالب تھا۔ دوسری جانب قانون کی روح مادہ کی روح سے پیکار کرنے کا حوصلہ

ہُوا تھا۔

بھان کنور نے منشی جھکن لال سے پُوچھا۔ "ہمارا وکیل کون ہے"؟
جھکن لال نے اِدھر اُدھر جھانک کر کہا۔ "وکیل تو سیٹھ جی تھے۔ مگر ست نرائن لال نے انہیں پہلے ہی گانٹھ رکھا ہے۔ اس مقدمہ کے لئے بہت ہوشیار آدمی درکار ہے مہرا بابو کی آج کل خوب چل رہی ہے۔ حاکموں کے قلم پکڑ لیتے ہیں۔ بولتے ہیں تو جیسے موٹر کار چھوٹ گیا۔ حضور! اور کیا کہوں۔ مجرموں کو پھانسی سے اتار لیا ہے۔ ان کے سامنے کوئی وکیل تو زبان کھول ہی نہیں سکتا۔ حضور فرمائیں تو انہیں کو کر لیا جائے"۔

اس طولانی تمہید کا اثر کچھ نہ ہوا۔ بھان کنور نے کہا۔ "پہلے سیٹھ جی سے پُوچھ لیا جائے۔ اس کے بعد دیکھا جائے گا۔ آپ جائیے اور انہیں بُلا لائیے"۔ جھکن لال نے زیادہ حیل و حجت نہیں کی۔ سیٹھ جی کے پاس جا کر پیغام دیا۔ سیٹھ جی پنڈت بھرگو دت کے زمانہ سے یہاں کے قانونی مشیر تھے۔ مقدمہ کی کیفیت سُنی۔ تو حیرت میں آ گئے۔ ست نرائن لال کو وہ نیک نیت آدمی سمجھتے تھے۔ اسی وقت آئے۔ بھان کنور نے خود ان سے مقدمہ کی روداد بیان کی اور ان پر اپنے بچوں کے بہت حقوق جتانے کے بعد اس معاملے کو فوراً ہاتھ میں لینے کی استدعا کی۔ سیٹھ جی نے باہمی مصالحت کا ذکر کیا۔ بھان کنور پھر پردہ کے باہر نکل آئی۔ اور بولی "نہیں۔ کبھی نہیں۔ میں صلح نہ کروں گی۔ آپ کاغذات دیکھیں۔ میرے بچوں کی خاطر تکلیف اٹھائیں۔ ست نرائن کی نیت پہلے خراب نہ تھی۔ تھوڑے دنوں سے اس کی یہ حالت ہوئی ہے۔ دیکھئے جس تاریخ کو گاؤں بیع ہُوا تھا۔ اس مِتی میں ۲۲ ہزار کا خرچ دکھایا گیا ہے۔ اس نے اپنے نام قرض لکھا ہو تو دیکھئے۔ سالانہ سُود ادا ہوا ہے یا نہیں۔ ایسے دغاباز آدمی سے میں صلح

کروں گی؟

اس میں کچھ نکتہ ہو یا نہ ہو۔ مگر جو عورت کبھی ان معاملات کے قریب نہیں گئی۔ اس کی قانونی گرفت واقعی حیرت انگیز تھی۔ یہ اس دُھن کی برکت تھی۔ جو اس وقت بھان کنور کے سر پر سوار تھی۔ خلاصہ یہ کہ کاغذات کی جانچ ہوئی۔ ثبوت بہم کئے گئے۔ اور استغاثہ کی تیاریاں مکمل ہو گئیں ٭

(۴)

منشی ست نرائن لال غصہ میں بھرے ہوئے مکان پر پہنچے۔ لڑکے نے مٹھائی کے لئے ضد کی۔ اسے پیٹا۔ بیوی پر اس لئے برس پڑے کہ اس نے کیوں لڑکے کو رُلایا۔ اپنی بوڑھی ماں کو ڈانٹا۔ تم سے اتنا بھی نہیں ہو سکتا کہ ذرا لڑکے کو بہلاؤ۔ اب میں گھر پر آؤں تو بیٹھ کر لڑکے کو کھلاؤں مجھے دنیا میں نہ اور کوئی کام ہے نہ اور کوئی فکر۔ اس طرح گھر میں ایک طوفان برپا کر کے وہ باہر آئے۔ اور سوچنے لگے۔ مجھ سے بڑی غلطی ہوئی۔ میں بھی کیسا احمق ہوں۔ اتنے دنوں تک سارے کاغذ اپنے ہاتھ میں تھے۔ جو چاہتا کر سکتا تھا۔ مگر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہا۔ آج جب سر پر آ پڑی تو سُوجھی۔ میں چاہتا تو نئے بہی کھاتے بنا سکتا تھا۔ جس میں اس گاؤں کے روپے کا خرچہ کا ذکر ہی نہ ہوتا۔ افسوس! گھر میں آئی ہوئی لکشمی میری حماقت اور ناعاقبت اندیشی کی بدولت اٹھی جاتی ہے۔ مگر مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ شیطان کی خالہ اس طرح مجھ سے پیش آئے گی کہ کاغذات کو ہاتھ نہ لگنے دے گی ٭

اسی اُدھیڑ بن میں پڑے پڑے یکایک منشی جی اچھل پڑے۔ ایک ترکیب سُوجھ گئی۔ کیوں نہ کارپردازوں کو ملا لوں۔ وہ سب کے سب میری سخت

گبریوں کی بدولت مجھ سے ناراض تھے۔ اس وقت سیدھے منہ بات نہ کرینگے۔ پر ان میں ایسا تو کوئی نہیں ہے جو زر سے بے نیاز ہو۔ ہاں اس میں صرف کثیر کی ضرورت ہو گی مگر اتنا روپیہ آئے گا کہاں سے؟ کاش ذرا پہلے چیت گیا ہوتا تو یہ سب دقتیں ایک بھی نہ ہوتیں۔ بس ایک ہی ترکیب ہے کہ کسی طرح وہ کاغذات غائب کر دوں۔ خطرناک معاملہ ہے۔ پر کرنا ہی پڑے گا۔

نفس کے سامنے ایک بار سر جھکانے کے بعد پھر سنبھلنا مشکل ہوتا ہے۔ گناہ کی اتھاہ ندی میں ایک بار پھسل کر ہم دم بدم پیچھے ہی ہوتے جاتے ہیں۔ منشی ست نرائن لال جیسا نیک نیت آدمی اس وقت اس فکر میں تھا کہ کیونکر سیندھ لگاؤں۔ گناہ کی غذا گناہ ہے۔ منشی جی نے سوچا کیا سیندھ لگانا آسان ہے؟ اس میں کتنی ہمت کتنی ہوشیاری کتنی پھرتی اور صفائی کی ضرورت ہے۔ کون کہتا ہے کہ چوری آسان کام ہے اور اگر کہیں پکڑا گیا۔ تو پھر بجز ڈوب مرنے کے اور کوئی علاج نہیں۔ منشی جی کو کسی طرح یقین نہیں آتا تھا کہ وہ اس کام کو انجام دے سکتے ہیں۔ ہاں ایک ترکیب اس سے آسان نظر آئی۔ کیوں نہ دفتر میں آگ لگا دوں۔ ایک بوتل مٹی کے تیل اور ایک دیا سلائی کی ضرورت ہے۔ کسی بدمعاش کو ملا لوں۔ اس کی مدد سے سارا کام ہو سکتا ہے۔ مگر یہ کیا معلوم کہ وہ بھی اس کمرہ میں رکھی ہے یا نہیں۔ اس چڑیل نے ضرور اسے اپنے پاس رکھا ہو گا۔

منشی جی اسی ادھیڑ بن میں بہت دیر تک کروٹیں بدلتے رہے۔ نئے نئے منصوبے سوچتے۔ مگر پھر اپنی ہی دلیلوں سے انہیں مٹا دیتے۔ جیسے برسات میں آسمان پر بادلوں کی نئی نئی صورتیں بنتی اور پھر ہوا کے زور سے بگڑ جاتی ہیں۔

لیکن یہ خیال دل سے کسی طرح دور نہ ہوتا تھا کہ ان کاغذات کو اپنے ہاتھ میں لانا چاہیئے۔ یہ کام کٹھن ہے۔ مانا۔ پر ہمت نہ کی۔ تو راڑ کیوں مول لی تھی۔

کیا کسی کی بیس ہزار کی جائداد آسانی سے ہاتھ آجائے گی؟ خواہ کسی صورت سے ہو۔ چور بنے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ آخر جو لوگ یہ کام کرتے ہیں۔ وہ بھی تو آدمی ہی ہوتے ہیں۔ بس ایک چھلانگ کا کام ہے۔ اگر پار ہو گئے تو راج کریں گے۔ اور گر پڑے تو جان سے ہاتھ دھوئیں گے ۔

اس طرح منشی ست نرائن لال نے اپنا دل مضبوط کیا ۔

(۵)

رات کے دس بج گئے تھے۔ منشی ست نرائن لال کنجیوں کا ایک گچھا کمر میں دبائے گھر سے باہر نکلے۔ دروازہ پر تھوڑے سے پیال رکھے ہوئے تھے۔ اسے دیکھتے ہی وہ چونک پڑے۔ مارے خوف کے کلیجہ دھک دھک کرنے لگا۔ معلوم ہوا کہ کوئی آدمی چھپا بیٹھا ہے۔ ان کے قدم رک گئے۔ پیال کی طرف غور سے دیکھا۔ اس میں مطلق حرکت نہ ہوئی۔ تب ہمت بندھ گئی۔ آگے بڑھے اور دل کو سمجھانے لگے۔ میں کیسا احمق ہوں۔ اپنے دروازہ پر کس کا خوف۔ راستہ ہی میں مجھے کس کا خوف ہے۔ میں اپنی راہ جاتا ہوں۔ کوئی میری طرف ترچھی نگاہ سے نہیں دیکھ سکتا۔ ہاں جب مجھے کوئی عین موقع پر پکڑ لے تو البتہ دفعتہً انہوں نے بھان کنور کے ایک چپراسی کو آتے ہوئے دیکھا۔ کلیجہ سن سے ہو گیا وہ لپک کر ایک اندھیری گلی میں گھس گئے۔ اور وہاں بڑی دیر تک کھڑے رہے جب وہ سپاہی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ تو پھر سڑک پر آئے۔ سپاہی آج صبح تک ان کے حکم کا غلام تھا۔ اُسے انہوں نے بارہا گالیاں دی تھیں۔ لاتیں بھی ماری تھیں۔ مگر آج اس کی صورت دیکھ کر ان کی روح فنا ہو گئی ۔

انہوں نے پھر دلیل کی پناہ لی۔ میں جیسے کچھ بھنگ کھا گیا ہوں۔ اس

چپراسی سے آشنا وڑرا۔ بالفرض وہ مجھے دیکھ ہی لیتا۔ تو میرا کیا کر سکتا تھا؟ ہزاروں آدمی راستہ چل رہے ہیں۔ انہیں میں ایک میں بھی ہوں۔ کیا وہ سب کے دلوں کا حال دیکھنے نکلا ہے؟ غالباً مجھے دیکھ کر وہ ادب سے سلام کرتا۔ اور کچھ دور تک میرے ساتھ چلتا۔ عجب نہیں کہ آج وہاں کی داستان بیان کرتا۔ اس طرح دل کو مضبوط کر کے وہ پھر آگے بڑھے۔ یہ شاید سچ ہے کہ گناہ کے قابو میں آیا ہوا دل خزاں کا مارا ہوا پتا ہے۔ جو ہوا کے جھونکے میں گر پڑتا ہے۔ بازار میں پہنچے۔ زیادہ تر دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ ان میں سانڈ اور گائیں بیٹھے ہوئے رمز و کنائے کر رہے تھے۔ صرف حلوائیوں کی دکانیں کھلی تھیں۔ اور کہیں کہیں ایک آدھ گجرے والے ہار کی ہانک لگاتے پھرتے تھے۔ یہ حلوائی منشی جی کو پہچانتے تھے۔ مگر منشی جی نے سر نیچا کر لیا۔ کچھ رفتار تبدیل کی اور لپکتے ہوئے چلے۔ دفعتہً ایک بگھی آتی ہوئی دکھائی دی۔ انہوں نے اسے پہچان لیا۔ یہ بلبھ داس سیٹھ وکیل کی بگھی تھی۔ اس میں بیٹھ کر وہ ہزاروں بار سیٹھ جی کے ساتھ کچہری گئے تھے۔ پر آج یہ انہیں کالے دیو کی طرح خوفناک معلوم ہوئی۔ انہوں نے رخ پھیر لیا۔ اور بھاگ کر ایک خالی دکان پر چڑھ گئے۔ سانڈ نے سمجھا۔ کوئی نیا رقیب پیدا ہوا ہے۔ سینگ جھکائے پھنکارتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ پر اس اثنا میں بگھی نکل گئی۔ اور منشی کی جان میں جان آئی۔ اب کے انہوں نے دلیلوں سے دل کو نہ سمجھایا۔ سمجھ گئے۔ کہ اس وقت اس سے کوئی سود نہیں۔ خیریت ہو گئی۔ کہ وکیل نے دیکھا نہیں۔ ورنہ ایک ہی گھاگ ہے۔ میرے بشرے سے تاڑ جاتا۔ ایک فرلانگ چل کر ایک گلی ملی۔ یہی بھان کنور کے مکان کا راستہ تھا۔ ایک دھندلی سی لالٹین روشن تھی۔ جیسا منشی جی نے قیاس کیا تھا۔ پہرہ دار کا پتہ نہ تھا۔ اصطبل میں چماروں کے یہاں ناچ ہو رہا

تھا۔ کہیں چمارنیں بناؤ سنگار کرکے ناچ رہی تھیں۔ چمار مردنگ بجا بجا کر گاتے تھے:۔

گھر پے نہیں ما ہیں شیام گھیر آئے بدرا

اور دونوں پہرہ دار وہاں تماشا دیکھ رہے تھے۔ منشی جی کے کلیجہ میں دھڑکن تھی۔ سر دھم دھم کرتا تھا۔ ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔ سانس پھول رہی تھی۔ بدن کا ایک ایک رویاں آنکھ اور کان بنا ہوا تھا۔ ان کی ساری طاقت اور چستی اور اوسان اور حواس اور احتیاط اس وقت ارادہ کی مدد پر مستعد تھیں۔

منشی جی بلی کی طرح دبے پاؤں لالٹین کے پاس گئے اور جس طرح وہ چوہے پر جھپٹتی ہے۔ اسی طرح انہوں نے جھپٹ کر اس کا پٹ کھولا۔ اور اُسے گل کر دیا۔ ایک مرحلہ طے ہو گیا۔ مگر جتنا سمجھتے تھے اتنا مشکل نہ تھا۔ دل کچھ مضبوط ہوا۔ دفتر کے برآمدہ میں پہنچے اور ایک لمحہ تک خوب کان لگا کر آہٹ لی۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ صرف چماروں کے گانے کی آواز کان میں آتی تھی۔ دروازہ پر وہی پرانا قفل تھا۔ اس کی کنجی آج بہت تلاش کرکے بازار سے خرید لائے تھے۔ قفل کھل گیا۔ کواڑوں نے بہت ہی دبی زبان سے صدائے احتجاج بلند کی۔ منشی جی دفتر میں داخل ہوئے۔ ان کے اعضاء میں اس وقت بندر کی سی پھرتی اور چستی تھی۔ اندر چراغ جل رہا تھا۔ منشی جی کو دیکھ کر اس نے ایک بار سر ہلایا۔ گویا انہیں اندر آنے کی ممانعت کی۔

منشی جی کے پیر تھر تھر کانپ رہے تھے۔ ایڑیاں زمین سے اچھلی پڑتی تھیں۔ سانس سینہ کو پھوڑ کر نکلنا چاہتا تھا۔ گناہ کا اتنا سنگین بار ان کی برداشت سے باہر تھا۔

پل بھر منشی جی نے بہیوں کو اُلٹا پلٹا۔ ان کی تحریر آنکھوں میں تیر تی تھی۔ انتخاب کی مہلت نہ تھی۔ انہوں نے کاغذات کا ایک پشتارہ باندھا اور بغل میں دباکر تیر کی طرح کمرہ سے باہر نکل آئے۔ دروازہ کو آہستہ سے بند کیا اور اس پاپ کی گٹھڑی کو لئے ہوئے اندھیری گلی میں غائب ہو گئے۔

تنگ اندھیری متعفن گلیوں میں وہ برہنہ پا تیزی سے قدم بڑھائے ہوئے اس طمع خود غرضی بے فائی اور دغا کا بار گراں لئے ہوئے چلے جاتے تھے۔ گو یا گناہوں سے لدی ہوئی روح دوزخ کی نالیوں میں بہی جاتی تھی۔

بہت دیر تک بھٹکنے کے بعد وہ گنگا کے کنارے پہنچے۔ جس طرح تاریک دلوں میں کہیں کہیں ایمان کی دُھندلی روشنی چھپی رہتی ہے۔ اسی طرح ندی کی سیاہ اور ساکت سطح پر تارے جھلملا رہے تھے۔ کنارے پر چند سادھو دھونی رمائے ہوئے تھے۔ شعلہ حقیقت دل کی بجائے باہر دہک رہا تھا۔ منشی جی نے اپنا پشتارہ اتارا۔ اور اپنی چادر میں لپیٹ کر اسے ندی میں پھینک دیا۔ سوتی ہوئی لہروں میں کچھ ہلچل ہوئی۔ اور پھر سناٹا ہو گیا۔

(۶)

منشی ست نرائن لال کے گھر میں ان کی ماں اور بیوی دو عورتیں تھیں۔ تاہم منشی جی کو گنگا میں ڈوب مرنے یا کہیں بھاگ جانے کی ضرورت نہ تھی۔ دونوں عورتیں تعلیم سے بے بہرہ تھیں۔ نہ وہ باڈلیس پہنتی تھیں نہ موزے۔ نہ ہارمونیم پر گا سکتی تھیں۔ یہاں تک کہ انہیں صابن کے استعمال تک کا علم نہ تھا۔ وہ بالوں میں ہیرپن (Hair-Pin) لگانا تک نہ جانتی تھیں۔ بہو میں اپنی عزت کا ذرا بھی احساس نہ تھا۔ نہ ساس میں خودداری کی اسپرٹ۔ بہو اب تک

ساس کی گھرکیاں بھیگی بلی کی طرح سہ لیتی تھی۔ ساس کو بچوں کے نہلانے دھلانے حتیٰ کہ گھر میں جھاڑو دینے تک سے عار نہ تھا۔ بہو عورت کیا مٹی کا لوندا تھی۔ ایک پیسہ کی بھی ضرورت ہو۔ تو ساس سے مانگتی۔ غرض دونوں عورتیں اپنے حقوق سے بے خبر۔ جہالت کی تاریکی میں پڑی ہوئی جانوروں کی طرح زندگی کے دن کاٹتی تھیں۔ ایسی پھوہڑ تھیں کہ دال۔ موٹ۔ سموسے وغیرہ بھی گھر ہی میں بنا لیتی تھیں۔ اپنے ہی ہاتھوں سے کتنی ہی جسمانی شکایتوں کا علاج بھی کر لیتی تھیں۔ بیٹھی گھاس پات کوٹا کرتی تھیں۔ منشی جی نے ماں کے پاس جاکر کہا۔ "اماں! کچھ روپیہ نکالو۔ مجھ سے بھابی سے اَن بَن ہو گئی۔ کل انہوں نے مجھے بے قصور الگ کر دیا۔ ماں نے چونک کر پوچھا "الگ کر دیا۔ کیا بات ہوئی؟ بھابی کنور کا مزاج تو ایسا نہ تھا"!

منشی۔ بات کچھ نہیں تھی۔ میں نے اپنے نام سے جو موضع لیا تھا۔ اُسے میں نے اپنے قبضہ میں کر لیا۔ کل مجھ سے ان سے صاف صاف باتیں ہوئیں میں نے کہہ دیا کہ گاؤں میرا ہے۔ میں نے اپنے نام سے لیا ہے۔ اس سے تمہارا کوئی واسطہ نہیں۔ بس جامہ سے باہر ہو گئیں۔ جو جی میں آیا بکتی رہیں۔ اُسی وقت مجھے نکال دیا اور کہا۔ میں تم سے لڑ کر اپنا گاؤں لے لوں گی۔ اب آج ان کی طرف سے میرے اوپر مقدمہ دائر ہوگا۔ مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔ میرا اس پر قبضہ ہے۔ ایک نہیں ہزار مقدمے چلائیں۔ ڈگری میری ہوگی"۔ ماں نے بہو کی طرف دیکھا۔ بہو نے ماں کی طرف تاکا ماں بولیں "کیوں بھیا؟ وہ گاؤں تو تم نے انہیں کے روپے سے انہیں کے لئے لیا تھا؟

منشی۔ لیا تھا تب لیا تھا۔ اب مجھ سے ایسا آباد زرخیز گاؤں نہیں چھوڑا جاتا۔ وہ میرا کچھ نہیں کر سکتیں۔ اپنے روپیہ کی وصول یابی کا بھی دعوےٰ نہیں

کر سکتیں - ڈیڑھ سو گاؤں تو ہیں - تب بھی ہوس نہیں مانتی +

ماں - بیٹا کسی کے دھن ہوتا ہے تو وہ اسے پھینک تھوڑا ہی دیتا ہے - تم نے اپنی نیت خام کی - یہ اچھا نہیں کیا - دنیا تم کو کیا کہے گی - اور دنیا چاہے کچھ کہے یا نہ کہے - بھلا تم کو ایسا چاہیئے - کہ جس کی گود میں اتنے دن پلے جس کا اتنے دنوں تک نمک کھایا - اب اسی سے دغا کرو - نارائن نے تمہیں کیا نہیں دیا ہے - مزے سے کھاتے ہو - پہنتے ہو - گھر میں نارائن کا دیا چار پیسے ہیں - بال بچے ہیں - اور کسی کو کیا چاہیئے - میرا کہنا مانو - یہ کلنک کا ٹیکا اپنے ماتھے نہ لگاؤ - یہ اجس مت لو - برکت اپنے ہی پسینہ کی کمائی میں ہوتی ہے - حرام کی کوڑی کبھی نہیں پھلتی +

منشی - یہ سب باتیں پوتھی کے بینگن ہیں - دنیا ان پر چلنے لگے - تو سارا نقشہ بگڑ جائے - میں نے اتنے دنوں ان کی خدمت کی - ایسے ایسے چار پانچ گاؤں میری ہی بدولت بڑھ گئے - جب تک پنڈت جی زندہ تھے - میری نیت کی قدر تھی - آنکھ میں دھول ڈالنے کی ضرورت نہ تھی - وہ خود ہی میری خاطر کر دیا کرتے تھے - انہیں مرے ہوئے آٹھ سال ہو گئے - مگر مسماۃ کے ایک بیڑے پان کی بھی قسم کھاتا ہوں - میری ذات سے ان کی ہزاروں روپے ماہوار کی بچت ہوتی تھی - کیا ان کو اتنی سمجھ نہیں تھی کہ یہ شخص جو اتنی ایمان داری سے میرا کام کرتا ہے - اس نفع میں کچھ اس کا بھی حق ہے یا نہیں - حق کہہ کر نہ دو - انعام کہہ کر دو - کسی طرح دو تو - مگر وہ تو سمجھتی تھیں کہ میں نے اسے دس روپے مہینہ پر مول لے لیا ہے - میں نے آٹھ سال تک صبر کیا - اب کیا دس روپے میں زندگی بھر غلامی کیا کروں - اور اپنے بچوں کو دوسروں کا منہ تاکنے کے لئے چھوڑ جاؤں ؟ مجھے یہ موقع ملا ہے - اسے کیوں چھوڑ دوں ؟ زمینداری کی ہوس

لئے ہوئے کیوں مروں؟ جب تک زندہ رہوں گا۔ خود کھاؤں گا۔ میرے بعد میرے بچے چین اڑائیں گے"۔ ماں کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ بولیں۔ بیٹا! میں نے تمہارے منہ سے ایسی باتیں کبھی نہ سُنی تھیں۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ تمہارے آگے بال بچے ہیں۔ آگ میں ہاتھ نہ ڈالو"۔ بیوی نے ساس کی طرف دیکھ کر کہا۔ "ایسا دھن نہ چاہیئے۔ ہم اپنی روٹی دال میں خوش ہیں"۔

منشی۔ اچھی بات ہے۔ تم لوگ روٹی کھانا۔ گزی گاڑھا پہننا۔ مجھے اب حلوے پوری کی خواہش ہے۔

ماں۔ یہ ادھرم مجھ سے نہ دیکھا جائے گا۔ میں گنگا میں ڈوب مروں گی۔

بیوی۔ تمہیں یہ کانٹے بونا ہے تو مجھے میکے میں پہنچا دو۔ میں اپنے بچوں کو لے کر اس گھر میں نہ رہوں گی۔

منشی نے جھنجلا کر کہا "تم لوگوں کی عقل تو بھنگ کھا گئی ہے۔ یہ سب سرکاری ملازم رات دن دوسروں کا گلا دبا دبا کر رشوتیں لیتے ہیں اور چین کرتے ہیں، نہ ان کے بال بچوں ہی کو کچھ ہوتا ہے نہ ان کو۔ ادھرم ان کو کیوں نہیں کھا جاتا۔ جو مجھ ہی کو کھا جائے گا۔ میں نے تو ایمان داروں کو ہمیشہ تکلیف ہی میں دیکھا۔ میں نے تو جو کیا ہے۔ اس کا سُکھ اٹھاؤں گا۔ تم لوگوں کے جی میں جو آئے کرو۔

(۷)

صبح کے وقت بھان کنور کا دفتر کھُلا۔ تو کاغذات سب غائب تھے۔ منشی چھکن لال بدحواس گھر میں گئے۔ اور مالکہ سے پوچھا۔ کاغذات کیا آپ نے اُٹھوا لئے ہیں"؟ بھان کنور نے کہا۔ "مجھے کیا خبر۔ جہاں آپ نے رکھے ہونگے۔

وہیں ہو نگے"۔ دم کے دم میں سارے گھر میں طوفان مچ گیا۔ پہرہ داروں پر مار پڑنے لگی۔ بھان کنور کو معاً ست نرائن لال پر شبہ ہوا۔ مگر ان کے خیال میں جھکن لال کی مدد کے بغیر یہ کام ہونا غیر ممکن تھا۔ پولیس میں رپٹ ہوئی۔ ایک اوجھا نام نکالنے کے لئے بلایا گیا۔ مولوی صاحب نے قرعہ پھینکا۔ اوجھا نے بتلایا کسی پرانے دشمن کا یہ کام ہے۔ مولوی صاحب نے بتلایا۔ کسی گھر کے بھیدی نے یہ حرکت کی ہے۔ شام تک یہی دوڑ دھوپ رہی اور تب یہ صلاح ہونے لگی کہ ان کاغذات کے بغیر مقدمہ کیونکر چلے گا۔ روداد پہلے ہی کم زور تھی۔ جو کچھ سہارا تھا۔ انہیں اندراجات کا تھا۔ جو خود منشی ست نرائن لال نے کئے تھے۔ اب تو وہ ثبوت بھی ہاتھ سے گئے۔ دعوے میں کچھ جان ہی نہیں باقی رہی۔ مگر بھان کنور نے مقدمہ دائر کرنے پر زور دیا۔ بلا سے ہار جائیں گے۔ ہماری چیز کوئی دوسرا چھین لے۔ تو ہمارا دھرم ہے کہ اس چیز کو واپس لینے کے لئے اپنے قابو بھر لڑیں۔ ہار مان کر بیٹھ رہنا بزدلوں کا کام ہے۔ سیٹھ جی وکیل کو اس سانحہ کی اطلاع دی گئی۔ انہوں نے بھی یہی کہا۔ کہ مقدمہ بالکل بے جان ہو گیا۔ صرف عقلی اور قیاسی دلیلوں پر دارومدار ہے۔ عدالت نے تسلیم کیا تو کیا۔ ورنہ ہارنا پڑے گا۔ پر بھان کنور کو ضد تھی کہ مقدمہ ضرور دائر ہو۔ لکھنؤ اور الہ آباد سے دو بلند بانگ بیرسٹر بلائے گئے اور ایک ہفتہ کے اندر استغاثہ دائر ہو گیا۔

سارے شہر میں اس مقدمہ کی دھوم تھی۔ کتنے ہی رؤسا کو بھان کنور نے شہادت میں طلب کیا تھا۔ دلچسپی کا خاص سبب یہ تھا کہ بھان کنور خود بھی پردہ کی آڑ میں بیٹھی ہوئی روداد سنتی تھی۔ کیونکہ اُسے اب اپنے مختاروں اور ملازموں پر مطلق بھروسہ نہ تھا۔

استغاثہ کے بیرسٹر نے ایک مدلل اور موثر تقریر کی۔ اس نے منشی ست نرائن لعل کی سابقہ دیانت اور خلوص نیت اور ان پر پنڈت بھر گودت کے کامل اعتماد کا ذکر کیا۔ بعد ازاں یہ دکھایا کہ مدعا علیہ کی مالی حالت ہرگز ایسی نہ تھی جو اتنے صرف کثیر کی متحمل ہو سکتی۔ آخر میں اس نے منشی جی کی دغا اور بدعہدی پر ایسے رقت آمیز پیرایہ میں بحث کی کہ سامعین کی آنکھیں پُر آب ہو گئیں۔ "کتنے افسوس اور عبرت کا مقام ہے کہ ایسا وفادار۔ آقا پرست آدمی رفتہ رفتہ اتنا گر جائے کہ اس کی بے کس بیوہ اور یتیم بچوں کی گردن پر چھری پھیرنے سے باز نہ آئے جن کا نمک اس کی ہڈیوں میں پیوست ہو گیا ہے۔ انسانی خباثت اور کجروی کی اس سے زیادہ عبرت ناک مثال نہیں مل سکتی۔ نتائج کے اعتبار سے دیکھئے تو اس شخص کی سابقہ دیانت اور وفا کی وقعت بالکل باقی نہیں رہتی۔ کیونکہ وہ جواہر نہ تھے۔ بلکہ سنگ ریزے تھے۔ جو محض ایک رنگین جال تھا۔ جو ایک خوش اعتقاد اور کم اندیش رئیس کو پھنسانے کے لئے پھیلایا گیا تھا۔ خیال کیجئے کہ اس شخص کا باطن کتنا تاریک کتنا گہرا اور اس کی خیانت کتنی دور رس ہے۔ اپنے حریف کے ساتھ دغا کرنا کسی حد تک معافی کے قابل ہے۔ مگر اس شخص نے ان بےکسوں کے ساتھ دغا کی ہے۔ جن کے ساتھ بہبودی کرنا انسانی سرشت کا خاصہ ہے۔ کاش ہمارے ہاتھ میں اندراجات ہوتے۔ جو بیعنامہ لکھانے کے وقت منشی صاحب ممدوح نے فرمائے تھے۔ تو عدالت پر ان کی سیہ باطنی روشن ہو جاتی۔ مگر ان کا دفتر سے عین برخاستگی کے روز غائب ہو جانا بھی عدالت کے لئے کچھ کم یقین انگیز نہ ہونا چاہیئے ایسی رذالت کے بعد اس شخص کے نزدیک کوئی کام ناکردنی نہیں ہو سکتا۔

کئی روز تک شہر کی شہادتیں ہوئیں۔ مگر بیشتر سماعی تھیں۔ دو ایک صاحبوں نے چشم دید شہادت کا دعوے کیا۔ پر جرح میں اکھڑ گئے۔

آج کی کارروائی ختم ہو گئی۔ دوسرے دن پھر مقدمہ پیش ہوا۔

فریق مخالف کے وکیل صاحب نے جوابی تقریر کرنا شروع کی۔ جس میں تضحیک کا پہلو غالب تھا۔ "یہ نرالی منطق ہے کہ ایک دولت مند کا ملازم جو کچھ خریدے۔ وہ اس کے آقا کی چیز ہے۔ اس دلیل کے مطابق ہماری گورنمنٹ کو اپنے ملازمین کی جائداد پر قبضہ کر لینا چاہیئے۔ یہ تسلیم کرنے میں ہم کو عذر نہیں کہ ایسی کثیر رقم ہماری دسترس سے باہر تھی اور یہ رقم ہم نے اپنے آقا ہی سے قرض لی۔ مگر بجائے اس کے کہ ہم سے قرضہ کی وصولی کا تقاضا کیا جاتا ہم سے وہ جائداد مانگی جاتی ہے۔ حساب کے کاغذات پیش کئے جائیں۔ تو وہ صاف بتا دینگے کہ اب میرے ذمہ بھان کنور کا ایک حبّہ بھی باقی نہیں ہے اگر میں آپ سے قرض لے کر اپنی شادی کر لوں۔ تو کیا کل آپ مجھ سے میری بیوی کو چھین لینے کا دعوےٰ کرینگے۔

ہمارے روشن خیال دوست نے ہمارے اوپر بےکسوں اور یتیموں کے ساتھ دغا کرنے کا الزام لگایا ہے۔ اگر منشی ست نرائن لال کی نیت فاسد ہوتی۔ تو اس کا بہترین موقع وہ تھا۔ جب اس کے آقائے نامدار کی وفات ہوئی تھی۔ اس طولانی انتظار کی کیا ضرورت تھی۔ اگر آپ شیر کو پھنسا کر اس کے بچے کو اسی وقت نہیں پکڑ لیتے بلکہ اسے بڑھنے اور خونخوار ہونے کا موقع دیتے ہیں۔ تو مجھے آپ کے دماغ کے صحیح ہونے پر شبہ ہوگا۔ مگر شاید منشی ست نرائن لال کے رنگین جال میں کوئی ایسی کرامات ہو۔ جسے سمجھنے میں ہمارے عالم دوست قاصر ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ منشی جی نے حق نمک ادا کر دیا۔ آٹھ سال تک کمال دیانت سے کام انجام دیا۔ اور آج انہیں اپنی نیک نیتی کا ثمرہ جو مل رہا ہے وہ نہایت درجہ دلدوز اور جگر خراش ہے۔ اس میں بھان کنور کی کوئی خطا نہیں

وہ ایک نیک خاتون ہیں۔ مگر اپنی صنف کی اعتقادی کمزوریوں سے خالی نہیں۔ ایماندار آدمی خاصۃً صاف گو اور کم سخن ہوتا ہے۔ اُسے باتوں میں نمک مرچ ملانے اور قند وشکر گھولنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہی باعث ہے کہ پنڈت جی کی بیوہ پر شیریں بیان رقیبوں کو وار کرنے کا یہ موقعہ مل گیا۔ اس دعوے کی بنیاد صرف اتنی ہے اور کچھ نہیں بھان کنور یہاں موجود ہیں۔ کیا وہ کہہ سکتی ہیں کہ اس آٹھ سال میں کبھی اس موضع کا ذکر انہوں نے کیا۔ کبھی اس کے نفع نقصان۔ آمد وخرچ یا لین دین کا چرچا ان سے کیا گیا۔ میں گورنمنٹ کا ملازم ہوں۔ اگر میں آج دفتر میں آکر اپنے خانگی انتظامات کی داستانیں چھیڑ دوں۔ اپنے اخراجات کی زیادتی اور اپنے خدمت گار کی نیکیوں کا قصّہ گانے لگوں۔ تو شاید مجھے بہت جلد اپنے عہدے سے سبکدوش ہونا پڑے اور ممکن ہے کچھ دنوں بنارس کے شاندار مہمان خانہ میں رکھا جاؤں۔"

اس کے بعد متعدد شہادتیں پیش ہوئیں۔ بالخصوص قرب وجوار کے مواضعات کے لوگوں کی جنہوں نے بیان کیا کہ منشی ست نرائن لال کو اپنے دستخط سے رسیدیں دینے اور اپنے ہی نام سے خزانہ میں روپیہ داخل کرتے دیکھا ہے۔ اس موضع کا دفتر اسی جگہ تھا۔ اس میں منشی جی کی سیر بھی ہوتی ہے وغیرہ۔

اس کارروائی کے بعد شام ہوگئی۔ منصف عدالت نے کل فیصلہ سنانے کا وعدہ کیا۔

(۵)

منشی ست نرائن لال کی فتح اب یقینی تھی۔ استغاثہ کی شہادتیں کمزور تھیں بحث قیاسی دلیلوں پر مبنی۔ ان کے منصوبے اب پورے ہونے والے تھے۔ ان کا شمار بھی زمینداروں میں ہوگا اور اپنی سعی ومحنت سے بہت جلد وہ بھی

رؤسا کے زمرہ میں داخل ہو سکیں گے۔ لیکن کسی نہ کسی وجہ سے وہ اب شہر کے شرفا سے آنکھیں ملاتے شرماتے تھے۔ انہیں دیکھتے ہی ان کا سر نیچا ہو جاتا تھا اور وہ ڈرتے رہتے تھے کہ کہیں لوگ اس مسئلے کو نہ چھیڑ دیں۔ وہ بازار میں نکلتے تو انہیں دیکھ کر اکثر دکانداروں میں سرگوشیاں ہونے لگتیں۔ اور لوگ ان کی طرف بُری نگاہوں سے دیکھتے۔ اس لیے وہ بازار سے سر جھکائے قدم بڑھائے بھاگ نکلتے تھے۔ اب تک لوگ انہیں ایک سچا بے لوث اور پاک طینت آدمی سمجھتے تھے۔ شہر کے وضعدار اور شریف لوگ انہیں اعزاز کی نگاہوں سے دیکھتے، اور بڑی خاطر سے پیش آتے۔ حالانکہ ابھی منشی جی کو آزمائش کا موقع نہیں ملا تھا۔ پر ان کا دل کہتا تھا۔ کہ اب میری وہ بات نہیں رہی۔ اصل حقیقت سارے زمانہ پر روشن ہے اور عدالت میرے حق میں فیصلہ ہی کیوں نہ کر دے۔ لیکن میری ساکھ اب جاتی رہی۔ دلوں سے میری عزت اٹھ گئی۔ اب مجھے بھی لوگ خود غرض ریاکار مطلبی سمجھیں گے۔

غیروں کی تو بات الگ رہی۔ خود ان گھر والے ان کے شریک نہیں تھے بوڑھی ماں نے تین دن سے منہ میں پانی نہیں ڈالا۔ اور بیوی بار بار ہاتھ جوڑ کر کہتی کہ اپنے بچوں پر رحم کرو۔ بُرے کام کا پھل کبھی اچھا نہیں ہوتا۔ نہیں تو پہلے مجھی کو زہر دے دو"۔

فیصلہ کے دن صبح کو ایک کنجڑن سبزی لے کر آئی۔ منشائن سے بولی۔ بہو جی! ہم نے بجار میں ایک بات سنی ہے۔ برا نہ مانو تو کہوں۔ جس کو دیکھو اس کے منہ میں یہی بات ہے کہ لالہ بابو نے جال سازی سے پنڈت تاش کا الاکا لے لیا۔ ہمیں تو اس پر اکین کبھی نہیں آتا۔ لالہ بابو نے نہ سنبھالا ہوتا۔ تو اب تک پنڈتائن کی ایک انگل زمین نہ بچتی انہیں کا ایسا جگرا تھا کہ سب کو سنبھال لیا۔ تو اب کیا انہیں کے ساتھ بدی کریں گے؟

ارے بہو! کوئی کچھ ساتھ لاتا ہے کہ لے جائے گا۔ یہی نیکی بدی رہ جاتی ہے۔ بُرے کا پھل بُرا ہی ہوتا ہے۔ آدمی نہ دیکھے پر اللہ سب کچھ دیکھتا ہے"۔

بہو جی پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ جی چاہتا تھا کہ زمین پھٹ جائے تو اس میں سما جاؤں۔ عورتوں میں عزت اور حیا بہت زیادہ ہوتی ہے۔ طعن و تشنیع کی برداشت ان سے نہیں ہو سکتی۔ سر جھکائے ہوئی بولی "بوا میں ان باتوں کو کیا جانوں۔ میں نے تو یہ بات آج تمہارے منہ سے سنی ہے۔ کون کون سی نرکاری ہے"۔

منشی ست نرائن لال بھی اپنے کمرے میں بڑے کنجڑن کی یہ باتیں سن رہے تھے۔ اس کے چلے جانے کے بعد وہ بیوی کے پاس آکر پوچھنے لگے "یہ کیا کہہ رہی تھی"؟

بیوی نے شوہر کی طرف سے منہ پھیر کر زمین کی طرف تاکتے ہوئے کہا "کیا تم نے نہیں سنا؟ تمہارے کرتب کا بکھان کر رہی تھی۔ تمہاری بدولت دیکھیں۔ کس کس کے منہ سے یہ باتیں سننا پڑتی ہیں۔ اور کس کس سے منہ چھپانا پڑتا ہے"۔

منشی جی اپنے کمرے میں لوٹ آئے۔ بیوی کی باتوں کا کچھ جواب نہ دیا۔ دل پر غیرت کا غلبہ ہو گیا۔ جس شخص کی نیک نیتی کی سارے شہر میں دھوم ہو۔ جو ہمیشہ غرور سے گردن اٹھا کر چلتا رہا ہو۔ جو ہمیشہ اعزاز و احترام کی نگاہوں سے دیکھا گیا ہو۔ وہ کبھی زبان خلق سے بے پروا نہیں ہو سکتا۔ بدنامی کا خوف ہی بدنیتی کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ منشی جی نے سمجھا تھا۔ میں اس فعل کو ایسے خفیہ طریق سے کر لوں گا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوگی۔ اور میرے اعتبار میں ذرہ بھر بھی فرق نہ آئے گا۔ ان کی یہ آرزو تو پوری نہ ہوئی۔ مشکلات پیدا ہو گئیں۔ ان مشکلات کے دور کرنے میں انہیں چوری تک کرنا پڑی۔ لیکن یہ سب اسی بدنامی کی خوف سے جس میں کوئی یہ نہ کہے کہ اپنی مالکہ کو دھوکا دیا۔ باوجود اس احتیاط کے وہ رسوائی

کے تازیانہ سے نہ بچ سکے۔ بازار کی سودا بیچنے والی عورتیں تک اب انہیں ذلت کی نگاہ سے دیکھتی تھیں۔ پنچہ نفس میں دبا ہوا ایمان اس صدمہ کو برداشت نہ کر سکا۔ منشی جی سوچنے لگے۔ اب مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ مانا کہ میں صاحب جائداد ہو جاؤں گا۔ لیکن بدنامی میرے گلے کا ہار بنی رہے گی۔ عدالت کا فیصلہ مجھے ذلت سے نہ بچا سکے گا۔ ثروت کا نتیجہ ہے۔ عزت اور وقار۔ جب یہی نہیں تو ثروت کس کام کی؟ اطمینان قلب کھو کر دنیا کی آنکھوں میں ذلیل بن کر بے حیائی کا بوجھ سر پر رکھ کر اور اپنے گھر میں نفاق بو کر ثروت اور دولت میرے کس کام آئیگی اور اگر سچ مچ مجھ پر قہر الٰہی نازل ہو۔ تو میرے لئے منہ میں کالک لگا کر گھر سے نکل جانے کے سوا اور کوئی علاج نہ ہوگا۔ نیک نیت انسان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو لوگ اس کے ساتھ ہمدردی کرتے ہیں۔ بدکاروں پر کوئی مصیبت آتی ہے تو لوگ اسے طعنے دیتے ہیں۔ اس حالت میں ایشور بے انصاف ٹھیرایا جاتا ہے۔ لیکن اس حالت میں ایشور کے انصاف کی تعریف ہوتی ہے۔ پرماتما کسی طرح مجھے اس غار سے نکالو! کیوں نہ جاکر میں بھان کنور کے پیروں پر گر پڑوں اور کہوں کہ مقدمہ اٹھا لیجئے۔ ہائے افسوس! پہلے مجھے یہ بات کیوں نہ سوجھی۔ اگر کل تک میں ان کے پاس چلا گیا ہوتا۔ تو سارے کام بن جاتے۔ پر اب کیا ہو سکتا ہے۔ آج تو فیصلہ کا دن ہے؛

منشی جی بہت دیر تک انہیں خیالات میں ڈوبے رہے۔ لیکن کچھ فیصلہ نہ کر سکے کہ کیا کرنا چاہیئے؛

(۹)

بھان کنور کو یقین ہو گیا کہ اب گاؤں ہاتھ سے جاتا ہے۔ بے چاری ہاتھ

مل کر رہ گئی۔ رات بھر اُسے نیند نہیں آئی۔ رہ رہ کر منشی ست نرائن لال پر غصّہ آتا تھا۔ ظالم ڈھول بجا کر میرا پچاس ہزار کا مال لئے جاتا ہے اور میں کچھ نہیں کر سکتی۔ آج کل کے یہ انصاف کرنے والے بالکل آنکھ کے اندھے ہیں۔ جس بات کو سارا زمانہ جانتا ہے۔ وہاں تک بھی ان کی نگاہ نہیں پہنچ سکتی۔ بس دوسروں کی آنکھ سے دیکھتے ہیں۔ کورے کاغذوں کے غلام! انصاف کے معنی ہیں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی۔ حق دار کو ملے۔ یہ نہیں کہ منصف صاحب خود ہی کاغذوں کے دھوکے میں آ جائیں۔ اسی سے تو ایسے متفنی۔ جعلیئے اور دغاباز آدمیوں کی ہمتیں بڑھ گئی ہیں۔ لیکن خیر! گاؤں جاتا ہے تو جانے تم تو کہیں شہر میں مُنہ دکھانے کے لائق نہیں رہے۔

اس خیال سے بھان کنور کو کچھ تسکین ہوئی۔ دشمن کا نقصان ہمیں اپنے فائدے سے بھی زیادہ عزیز ہوتا ہے۔ یہ انسانی خاصہ ہے۔ تم ہمارا ایک گاؤں لے گئے نارائن چاہیں گے تو تمہارے ہاتھ سے بھی یہ جلدی نکلے گا۔ خود نرک کی آگ میں جلو گے اور تمہارے بعد تمہارے گھر میں کوئی نام لیوا نہ رہ جائے گا!

فیصلہ کا دن آ گیا۔ آج اجلاس پر معمول سے زیادہ بھیڑ بھاڑ تھی۔ اس مقدمہ سے ہر خاص و عام کو دلچسپی تھی۔ ایسے مقطع لوگ نظر آتے تھے جو لنگوں کی طرح سرکاری تقریبوں کے چشمہ شیریں کے کنارے ہی نظر آتے ہیں۔ مقدمہ اپنی نوعیت میں فرد تھا۔ وکیلوں۔ مختاروں کی کالی پلٹن کا ہجوم تماشائیوں سے کچھ ہی کم تھا۔

عین مقررہ وقت پر جج صاحب اجلاس پر نمودار ہوئے۔ وسیع ہال میں سناٹا چھا گیا۔ لوگ ہمہ تن گوش و چشم ہو گئے۔

اہلمد نے صندوق سے تجویز نکالی۔ اشتیاق نے لوگوں کو ایک ایک قدم

اور آگے کھسکا دیا +

جج نے فیصلہ سنایا "مدعی کا دعویٰ خارج - فریقین اپنے اپنے مصارف کے ذمہ دار ہیں" ہر چند عام قیاس اس فیصلہ کی جانب مائل تھا۔ تاہم آج جج کی زبان سے سن کر سارے مجمع میں ہلچل پڑ گئی - جو اندیشہ تھا - وہ واقعہ ثابت ہوا - مایوسانہ انداز سے سرگوشیاں کرتے ہوئے لوگ عدالت سے باہر نکلنے لگے +

دفعتہً بھان کنور گھونگٹ نکالے اجلاس پر آ کر کھڑی ہوئی - جا نیوالے لوٹ پڑے - جو باہر نکل گئے تھے - وہ لپک کر آ گئے - ساری جماعت دم بخود ہو کر بھان کنور کی طرف تاکنے لگی - ایک ساحر تھا - جس نے انگلی کے اشارے سے ساری جماعت پر منتر ڈال دیا تھا +

بھان کنور نے جج صاحب سے کانپتے ہوئے لہجہ میں کہا "سرکار کا حکم ہو - تو میں ست نرائن لال سے کچھ پوچھوں"؟

یہ ایک بے ضابطہ بات تھی - تاہم جج نے ازراہ انسانیت اس کی اجازت دے دی - تب بھان کنور نے ست نرائن لال کی طرف دیکھ کر کہا "لالہ جی! سرکار نے تمہاری ڈگری تو کر ہی دی - گاؤں تمہیں مبارک رہے - مگر ایمان آدمی کا سب کچھ ہے - ایمان سے کہہ دو - گاؤں کس کا ہے"؟

یہ سوال سُن کر ہزاروں آدمی منشی جی کی طرف حیرت آمیز استفسار کی نگاہوں سے تاکنے لگے - منشی جی دریائے فکر میں ڈوبے دل میں نفس اور ایمان کے درمیان داؤ پیچ ہونے لگے - ہزاروں آدمیوں کی آنکھیں ان کی طرف جمی ہوئی تھیں - اصل واقعہ کسی سے پوشیدہ نہ تھا - اتنے آدمیوں کے روبرو جھوٹی بات زبان سے نہ نکل سکی - غیرت نے زبان بند کر دی "میرا" کہہ دینے میں کام بنتا تھا - کوئی امر

مانع نہ تھا۔ لیکن بدترین گناہ کی جو سزا دنیا دے سکتی ہے۔ اس کے ملنے کا پورا خوف تھا۔ "آپ کا" کہہ دینے سے کام بگڑ جاتا تھا۔ جیتی جتائی بازی ہاتھ سے جاتی تھی۔ لیکن بہترین فعل کے لئے دنیا جو انعام دے سکتی ہے۔ اس کے ملنے کی اُمید کامل تھی۔ اس امید نے خوف کو دبا لیا۔ انہیں ایسا معلوم ہوا۔ گویا ایشور نے انہیں سُرخرو بننے کا یہ آخری موقع دیا ہے۔ میں اب بھی اپنے ایمان کو بچا سکتا ہوں۔ اب بھی دُنیا کی نگاہوں میں عزت پا سکتا ہوں۔ انہوں نے آگے بڑھ کر بھان کنور کو سلام کیا۔ اور کانپتی ہوئی آواز سے بولے "آپ کا"۔ فتح حق کا ایک نعرہ بلند کمرہ میں گونجتا ہوا عالم بالا تک جا پہنچا۔ جج نے کھڑے ہو کر کہا "یہ قانون کا فیصلہ نہیں۔ ایمان کا فیصلہ ہے"۔

داستان ختم ہو گئی۔ داستان نہیں امر واقعہ ہے۔ فریقین اب بھی شاید بقید حیات ہیں۔ ست نرائن لال سے جتنے ہی لوگ شاکی تھے۔ اتنے ہی اب ان کے مداح ہو گئے۔ انسانی قانون پر خدائی قانون نے جو شاندار فتح پائی تھی۔ اس کے شہر میں مہینوں چرچے ہوتے رہے۔ بھان کنور ست نرائن لال کے گھر گئی۔ انہیں منا کر لائی۔ پھر اپنا سارا کاروبار ان کے ہاتھ میں سونپا۔ اور کچھ دنوں میں وہی موضع منشی جی کے نام ہبہ کر دیا۔ منشی جی نے بھی اس کو اپنے تصرف میں لانا مناسب نہ سمجھا۔ کرشن آرپن کر دیا۔ اب اس کی آمدنی محتاج اور بے کسوں اور مسکین طلبا کی امداد میں صرف ہوتی ہے۔

فتح

(۱)

شہزادہ مسرور کی شادی ملکہ مخمور سے ہوئی۔ اور دونوں آرام سے زندگی بسر کرنے لگے۔ مسرور گلے چراتا۔ کھیت جوتتا۔ مخمور کھانا پکاتی اور چرخہ چلاتی۔ دونوں تالاب کے کنارے بیٹھے ہوئے مچھلیوں کا تیرنا دیکھتے۔ لہروں سے کھیلتے باغیچہ میں جاکر چڑیوں کے چہچہے سنتے۔ اور پھولوں کے ہار بناتے۔ نہ کوئی فکر تھی نہ کوئی کاوش۔

لیکن بہت دن نہ گزرنے پائے تھے کہ ان کی زندگی میں ایک تغیّر نمودار

ہوا - اراکین دربار میں بوالہوس خاں نام کا ایک فتنہ انگیز شخص تھا۔ شاہ مسرور نے اُسے نظر بند کر رکھا تھا - رفتہ رفتہ ملکۂ مخمور کے مزاج میں اتنا دخیل ہوگیا کہ ملکہ اس کے مشورہ کے بغیر کوئی کام نہ کرتی - اس نے ملکہ کے لئے ایک ہوائی جہاز بنایا۔ جو محض اشارہ سے چلتا تھا - ایک سکنڈ میں ہزار دل میل اڑ جاتا - اور ایک دقیقہ میں عالم بالا کی خبر لاتا - ملکہ اس جہاز پر بیٹھ کر یورپ، اور امریکہ کی سیر کرتی - بوالہوس اس سے کہتا - توسیع سلطنت بادشاہوں کا اولیں فرض ہے - اس دُنیاءِ بسیط پر قبضہ کیجئے - تجارت کے وسائل بڑھایئے - معدنی دولت نکالئے - دنیا حوصلہ مندوں کے لئے ہے - انہیں کے کارنامے انہیں کی فتوحات یادگار ہوتی ہیں - ملکہ اس کی باتوں کو ہمہ تن گوش ہو کر سنتی - اس کے دل میں حوصلہ کا جوش اُمڈنے لگتا - یہاں تک کہ اپنی سادہ پُر قناعت زندگی اُسے روکھی پھیکی معلوم ہونے لگی ✲

مگر شاہ مسرور قناعت کا پتلا تھا - اس کی زندگی کے وہ مبارک لمحے ہوتے تھے جب وہ کنجِ تنہائی میں خاموش مستغرق ہو کر کائنات اور اس کے اسباب پر غور کرتا۔ اور اس کی وسعت بیکراں اور کرشمہ گوناگوں دیکھ کر خرط احترام سے چیخ اٹھتا "آہ! میری ہستی کتنی ناچیز ہے"! اُسے ملکہ کے منصوبے اور حوصلے سے مطلق دلچسپی نہ تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ محبت اور خلوص کی جگہ بدگمانیاں پیدا ہوئیں - اراکین میں فرقہ بندیاں ہونے لگیں - زندگی کا اطمینان رخصت ہوگیا - مسرور اُن کلفتوں کا متحمل نہ ہوسکا۔ جو اس کی تہذیب میں مزاحم ہوتی تھیں - وہ ایک دن اٹھا - اور سلطنت ملکہ کے سپرد کر کے ایک کوہستانی علاقہ میں جا چھپا - سارا دربار نئی امنگوں سے متوالا ہو رہا تھا - کسی نے بادشاہ کو روکنے کی کوشش نہ کی - مہینوں - برسوں ہو گئے - کسی کو ان کی خبر نہ ملی ✲

(۴)

ملکہ مخمور نے ایک بڑی فوج آراستہ کی۔ اور بوالہوس خاں کو مہمات پر روانہ کیا۔ اس نے علاقے پر علاقے اور ملک پر ملک جیتنے شروع کئے۔ سیم و زر اور لعل و جواہر کے انبار ہوائی جہازوں پر لاد کر دارالخلافہ کو آنے لگے۔

لیکن حیرت کا مقام یہ تھا کہ ان روز افزوں ترقیوں سے ملک کے اندرونی معاملات میں شورش ہونے لگی۔ وہ صوبے جو اب تک تابع فرمان تھے۔ علمِ بغاوت کرنے لگے۔ کرن سنگھ بوندیلہ ایک فوج لے چڑھ آیا۔ مگر عجیب فوج تھی۔ نہ کوئی سامان حرب نہ اسلحہ نہ توپیں۔ سپاہیوں کے ہاتھوں میں بندوق اور سنان تیر و تفنگ کے بجائے بربط و طنبور سارنگیاں۔ بیلے۔ ستار اور طاؤس تھے۔ توپوں کی گھن گرج صداؤں کے بدلے طبلے اور مردنگ کی کمک تھی۔ بم گولوں کی جگہ جل ترنگ۔ آرگن اور آرکسٹر تھا۔ ملکہ مخمور نے سمجھا۔ آن کی آن میں اس فوج کو پریشان کرتی ہوں۔ لیکن جوں ہی اس کی فوج کرن سنگھ کے مقابلہ میں روانہ ہوئی۔ دلاویز روح پرور صداؤں کا وہ سیلاب آیا۔ شیریں و خوشگوار نغموں کی وہ بوچھاڑ اور خوش نوایوں کی وہ یورش ہوئی کہ ملکہ کی سپاہ پتھر کی مورتوں کی طرح دم بخود کھڑی رہ گئی۔ ایک لمحہ میں سپاہیوں کی آنکھیں مسرور ہو گئیں۔ انہیں ایک نشہ سا آیا۔ تالیاں بجا بجا کر ناچنے لگے۔ سر ہلا ہلا کر اچھلنے لگے۔ اور پھر سب کے سب لاش بے جان کی طرح گر پڑے۔ اور محض سپاہی نہیں۔ دارالخلافہ میں بھی جس کے کانوں میں یہ صدائیں گئیں۔ وہ بے ہوش ہو گیا۔ سارے شہر میں کوئی زندہ انسان نظر نہ آتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سنگین مورتوں کا طلسمات ہے۔ ملکہ اپنے جہاز پر بیٹھی یہ کرشمہ دیکھ رہی

تھی - اس نے جہاز نیچے اتارا - کہ دیکھوں کیا ماجرا ہے - پر ان آوازوں کے کان میں پہنچتے ہی اس کی بھی وہی کیفیت ہوگئی - وہ ہوائی جہاز پر ناچنے لگی اور بے ہوش ہوکر گر پڑی - جب کرن سنگھ قصر شاہی کے قریب جا پہنچا اور نغمے بند ہوگئے - تو ملکہ کی آنکھیں کھلیں - جیسے کسی کا نشہ ٹوٹ جائے - اس نے کہا "میں وہی نغمے سنوں گی - وہی راگ - وہی الاپ - وہی لبھانے والے گیت - ہائے وہ آوازیں کہاں گئیں - کچھ پروا نہیں - میرا راج جائے - پاٹ جائے - میں وہی راگ سنوں گی"۔

سپاہیوں کا نشہ بھی ٹوٹا - انہوں نے ہم آہنگ ہوکر کہا "ہم وہی گیت سنیں گے" - وہی پیارے پیارے دلکش راگ - بلا سے ہم گرفتار ہونگے غلامی کی بیڑیاں پہنیں گے - آزادی سے ہاتھ دھوئیں گے - پر وہی راگ - وہی ترانے - وہی تانیں - وہی زمزمے"۔

(۳۷)

صوبہ دار لوچن داس کو جب کرن سنگھ کی ظفر یابی کا حال معلوم ہوا - تو وہ بھی آمادہ سرکشی ہوا - اپنی فوج لے کر دارالخلافہ پر چڑھ دوڑا - ملکہ نے اب کے جان توڑ مقابلہ کرنے کی ٹھانی - سپاہیوں کو خوب للکارا اور انہیں لوچن داس کے مقابلہ میں آراستہ کیا - مگر واہ ری حملہ آور فوج! نہ کہیں سوار نہ پیادے - نہ توپیں نہ بندوق - نہ سامان حرب ضرب - سپاہیوں کی جگہ رقاصان دلنواز کے طائفے تھے اور کھیٹر کے ایکٹر - سواروں کی جگہ بھانڈوں اور بہروپیوں کے غول - مورچوں کی جگہ تنبورں اور بٹیروں کے جوڑ چھوٹے ہوئے تھے - بندوق دستاں کی جگہ سرکس اور بائیسکوپ کے خیمے ایستادہ تھے - کہیں

لعل و جواہر اپنی آب و تاب دکھا رہے تھے۔ کہیں انواع و اقسام کے چرند و پرند کی نمائش کھلی ہوئی تھی۔ میدان کے ایک حصہ میں صفحۂ گیتی کے عجائبات۔ آبشار و برفستانی چوٹیاں۔ اور برف کے پہاڑ پیرس کا بازار۔ لنڈن کا اکسچینج یا سٹن کی منڈیاں۔ افریقہ کے جنگل صحرا کے ریگستان۔ جاپان کی گلکاریاں چین کے دریائی شہر۔ جنوبی امریکہ کے مردم خوار۔ قاف کی پریاں۔ الاپ لینڈ کے سمور پوش انسان اور ایسے صدہا عجیب و دل کش مناظر چلتے پھرتے نظر آتے تھے ملکہ کی سپاہ یہ نظارہ دیکھتے ہی بے خود ہوکر اس کی طرف دوڑی۔ کسی کو سر پیر کی سدھ نہ رہی۔ لوگوں نے بندوقیں پھینک دیں۔ تلواریں اور کرچیں اتار پھینکیں اور بے تحاشا ان مناظر کے چاروں طرف جمع ہوگئے۔ کوئی رقاصوں کی شیریں اداؤں اور نازک خرامیوں پر فریفتہ ہوا۔ کوئی تھیٹر کے تماشوں پر ریجھا۔ کچھ لوگ تیتروں اور بٹیروں کے جوڑ دیکھنے لگے۔ اور تب سب کے سب نقش دیوار کی طرح بے حس و حرکت کھڑے رہ گئے۔ ملکہ اپنے ہوائی جہاز پر بیٹھی کبھی تھیٹر کی طرف جاتی۔ کبھی سرکس کی طرف دوڑتی یہاں تک کہ وہ بھی بے ہوش ہوگئی۔!

لوچن داس جب مظفر و منصور قصر شاہی میں داخل ہوگیا۔ تو ملکہ کی آنکھیں کھلیں۔ اُس نے کہا " ہائے وہ تماشے کہاں گئے۔ وہ دل کش مناظر وہ جان فریب نیرنگیاں کہاں غائب ہوگئیں۔ میرا راج جاتے یا پاٹ جاتے۔ لیکن میں یہ سیر ضرور دیکھوں گی۔ مجھے آج معلوم ہوا ہے کہ زندگی میں کیا کیا مزے ہیں!

سپاہی بھی بیدار ہوئے۔ انہوں نے یک زبان ہوکر کہا " ہم وہی سیر و تماشا دیکھیں گے۔ ہمیں جنگ سے کچھ غرض نہیں۔ ہم کو آزادی کی پروا نہیں ہم غلام ہوکر رہیں گے۔ پیروں میں بیڑیاں پہنیں گے۔ پر ان دلفریبیوں کے بغیر نہیں رہ سکتے!"

(۴)

ملکہ مخمور کو اپنی سلطنت کا یہ حال دیکھ کر بہت قلق ہوتا۔ وہ سوچتی۔ کیا اسی طرح سارا ملک میرے ہاتھ سے نکل جائے گا؟ اگر شاہ مسرور نے یوں کنارہ نہ کر لیا ہوتا۔ تو سلطنت کی یہ حالت کبھی نہ ہوتی۔ کیا انہیں یہ کیفیتیں معلوم نہ ہوں گی۔ یہاں سے دم دم کی خبریں ان کے پاس جاتی ہیں۔ مگر ذرا بھی جنبش نہیں کرتے۔ کتنے بے رحم ہیں۔ خیر جو کچھ سر پر آئے گی سہ لونگی۔ پر ان کی منت نہ کروں گی۔

لیکن جب وہ دلفریب نغمے سنتی اور دلکش مناظر دیکھتی۔ تو یہ اندوہناک خیالات فراموش ہو جاتے۔ اُسے اپنی زندگی نہایت پر لطف معلوم ہوتی۔

بوالہوس خاں نے لکھا۔ میں دشمنوں سے گھر گیا ہوں۔ نفرت علی اور کین خاں اور جوالا سنگھ نے چاروں طرف سے یورش شروع کر دی ہے۔ جب تک اور کمک نہ آئے۔ میں معذور ہوں۔ پر ملکہ کی سپاہ یہ سیر اور نغمے چھوڑ کر جانے پر راضی نہ ہوتی تھی۔

اتنے میں دو صوبے داروں نے پھر بغاوت کی۔ مرزا شمیم اور رس راج سنگھ دونوں متحد ہو کر دار الخلافہ پر چڑھے۔ ملکہ کی سپاہ میں اب نہ غیرت تھی نہ شجاعت نغمہ و سیر نے انہیں آرام طلب بنا دیا تھا۔ بہ مشکل تمام سج سجا کر میدان میں نکلے۔ غنیم کی فوج منتظر کھڑی تھی۔ لیکن نہ کسی کے پاس تلوار تھی۔ نہ بندوق۔ سپاہیوں کے ہاتھوں میں پھولوں کے خوشنما گلدستے تھے۔ کسی کے ہاتھ میں عطر کی شیشیاں۔ کسی کے ہاتھ میں گلاب کے فوارے۔ کہیں لوینڈر کی بوتلیں۔ کہیں

مشک وغیرہ کی بہار۔ سارا میدان طبلۂ عطار بنا ہوا تھا۔ دوسری طرف رس راج کی سپاہ تھی۔ ان سپاہیوں کے ہاتھوں میں طلائی خوان تھے۔ زربفت کے خوان پوشوں سے ڈھکے ہوئے۔ کسی میں فرنی و بالائی تھی۔ کسی میں قورمے اور کباب کسی میں خوبانی و انگور۔ کہیں کشمیری نعمتیں سجی ہوئی تھیں۔ کہیں اطالوی لوزیات کی بہار تھی۔ اور کہیں پرتگال و فرانس کی شرابیں شیشوں میں مہک رہی تھیں۔

ملکہ کی سپاہ وہ بوئے جاں پرور سونگھتے ہی متوالی ہو گئی۔ لوگوں نے ہتھیار پھینک دیئے اور ان ملذذات کی طرف دوڑے۔ کوئی حلوے پر گرا۔ کوئی بالائی پر ٹوٹا۔ کسی نے قورمے اور کباب پر ہاتھ بڑھائے۔ کوئی خوبانی و انگور چکھنے لگا۔ کوئی کشمیری لوزیات پر لپکا۔ ساری سپاہ بھک منگوں کی طرح ہاتھ پھیلائے یہ نعمتیں مانگتی تھی ۔ اور کمال اشتیاق سے کھاتی تھی۔ ایک ایک لقمہ کے لئے ایک چمچہ فرنی کے لئے ایک ساغر کے لئے خوشامدیں کرتے تھے ناکیں رگڑتے تھے۔ سجدے کرتے تھے ۔ یہاں تک کہ ساری فوج پر ایک نشہ طاری ہو گیا۔ بے دم ہو کر گر پڑی۔ ملکہ بھی اطالوی مطبخوں کے سامنے ہاتھ پھیلا پھیلا کر منتیں کرتی تھی۔ اور کہتی تھی۔ صرف ایک لقمہ اور ایک پیالہ اور میرا راج لو۔ پاٹ لو۔ میرا سب کچھ لے لو۔ لیکن مجھے سیر ہونے دو۔ یہاں تک کہ وہ بھی بے ہوش ہو کر گر پڑی۔

(۵)

ملکہ کی حالت اب نہایت دردناک تھی۔ اس کی سلطنت کا ایک قلیل حصہ دشمنوں کی دست برد سے بچا ہوا تھا۔ اُسے ایک دم کے لئے بھی اس غلامی سے نجات نہ ملتی۔ کبھی کرن سنگھ کے دربار میں حاضر ہوتی۔ کبھی مرزا شمیم کی خوشامد

کرتی ۔ اس کے بغیر اسے چین نہ آتا ۔ ہاں جب کبھی اس سخن سازی اور ذلت سے اس کی طبیعت آزردہ ہوتی تو وہ اکیلے بیٹھ کر گھنٹوں روتی اور چاہتی کہ جا کر شاہ مسرور کو منا لاؤں ۔ اسے یقین تھا کہ ان کے آتے ہی باغی کافور ہو جائیں گے ۔ پر ایک ہی لمحہ میں اس کی طبیعت بدل جاتی ۔ اسے اب کسی حالت پر قرار نہ تھا ۔

ابھی تک بوالہوس خاں کی اطاعت میں فرق نہ آیا تھا ۔ لیکن جب اس نے سلطنت کا یہ ضعف دیکھا ۔ تو وہ بھی بغاوت کر بیٹھا ۔ اس کی آزمودہ کار فوج کے مقابلہ میں ملکہ کی سپاہ کیا ٹھہرتی ۔ پہلے ہی حملے میں قدم اکھڑ گئے ۔ ملکہ خود گرفتار ہو گئی ۔ بوالہوس خاں نے اسے ایک طلسماتی قید خانہ میں بند کر دیا ۔ محکوم سے حاکم بن بیٹھا ۔

یہ قید خانہ اتنا وسیع تھا کہ کوئی قیدی کتنا ہی بھاگنے کی کوشش کرے اس کی چہار دیواری سے باہر نہیں نکل سکتا تھا ۔ وہاں محافظ اور پاسبان نہ تھے لیکن وہاں کی ہوا میں ایک کشش تھی ۔ ملکہ کے پیروں میں نہ بیڑیاں تھیں ۔ نہ ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ۔ لیکن جسم کا ایک ایک عضو تاروں سے بندھا ہوا تھا ۔ وہ اپنی خواہش سے ہل بھی نہ سکتی تھی ۔ وہ اب دن دن بیٹھی ہوئی زمین پر مٹی کے گھروندے بنایا کرتی اور سمجھتی ۔ یہ محل ہیں ۔ طرح طرح کے سوانگ بھرتی اور سمجھتی دنیا مجھے دیکھ کر لٹو ہوئی جاتی ہے ۔ سنگ ریزوں سے اپنا جسم گوندھ لیتی اور سمجھتی کہ اب حوریں بھی میرے سامنے مات ہیں ۔ وہ درختوں سے پوچھتی ۔ میں کتنی خوبصورت ہوں ؟ شاخوں پر بیٹھی ہوئی چڑیوں سے پوچھتی ایسا جواہر نگار گلوبند تم نے دیکھا ہے ؟ مٹی کے ٹھیکروں کا انبار لگاتی اور آسمان سے پوچھتی ۔ اتنی دولت تو نے دیکھی ہے ؟

معلوم نہیں - اس حالت میں کتنے دن گزر گئے - مرزا شمیم لوچن داس وغیرہ ہر دم اسے گھیرے رہتے تھے - شاید وہ اُس سے خائف تھے - سمجھتے تھے - ایسا نہ ہو - یہ شاہ مسرور سے نامہ و پیام کرے - تبدیں بھی اس اس پر اعتبار نہ تھا - یہاں تک کہ ملکہ کی طبیعت اس قید سے بیزار ہو گئی - وہ نکل بھاگنے کی تدبیریں سوچنے لگی +

اسی حالت میں ایک دن ملکہ بیٹھی سوچ رہی تھی - میں کیا تھی - کیا ہو گئی جو میرے اشاروں کے غلام تھے - وہ میرے آقا ہیں - مجھے جس کل چاہتے ہیں - بٹھاتے ہیں - جہاں چاہتے ہیں گھماتے ہیں - افسوس! میں نے شاہ مسرور کا کہنا نہ مانا - یہ اسی کی سزا ہے - کاش ایک بار مجھے کسی طرح اس قید سے نجات ہو جاتی - تو میں چل کر ان قدموں پر سر رکھ دیتی اور کہتی - لونڈی کی خطا معاف کیجئے - میں خون کے آنسو روتی - اور انہیں منالاتی - اور پھر کبھی ان کے حکم سے انحراف نہ کرتی - میں نے اس نمک حرام بوالہوس خاں کی باتوں میں پڑ کر انہیں جلا وطن کر دیا - میری عقل کہاں چلی گئی تھی -

یہ سوچتے سوچتے ملکہ رونے لگی - کہ یکایک اس نے دیکھا - سامنے ایک شگفتہ رو سنجیدہ سادہ پوش مرد کھڑا ہے - ملکہ نے متحیر ہو کر پُوچھا - آپ کون ہیں؟ یہاں میں نے آپ کو کبھی نہیں دیکھا"

مرد - ہاں میں اس قید خانہ میں بہت کم آتا ہوں - میرا کام ہے کہ جب قیدیوں کی طبیعت یہاں سے بیزار ہو - تو انہیں یہاں سے نکلنے میں مدد دوں +

ملکہ - آپ کا نام؟

مرد - سنتوکھ سنگھ +

ملکہ۔ آپ مجھے اس قید سے نجات دلا سکتے ہیں؟

سفنتو کھ۔ ہاں میرا تو کام ہی یہ ہے۔ لیکن میری ہدایتوں پر چلنا پڑیگا۔

ملکہ۔ میں آپ کے حکم سے سرمو بھی تجاوز نہ کروں گی۔ خدا کے لئے مجھے یہاں سے جلد لے چلئے۔ میں تادم مرگ آپ کی ممنون رہوں گی۔

سفنتو کھ۔ آپ کہاں چلنا چاہتی ہیں؟

ملکہ۔ میں شاہ مسرور کی خدمت میں جانا چاہتی ہوں۔ آپ کو معلوم ہے۔ وہ آج کل کہاں ہیں؟

سفنتو کھ۔ ہاں معلوم ہے۔ میں ان کا خادم ہوں۔ انہی کی طرف سے میں اس کام پر مامور ہوں۔

ملکہ۔ تو لِلّٰہ مجھے جلد لے چلئے۔ مجھے اب یہاں ایک لمحہ رہنا بھی شاق ہے۔

سفنتو کھ۔ اچھا تو یہ ریشمی کپڑے اور یہ جواہرات اور طلائی زیور اتار کر پھینک دو۔ بوالہوس نے انہیں زنجیروں سے تمہیں جکڑ دیا ہے۔ موٹے سے موٹا کپڑا جو مل سکے پہن لو۔ ان مٹی کے گھروندوں کو گرا دو۔ عطر اور گلاب کی شیشیاں۔ صابون کی بٹیاں اور یہ پاؤڈر کے ڈبے سب پھینک دو۔

ملکہ نے شیشیاں اور پاؤڈر کے ٹین تڑاق تڑاق پٹک دیئے۔ طلائی زیورات کو اتار کر دور پھینک دیا۔ کہ اتنے میں بوالہوس خاں زار وقطار روتا ہوا آکر کھڑا ہوا اور ہاتھ باندھ کر کہنے لگا "ملکہ دو جہاں! میں آپ کا ناچیز غلام ہوں۔ آپ مجھ سے ناراض ہیں"۔

ملکہ نے اپنے انتقام کے جوش میں مٹی کے گھروندوں کو پیروں سے ٹھکرا دیا۔ ٹھیکروں کے انبار کو ٹھوکریں مار کر بکھیر دیا۔ بوالہوس کے جسم کا ایک ایک عضو

کٹ کٹ کر گرنے لگا۔ وہ بے دم ہو کر زمین پر گر پڑا۔ اور دم کی دم میں جہنم واصل ہو گیا +

سنتوکھ سنگھ نے ملکہ سے کہا "دیکھا تم نے؟ اس دشمن کو تم کتنا خوفناک سمجھتی تھیں۔ آن کی آن میں خاک میں مل گیا"+

ملکہ۔ کاش مجھے یہ حکمت معلوم ہوتی۔ تو میں کبھی کی آزاد ہو جاتی۔ لیکن ابھی اور بھی تو کتنے ہی دشمن ہیں +

سنتوکھ۔ ان کا ہلاک کرنا اس سے بھی آسان ہے۔ چلو کرن سنگھ کے پاس۔ جوں ہی وہ اپنے سہرا لاپنے لگے اور میٹھی میٹھی باتیں کرنے لگے۔ کانوں پر ہاتھ رکھ لو۔ دیکھو پردۂ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے +

ملکہ کرن سنگھ کے دربار میں پہنچی۔ اسے دیکھتے ہی چاروں طرف سے دھر پت اور تلانے کے وار ہونے لگے۔ پیانو بجنے لگے۔ ملکہ نے دونوں کان بند کر لئے۔ کرن سنگھ کے دربار میں آگ کا شعلہ اُٹھنے لگا۔ سارے درباری جلنے لگے۔ کرن سنگھ دوڑا ہوا آیا۔ اور نہایت عاجزی سے ملکہ کے پیروں پر گر کر بولا۔ حضور اس دیرینہ غلام پر رحم کریں۔ کانوں پر سے ہاتھ ہٹا لیں ورنہ اس غریب کی جان پر بن جائے گی۔ اب کبھی حضور کی شان میں یہ گستاخی نہ ہو گی +

ملکہ نے کہا "اچھا جا۔ تیری جان بخشی کی۔ اب کبھی بغاوت نہ کرنا۔ ورنہ جان سے ہاتھ دھوئے گا"+

کرن سنگھ نے سنتوکھ سنگھ کی طرف قہر کی نگاہوں سے دیکھ کر صرف اتنا کہا "ظالم! تجھے موت بھی نہیں آتی"۔ اور بے تحاشا گرتا پڑتا بھاگا۔ سنتوکھ سنگھ نے ملکہ سے کہا "دیکھا! تم نے ان کا ہلاک کرنا کتنا آسان تھا؟ اب چلو چند اس

کے پاس ۔ جوں ہی وہ اپنے کرشمے دکھانے لگے ۔ دونوں آنکھیں بند کرلینا“۔

ملکہ لوچن داس کے دربار میں پہنچی ۔ اُسے دیکھتے ہی لوچن نے اپنی قوت کا اظہار کرنا شروع کیا ۔ ڈرامے ہونے لگے ۔ رقاصوں نے تھرکنا شروع کیا ۔ لعل و زمرد کی کشتیاں سامنے آنے لگیں ۔ لیکن ملکہ نے دونوں آنکھیں بند کرلیں ۔

آن کی آن میں وہ ڈرامے اور سرکس اور رقاصوں کے گروہ خاک میں مل گئے لوچن داس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں ۔ مایوسانہ استقلال کے ساتھ چلا چلا کر کہنے لگا ۔ ”یہ تماشا دیکھو ۔ یہ پیرس کے تھوے خانے ۔ یہ مس ایلین کا ناچ ہے ۔ دیکھو ۔ انگریز روسا اس پر کتنی فیاضی سے زر جواہر نثار کررہے ہیں جس نے یہ سیر و تماشے نہ دیکھے ۔ اس کی زندگی موت سے بدتر“۔ لیکن ملکہ نے آنکھیں نہ کھولیں ۔

تب لوچن داس بدحواس و مضطرب شاہ بید کی طرح کانپتا ہوا ملکہ کے سامنے آکھڑا ہوگیا ۔ اور دست بستہ بولا ”حضور! آنکھیں کھولیں ۔ اس بے بینہ غلام پر رحم فرمائیں ۔ نہیں تو میری جان بربن جائے گی ۔ غلام کی گستاخیاں معاف فرمائیں ۔ اب یہ بے ادبی نہ ہوگی“۔

ملکہ نے کہا ”اچھا جا تیری جان بخشی ۔ لیکن خبردار اب سر نہ اٹھانا ۔ نہیں تو جہنم واصل کردوں گی“۔

لوچن داس یہ سنتے ہی گرتا پڑتا جان لے کر بھاگا ۔ پیچھے پھر کر بھی نہ دیکھا سنتو کھ سنگھ نے ملکہ سے کہا ”اب چلو ۔ مرزا شمیم اور رس راج کے پاس ۔ وہاں ایک ہاتھ سے ناک بند کرلینا ۔ اور دوسرے ہاتھ سے خوانِ لطیف کو زمین پر گرا دینا“۔

ملکہ رس راج اور شمیم کے دربار میں پہنچی۔ انہوں نے جو سنتو کھ کو ملکہ کے ساتھ دیکھا تو ہوش اڑ گئے۔ مرزا شمیم نے مشک اور زعفران کی روح پرور لپٹیں اڑانا شروع کیں۔ رس راج ملذذ نعمتوں کے خوان سجا سجا کر ملکہ کے سامنے لانے لگا۔ اور ان کی تعریف کرنے لگا۔ "یہ پرتگال کی سہ آتشہ ہے اسے پئے تو پیر جوان ہو جائے۔ یہ فرانس کا شامپین ہے۔ اسے پیئے تو مردہ زندہ ہو جائے۔ یہ متھرا کے پیڑے ہیں۔ انہیں کھائے تو بہشت کی نعمتوں کو بھول جائے۔" لیکن ملکہ نے ایک ہاتھ سے ناک بند کر لی۔ اور دوسرے ہاتھ سے ان خوانوں کو زمین پر گرا دیا۔ اور بوتلوں کو ٹھوکریں مار مار کر چور کر دیا۔ جوں جوں اس کی ٹھوکریں پڑتی تھیں۔ دربار کے درباری چیخ چیخ کر بھاگتے تھے۔ آخر مرزا شمیم اور رس راج دونوں خستہ اور بے حال سر سے خون جاری۔ اعضا شکستہ آ کر ملکہ کے سامنے کھڑے ہو گئے اور گڑ گڑا کر بولے "حضور غلاموں پر رحم کریں۔ حضور کی شان میں جو گستاخیاں ہوئی ہیں۔ انہیں معاف فرمائیں۔ اب پھر ایسی بے ادبی نہ ہو گی"

ملکہ نے کہا "رس راج کو میں جان سے مارنا چاہتی ہوں۔ اس کے باعث مجھے ذلیل ہونا پڑا تھا۔"

لیکن سنتوکھ سنگھ نے منع کیا "نہیں اسے جان سے نہ ماریئے۔ اس طرح کا خادم ملنا دشوار ہے۔ یہ آپ کے سب صوبہ دار اپنے کام میں یگانہ روزگار ہیں۔ صرف انہیں قابو میں رکھنے کی ضرورت ہے۔"

ملکہ نے کہا۔ "اچھا جاؤ تم دونوں کی بھی جاں بخشی کی۔ لیکن خبردار اب فتنہ و فساد نہ کرنا۔ ورنہ تم جانوگے"

دونوں گرتے پڑتے بھاگے اور دم کے دم میں نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

ملکہ کی رعایا اور سپاہ نے نذریں گزرانیں۔ گھر گھر شادیانے بجنے لگے۔

چاروں باغی صوبیدار شہر پناہ کے پاس چھاپہ مارنے کی گھات میں بیٹھ گئے۔ لیکن سنتوکھ سنگھ جب رعایا اور سپاہ کو مسجد میں شکریہ کی نماز ادا کرنے کے لئے لے گیا۔ تو باغیوں کو کوئی امید نہ رہی۔ وہ مایوس ہو کر چلے گئے۔

جب ان مراسم سے فرصت ہوئی۔ تو ملکہ نے سنتوکھ سنگھ سے کہا:۔

"میرے پاس الفاظ نہیں ہیں اور نہ الفاظ میں اتنی طاقت ہے کہ میں آپ کے احسانوں کا شکریہ ادا کر سکوں۔ آپ نے مجھے غلامی سے نجات دی۔ میں دمِ آخر آپ کا جس گاؤں گی۔ اب شاہ مسرور کے پاس مجھے لے چلئے۔ میں ان کی خدمت کر کے اپنی عمر بسر کرنی چاہتی ہوں۔ ان سے منحرف ہو کر میں نے بہت ذلت اور مصیبت جھیلی۔ اب کبھی ان کے قدموں سے جدا نہ ہوں گی۔"

سنتوکھ سنگھ "ہاں ہاں چلئے۔ میں تیار ہوں۔ لیکن منزل سخت ہے۔ گھبرانا مت۔"

ملکہ نے ہوائی جہاز منگوایا۔ پر سنتوکھ سنگھ نے کہا "وہاں ہوائی جہاز کا گزر نہیں ہے۔ پیدل چلنا پڑے گا۔ ملکہ نے مجبور ہو کر ہوائی جہاز واپس کر دیا اور یکہ و تنہا اپنے آقا کو منانے چلی۔

وہ دن بھر بھوکی پیاسی پیادہ پا چلتی رہی۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ پیاس سے حلق میں کانٹے پڑنے لگے۔ کانٹوں سے پیر چھلنی ہو گئے اس نے اپنے رہنما سے پوچھا "ابھی کتنی دور ہے"؟

سنتوکھ۔ ابھی بہت دور ہے۔ چپ چاپ چلی جاؤ۔ یہاں باتیں کرنے سے منزل کھوٹی ہو جاتی ہے۔

رات ہوئی۔ آسمان پر بادل چھا گئے۔ سامنے ایک دریا پڑا۔ کشتی کا پتہ نہ تھا۔ ملکہ نے پوچھا "کشتی کہاں ہے"؟

سنتوکھ نے کہا "دریا میں چلنا پڑے گا۔ یہاں کشتی کہاں؟"
ملکہ کو خوف معلوم ہوا۔ لیکن وہ جان پر کھیل کر دریا میں چل پڑی۔ معلوم ہوا کہ صرف آنکھ کا دھوکا تھا۔ وہ ریتیلی زمین تھی۔ ساری رات سنتوکھ سنگھ نے ایک لمحہ کے لئے بھی دم نہ لیا۔ جب ستارۂ صبح نکل آیا۔ تو ملکہ نے رو کر کہا۔ "ابھی کتنی دور ہے؟ میں تو مری جاتی ہوں"۔
سنتوکھ سنگھ نے جواب دیا "چپ چاپ چلی آؤ"۔
ملکہ نے ہمت کرکے پھر قدم بڑھائے۔ اس نے مصمم ارادہ کر لیا تھا۔ کہ راستہ میں مر ہی کیوں نہ جاؤں۔ پر ناکام نہ لوٹوں گی۔ اس قید سے بچنے کے لئے وہ کڑی سے کڑی مصیبتیں جھیلنے کو تیار تھی۔
آفتاب طلوع ہوا۔ سامنے ایک عمودی پہاڑ نظر آیا۔ جس کی چوٹیاں آسمان میں گھسی ہوئی تھیں۔ سنتوکھ سنگھ نے پوچھا "اسی پہاڑ کی سب سے اونچی چوٹی پر شاہ مسرور ملیں گے۔ چڑھ سکو گی؟"
ملکہ نے استقلال سے کہا "ہاں چڑھنے کی کوشش کروں گی"۔
بادشاہ کی ملاقات ہونے کی امید نے اس کے بے جان پیروں میں پر لگا دئے وہ تیزی سے قدم اٹھا کر پہاڑ پر چڑھنے لگی۔ کمر کوہ تک آتے آتے وہ تھک کر بیٹھ گئی۔ غش آ گیا۔ معلوم ہوا۔ کہ دم نکل رہا ہے۔ اس نے مایوسانہ نگاہوں سے اپنے رفیق کو دیکھا۔ سنتوکھ سنگھ نے کہا "ایک بار اور ہمت کرو۔ دل میں خدا کی یاد کرو"۔
ملکہ نے خدا کی یاد کی۔ اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ وہ پھرتی سے اٹھی اور ایک ہی ہلے میں چوٹی پر جا پہنچی۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ وہاں پاکیزہ ہوا میں سانس لیتے ہی ملکہ کو جسم میں ایک نئی زندگی کا احساس ہوا۔ اس کا چہرہ

روشن ہوگیا۔ ایسا معلوم ہونے لگا کہ میں چاہوں تو ہوا میں اُڑ سکتی ہوں۔ اُس نے خوش ہوکر سنتوکھ سنگھ کی طرف دیکھا۔ اور دریائے حیرت میں غرق ہوگئی۔ جسم وہی تھا۔ پر چہرہ شاہ مسرور کا تھا۔ ملکہ نے پھر اس کی طرف استعجاب کی نگاہ سے دیکھا۔ سنتوکھ سنگھ کے جسم پر سے ایک بادل کا پردہ ہٹ گیا۔ اور ملکہ کو وہاں شاہ مسرور کھڑے نظر آئے۔ وہی ہلکا زرد کرتا۔ وہی گیروے رنگ کی تہمد۔ ان کی صورت سے جلال برستا تھا۔ پیشانی ستارہ کی طرح درخشاں تھی۔ ملکہ ان کے قدموں پر گر پڑی۔ شاہ مسرور نے اسے سینہ سے لگالیا +

درگا کا مندر

(۱)

بابو برج ناتھ قانون کے مطالعہ میں مصروف تھے۔ اور ان کے دونوں بچے قانونی سیاست کی ضرورت ثابت کرنے میں۔ شیاما چلّاتی تھی۔ منو میری گڑیا نہیں دیتا۔ منو روتا تھا۔ شیاما نے میری مٹھائی کھالی۔ برج ناتھ نے ناراض ہو کر بھامنا سے کہا۔ تم ان شیطانوں کو یہاں سے ہٹاتی ہو کہ نہیں۔ ورنہ میں ایک ایک کی خبر لونگا۔ بھامنا چولہے میں آگ جلا رہی تھی۔ بولی "ارے تو اب شام کو بھی کیا پڑھتے ہی رہو گے؟ ذرا دیر کے لئے تو دم لے لو۔"

برج ناتھ۔ ذرا سا اُٹھا نہ جائے گا۔ بیٹھی بیٹھی وہاں سے قانون بگھار رہی ہو۔ ابھی ایک آدھ کو ٹپک دونگا۔ تو وہاں سے گرجتی ہوئی آؤگی۔ کہ ہائے

ہائے بچے کو مار مار کر اَدھ مؤا کر دیا ۔

بھاما۔ تو میں کچھ بیٹھی یا سوئی تو ہوں نہیں۔ ذرا ایک گھڑی تمہیں لڑکوں کو بہلا دوگے۔ تو کیا ہوگا؟ کچھ میں نے ہی تو ان کی نوکری نہیں لکھائی ہے ۔

بابو برج ناتھ لاجواب ہو گئے۔ غصہ پانی کی طرح روانی کا موقع نہ پاکر اور بھی پُر زور ہو جاتا ہے۔ گو قانونی اصولوں کے ماہر تھے۔ لیکن اس وقت آئین انصاف کی پابندی میں خیریت نہ نظر آئی۔ مدعی اور مدعا علیہ دونوں کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکا۔ اور دونوں کو روتے پیٹتے چھوڑ قانون شہادت بغل میں دبا، کالج پارک کی راہ لی ۔

(۲)

ساون کا مہینہ تھا۔ آج کئی دن کے بعد بادل کھلے تھے۔ سیر و تفریح کا شوق امنگوں پر تھا۔ ہرے بھرے درخت سنہری چادریں اوڑھے کھڑے تھے ہوا ساون کے راگ گاتی تھی اور بگلے ڈالیوں پر بیٹھے ہوئے ہنڈولے جھول رہے تھے ۔

برج ناتھ ایک بنچ پر جا بیٹھے اور کتاب کھولی۔ لیکن اس مطالعہ کے مقابلے میں صحیفۂ قدرت کا مطالعہ زیادہ دلاویز تھا۔ کبھی آسمان کو پڑھتے تھے۔ کبھی پتیوں کو۔ کبھی سبزہ کو اور کبھی سامنے میدان میں کھیلتے ہوئے لڑکوں کو دفعتہً سامنے سرخ روش پر انہیں کاغذ کی ایک پڑیا نظر آئی۔ نفس نے اشتیاق کے پردہ میں کہا۔ دیکھیں۔ اس میں کیا ہے؟ عقل نے کہا۔ اس سے مطلب؟ پڑی رہنے دو ۔

لیکن اشتیاق غالب آیا۔ اٹھے اور پڑیا اُٹھا لی۔ اس میں وزن تھا۔ شاید کسی کے پیسے پڑیا میں لپیٹے ہوئے گر پڑے ہیں۔ کھول کر دیکھا۔ پیسے نہیں

ساورن تھے۔ گنا۔ پورے آٹھ نکلے ٭

برج ناتھ کا دل دھڑکنے لگا۔ آٹھوں ساورن ہاتھ میں لیے وہ سوچنے لگے۔ انہیں کیا کروں؟ اگر یہیں رکھ دوں۔ تو نہ معلوم کس کی نظر پڑے۔ نہ معلوم کون اٹھا لے جائے۔ یہاں رکھنا قرین مصلحت نہیں۔ چلوں تھانے میں اس کی اطلاع کر دوں اور یہ اشرفیاں تھانہ دار کی امانت میں رکھ دوں۔ جس کی ہوں گی۔ وہ آپ لے جائیگا یا اگر اسے نہ بھی ملیں تو میرے سر تو کوئی الزام نہ رہے گا۔ میں تو اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جاؤں گا ٭

نفس نے پردہ کی آڑ سے منتر مارنا شروع کیا۔ وہ تھانہ نہ گئے۔ سوچے چلوں۔ بھاما سے یہ کیفیت بیان کروں۔ کھانا تیار ہوگا۔ کھا کر اطمینان سے تھانہ جاؤں گا ٭

بھاما نے دیکھا۔ سینہ میں ایک گدگدی سی ہوئی۔ بولی "اس وقت جاؤ گے تو آنے میں دیر ہوگی۔ کل سویرے چلے جانا" ٭

برج ناتھ نے بھی سوچا یہی زیادہ مناسب ہے۔ تھانے والے رات کو تو کوئی کارروائی کرینگے نہیں۔ جب اشرفیوں کو پڑا ہی رہنا ہے تو جیسا تھانہ ویسا ہی میرا گھر ٭

اشرفیوں کو صندوق میں رکھ دیا۔ بھاما نے ہنس کر کہا "لاؤ میں اپنے لئے گلوبند بنوا لوں۔ بہت دنوں سے جی ترس رہا ہے۔ آیا دھن کیوں چھوڑ دوں؟"

نفس نے اعلانیہ تحریک نہ کر کے مذاق کی صورت اختیار کی تھی۔

برج ناتھ نے ملامت آمیز لہجہ میں کہا "ہاں اور کیا گلوبند کے شوق میں گلے میں پھانسی لگا لو نا؟"

(۳)

علی الصباح برج ناتھ تھانہ چلنے کے لئے تیار ہوئے۔ سوچا۔ قانون کا ایک لکچر اس کارِ خیر کے نذر سہی۔ وہ الہ آباد ہائی کورٹ کے مترجم تھے۔ ملازمت میں زیادہ ترقی کی امید نہ دیکھ کر سال بھر سے وکالت کی تیاری میں مصروف تھے۔ مگر ابھی کپڑے پہن ہی رہے تھے کہ ان کے ایک دوست منشی گورے لال آکر بیٹھ گئے اور اپنے خانگی تردوات کی ایک طولانی داستان سنانے کے بعد بہت التجا کے ساتھ بولے۔ "بھائی جان اس وقت میں ان زحمتوں میں ایسا پھنس گیا ہوں کہ کچھ عقل کام نہیں کرتی۔ تم بوڑھے آدمی ہو۔ اس وقت کچھ مدد کرو۔ زیادہ نہیں تیس روپیہ دے دو۔ کسی نہ کسی طرح کام چلا لونگا۔ آج تیس ہے۔ کل شام کو تمہیں روپے جبراً و قہراً مل جائیں گے"۔

برج ناتھ بوڑھے آدمی تو نہ تھے۔ لیکن بوڑھے پن کی ہوا باندھ رکھی تھی یہ ان کی رعونت کا تقاضا تھا۔ دوستوں اور شناساؤں کی چھوٹی موٹی ضروریات پر محض اپنا وقارِ ثروت قائم کرنے کے لیے وہ اپنی واقعی ضرورتوں کو قربان کر دیا کرتے تھے۔ لیکن بھاما کو اس معاملہ میں ان سے ہمدردی نہ تھی۔ وہ نمود باطل کے لیے اس نفس کشی کی ضرورت نہ سمجھتی تھی۔ اسی وجہ سے جب برج ناتھ پر اس قسم کا کوئی تقاضا ہوتا تھا۔ تو تھوڑی دیر کے لئے اُن کے گھر میں بدمزگی کی نوبت ضرور آجاتی تھی۔ کیونکہ ان میں انکار کرنے یا ٹالنے کی ہمت نہ تھی۔

کچھ شرماتے ہوئے بھاما کے پاس آئے اور بولے۔ "تمہارے پاس تیس روپے تو نہ ہوں گے؟ منشی گورے لال مانگ رہے ہیں"۔

بھاما نے رکھائی سے کہا۔ "میرے پاس روپے نہیں ہیں"۔

برج ناتھ۔ ہوں گے ضرور۔ بہانہ کرتی ہو۔

بھاما۔ اچھا بہانہ سہی۔

برج ناتھ۔ تو میں ان سے کیا کہہ دوں؟

بھاما۔ کہہ دو۔ گھر میں روپے نہیں ہیں۔ تم سے نہ کہتے بنے۔ تو میں پردہ کی آڑ سے کہہ دوں۔

برج ناتھ۔ کہنے کو تو میں کہہ دوں۔ لیکن انہیں یقین نہ آئے گا۔ سمجھیں گے۔ بہانہ کر رہے ہیں۔

بھاما۔ سمجھیں گے سمجھا کریں۔ اس کا کیا علاج؟

برج ناتھ۔ مجھ سے تو ایسی بے مروتی نہیں ہو سکتی۔ رات دن کا ساتھ ٹھہرا۔ کیسے انکار کروں؟

بھاما۔ اچھا تو جو مزاج میں آئے کرو۔ میں ایک بار کہہ چکی۔ میرے پاس روپے نہیں ہیں۔

برج ناتھ بہت جھنجلائے۔ انہیں یقین تھا کہ بھاما کے پاس روپے ہیں۔ لیکن محض مجھے زچ اور محجوب کرنے کے لیئے اس وقت انکار کر رہی ہے۔ ضد نے ارادہ میں استحکام پیدا کیا۔ صندوق میں سے دو اشرفیاں نکالیں۔ اور گورے لال کو دے کر بولے۔ "بھائی کل شام کو کچہری سے آتے ہی روپے دے دینا۔ یہ ایک شخص کی امانت ہیں۔ اسی وقت دینے جا رہا تھا۔ اگر کل روپے نہ پہنچے۔ تو مجھے سخت ندامت ہوگی۔ کہیں منہ دکھلانے کے لائق نہ رہوں گا"۔

گورے لال نے دل میں کہا "امانت بیوی کے سوا اور کس کی ہوگی"۔ اور اشرفیاں جیب میں رکھ کر گھر کی راہ لی۔

(۴)

آج پہلی تاریخ کی شام ہے۔ بابو برج ناتھ دروازے پر بیٹھے ہوئے

منشی گورے لال کا انتظار کر رہے ہیں۔ پانچ بج گئے۔ گورے لال ابھی تک نظر نہیں آئے ہ

برج ناتھ کی نگاہ راستہ کی طرف لگی ہوئی تھی۔ ہاتھ میں ایک اخبار تھا لیکن پڑھنے میں جی نہ لگتا تھا۔ ہر تیسرے منٹ پر راستہ کی طرف آنکھ اٹھ جاتی تھی۔ لیکن آج تنخواہ تقسیم ہو رہی ہے۔ اسی وجہ سے آنے میں دیر ہوئی ہے۔ آتے ہی ہوں گے ہ

چھ بجے۔ گورے لال کا پتہ نہ تھا۔ کچہری کے عمال ایک ایک کر کے چلے آ رہے تھے۔ برج ناتھ کو کئی بار دھوکا ہوا۔ وہ آ رہے ہیں۔ ضرور وہی ہیں۔ ویسی ہی اچکن ہے۔ ویسی ہی ٹوپی۔ چال بھی وہی ہے۔ ہاں! وہی ہیں۔ اسی طرف آ رہے ہیں۔ دل سے ایک بوجھ سا اتر تا معلوم ہوا۔ لیکن قریب آنے پر معلوم ہوا کہ یہ کوئی اور ہے۔ امید کی خیالی تصویر غائب ہو گئی۔

برج ناتھ کی طبیعت جھنجلانے لگی۔ وہ ایک بار کرسی پر سے اٹھے۔ برآمدہ کے لب پر کھڑے ہو کر سڑک کے دونوں طرف نظریں دوڑائیں۔ کہیں پتہ نہیں دو تین بار دور سے آتے ہوئے یکوں کو دیکھ کر انہیں گورے لال کا وہم ہوا۔ شدت انتظار! سات بجے چراغ جل گئے۔ سڑک پر اندھیرا چھانے لگا۔ برج ناتھ سامنے سڑک پر سراسیمگی کے عالم میں ٹہلنے لگے۔ ارادہ ہوا۔ گورے لال کے گھر چلوں۔ اُدھر قدم بڑھائے۔ لیکن سینہ لرز رہا تھا۔ کہ کہیں وہ راستے میں آتے ہوئے مل جائیں۔ تو سمجھیں کہ چند روپیوں کے لئے یہ اتنے بے صبر ہو گئے۔ چند ہی قدم چلے تھے۔ کہ کسی کو آتے دیکھا۔ وہم ہوا۔ گورے لال ہیں۔ مڑے اور سیدھے برآمدے میں آ کر دم لیا۔ لیکن پھر وہی دھوکا۔ وہی وہم!

تب وہ سوچنے لگے۔ اتنی دیر کیوں ہو رہی ہے؟ کیا ابھی تک وہ کچہری سے

نہ آتے ہوں گے؟ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ ان کے دفتر والے مدت ہوئی نکل گئے
بس دو ہی باتیں ممکن ہیں۔ یا تو انھوں نے صبح آنے کا فیصلہ کر لیا۔ سمجھے ہوں رات
کو کہاں چلوں یا عمداً بیٹھ رہے ہو نگے۔ اس وقت دینا منظور نہ ہوگا۔ کیوں نہ
میں ہی کسی آدمی کو بھیج دوں۔ لیتے وقت ان کو غرض تھی۔ اس وقت میری غرض
ہے۔ لیکن کسے بھیجوں؟ منّو شاید چلا جائے۔ سڑک ہی پر تو مکان ہے۔ کمرہ میں گئے
لیمپ جلایا۔ اور رقعہ لکھنے بیٹھے۔ مگر آنکھیں دروازہ ہی کی طرف لگی ہوئی تھیں۔
دفعتہً کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ فوراً رقعہ کو ایک کتاب کے نیچے دبا
دیا۔ اور برآمدے میں چلے آئے۔ دیکھا تو پڑوس کا ایک کنجڑا ہے۔ تار پڑھانے
آیا ہے۔ اس سے بولے "یار اس وقت فرصت نہیں ہے۔ تھوڑی دیر میں آنا"
اس نے کہا "بابو جی! گھر بھر کے آدمی گھبرائے ہوئے ہیں۔ ذرا ایک نگاہ دیکھ
لیجئے۔" آخر جھنجلا کر اس کے ہاتھ سے تار لے لیا۔ اور سرسری نگاہ سے دیکھ کر بولے
"کلکتہ سے آیا ہے۔ مال نہیں پہنچا"۔ کنجڑے نے ڈرتے ڈرتے کہا "بابو جی اتنا
اور دیکھ لیجئے۔ کس نے بھیجا ہے"۔ اس پر برج ناتھ نے برہم ہو کر تار کا کاغذ
پھینک دیا۔ اور بولے "مجھے اس وقت فرصت نہیں ہے"۔

آٹھ بج گئے۔ کچھ کچھ مایوسی ہونے لگی۔ منّو اتنی رات گئے نہیں جا سکتا
دل نے فیصلہ کیا۔ مجھے خود چلنا چاہیئے۔ بلا سے بُرا ماننے گا۔ اس کی کہاں تک
پروا کروں۔ صاف صاف کہہ دوں گا۔ میرے روپے دے دو۔ شرافت شرفا ہی
سے نبھتی ہے۔ ایسے وعدہ فراموش سے شرافت کا برتاؤ کرنا حماقت ہے۔ اچکن
پہنی۔ گھر میں جا کر بھاما سے کہا "ذرا ایک کام پر باہر جاتا ہوں۔ کواڑ بند
کر لو"۔

چلنے کو تو چلے۔ مگر قدم قدم پر رُکتے جاتے تھے۔ گورے لال کا مکان

دُور سے دکھائی دیا۔ لیمپ جل رہا تھا۔ ٹھٹک گئے۔ سوچنے لگے۔ چل کر کیا کہوں گا۔ کہیں انہوں نے جاتے ہی روپے نکال کر دے دئے اور معذرت کی۔ تو سخت ندامت ہو گی۔ مجھے تنگ ظرف۔ بے صبر۔ اوچھا سمجھے گا۔ نہیں روپیہ کی بات چیت کروں ہی کیوں! سلام کلام کے بعد کہوں گا۔ یار گھر میں شدت سے پیٹ میں درد ہو رہا ہے۔ تمہارے پاس پُرانا تیز سرکہ تو نہیں ہے؟ مگر نہیں۔ یہ حیلہ کچھ بھدا سا معلوم ہوتا ہے۔ صاف پردہ فاش ہو جائے گا۔ اونہہ اس جھنجھٹ کی ضرورت ہی کیا ہے۔ وہ مجھے دیکھ کر خود ہی سمجھ جائیں گے۔ اس معاملہ پر بات چیت کی نوبت ہی نہ آئے گی۔ برج ناتھ اس اُدھیڑ بُن میں آگے بڑھتے چلے جاتے تھے۔ ندی کی لہریں چاروں طرف چلتی ہیں۔ لیکن دھارا اپنا راستہ نہیں چھوڑتی +

گورے لال کا گھر آ گیا۔ دروازہ بند تھا۔ برآمدہ میں لالٹین جل رہی تھی۔ پکارنے کی ہمت نہ پڑی۔ سمجھے کھانا کھا رہے ہونگے۔ دروازہ کے سامنے سے نکل گئے۔ اور آہستہ آہستہ ٹہلتے ہوئے ایک میل تک چلے گئے۔ نو بجنے کی آواز کان میں آئی۔ گورے لال کھانا کھا چکے ہوں گے۔ لوٹ پڑے۔ لیکن دروازہ پر پہنچے۔ تو اندھیرا تھا۔ وہ شعاعِ امید جو پہلے نظر آئی تھی۔ اس وقت بُجھ گئی تھی ایک منٹ تک دُبدھے میں کھڑے رہے۔ آواز دوں؟ ہاں ابھی بہت سویرا ہے۔ اتنی جلدی تھوڑے ہی سو گئے ہونگے۔ دبے پاؤں برآمدے پر چڑھے دروازہ پر کان لگا کر سُنا۔ چوروں کی طرح چونک چونک کر چاروں طرف دیکھ رہے تھے۔ کہ کہیں کسی کی نگاہ نہ پڑ جائے۔ دفعتاً کچھ بات چیت کی بھنک کان میں پڑی۔ دھیان سے سُنا۔ ایک عورت کہہ رہی تھی۔ "روپے تو سب خرچ ہو گئے۔ برج ناتھ کو کہاں سے دو گے؟ گورے لال نے جواب دیا۔ ایسی کون سی جلدی ہے۔ پھر دے دینگے۔ آج درخواست دے ہی دی ہے۔ کل

منظور ہو جائے گی۔ گھر چل دیں گے۔ تین مہینہ میں لوٹیں گے تو دیکھا جائیگا +

برج ناتھ کو ایسا معلوم ہوا۔ گویا کسی نے مُنہ پر طمانچہ مار دیا۔ کچھ غصّے اور کچھ مایوسی کے عالم میں برآمدے سے اُتر آتے۔ گھر کی طرف چلے تو سیدھے قدم نہ پڑتے تھے۔ جیسے منزلوں کا تھکا ماندہ مسافر ہو +

(۵)

برج ناتھ رات بھر کروٹیں بدلتے رہے۔ کبھی گورے لال کی دغا بازی اور وعدہ فراموشی پر غصّہ آتا۔ کبھی اپنی حماقت پر افسوس۔ معلوم نہیں کس غریب کے روپے ہیں۔ اس پر کیا گزری ہوگی +

مگر اب غم و غصہ سے کیا حاصل؟ روپے بہم پہنچانے کی فکر کرنی چاہیئے کہاں سے آئیں گے؟ بھاما پہلے ہی انکار کر چکی ہے۔ تنخواہ میں اتنی گنجائش نہیں دس پانچ روپے کی بات ہوتی۔ تو کوئی کتر بیونت کرتا۔ کیا کروں۔ کسی سے قرض لوں؟ لیکن مجھے کون دے گا۔ آج تک کسی سے مانگنے کی نوبت نہیں آئی۔ اور اپنا ایسا کوئی دوست بھی تو نہیں۔ جو لوگ ہیں۔ وہ مجھی کو تنگ کیا کرتے ہیں ہاں اگر کچھ دن قانون کو بالائے طاق رکھ کر ترجمہ اور نقل کے کام میں محنت کروں تو البتہ ممکن ہے۔ کم سے کم ایک مہینہ سخت محنت کرنا ہوگی۔ ان سستے مترجموں کے مارے ترجمہ کا نرخ بھی تو گر گیا ہے۔ افسوس اس ظالم گورے لال نے بڑی دغا کی۔ کہیں کا نہ رکھا +

دوسرے دن سے برج ناتھ روپے جمع کرنے کی دُھن میں پڑے۔ صبح کو قانون کے لکچر میں شریک ہوتے۔ شام کو کچہری سے تجاویز کا پلندا گھر لاتے۔ اور بارہ بجے رات تک بیٹھے ترجمے کیا کرتے۔ سر اٹھانے کی فرصت نہ ملتی۔

کبھی ایک اور کبھی دو بھی بج جاتے۔ جب دماغ بالکل کام نہ دیتا۔ تو وہ مجبور ہو کر چارپائی پر پڑ رہتے۔ سر پر ایک جنون سا سوار تھا۔ مگر اتنی محنت کے عادی نہ تھے۔ کبھی سر میں درد ہونے لگتا۔ کبھی ہاضمے میں فتور پیدا ہو جاتا۔ کبھی حرارت آ جاتی۔ تاہم وہ مشین کی طرح اپنے کام میں لگے رہتے۔ بھاما اکثر جھنجلا کر کہتی "اجی لیٹ بھی رہو۔ بڑے دھرماتما بنے ہو۔ تمہارے ایسے دس پانچ آدمی اور ہوتے تو دنیا کا کام ہی بند ہو جاتا"۔ برج ناتھ اس غصہ انگیز مداخلت کا کوئی جواب نہ دیتے۔ علی الصباح پھر وہی چرخہ لے بیٹھتے۔

یہاں تک کہ تین ہفتے گزر گئے۔ اور بمشکل تمام پچیس روپے فراہم ہو سکے۔ برج ناتھ سوچتے تھے۔ دو تین دن میں بیڑا پار ہے۔ مگر اکیسویں دن انہیں شدت سے بخار چڑھ آیا۔ اور تین دن تک نہ اترا۔ رخصت لینا پڑی۔ صاحب فراش ہو گئے۔ بھادوں کا مہینہ تھا۔ بھامانے سمجھا۔ فصلی بخار کا دورہ ہے لیکن جب باوجود ایک ہفتہ تک ڈاکٹر کے متواتر علاج کے بخار میں مطلق افاقہ نہ ہوا۔ تو وہ گھبرائی۔ برج ناتھ اکثر ہذیان بکنے لگتے۔ بھاما سن کر مارے خوف کے کمرہ سے بھاگ جاتی۔ بچوں کو پکڑ کر دوسرے کمرہ میں بند کر دیتی۔ اب اسے شبہ ہوا۔ کہیں یہ آفت انہیں روپیوں کی بدولت تو نہیں آئی ہے کون جانے روپیہ والے نے کچھ کر دھر دیا ہو۔ ضرور یہی بات ہے۔ ورنہ دواؤں سے فائدہ کیوں نہ ہوتا؟ مصیبت پڑنے پر انسان کچھ ضعیف الاعتقاد ہو جاتا ہے۔ دواؤں سے مایوس ہو کر ہم دیوتاؤں کے دامن میں پناہ لیتے ہیں۔ دریا میں جب کشتی ڈگمگانے لگتی ہے۔ تو لوگ منتیں مانتے ہیں۔ بھامانے بھی دیوتاؤں کی منتیں مانیں۔ وہ جنم اشٹمی۔ شیوراتری اور تیجے کے سوا اور کوئی برت نہ رکھتی تھی۔ اب کے اس نے نوراتروں کے برت رکھنا شروع کئے۔

آٹھ دن پورے ہو چکے۔ آخری دن آیا۔ صبح کا وقت تھا۔ بھاما نے برج ناتھ کو دوا پلائی۔ اور درگا جی کی پوجا کرنے مندر چلی۔ اس کا دل آج درگا جی کی عقیدت سے معمور تھا۔ مندر کے صحن میں پہنچی۔ خوب رونق تھی۔ کئی پنڈت آسنوں پر بیٹھے درگا پاٹھ کر رہے تھے۔ دھوپ اور اگر کی خوشبو سے ہوا معطر ہو رہی تھی۔ وہ مندر میں داخل ہوئی۔ سامنے درگا جی کی مورت جلوہ افروز تھی۔ ان کے چہرہ سے ایک نور برس رہا تھا۔ بڑی بڑی روشن آنکھوں سے جلال کی شعاعیں نکل رہی تھیں۔ تقدس کا ایک سماں چھایا ہوا تھا۔ بھاما اس پُر جلال مورت کے سامنے سیدھی آنکھوں سے نہ تاک سکی۔ اس پر رعب احترام طاری ہو گیا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی اور ہاتھ جوڑ کر بولی: "ماتا مجھ پر دیا کرو"۔

اُسے ایسا معلوم ہوا۔ گویا دیوی مسکرائیں۔ ان نور بار آنکھوں سے ایک شعلہ سا نکل کر اپنے دل میں آتا محسوس ہوا۔ اس کے گوشِ دل میں کہیں عالمِ بالا سے ایک صدا آئی۔ "پرایا دھن لوٹا دے۔ تیرا بھلا ہو گا"۔

بھاما اٹھ بیٹھی۔ اس کی آنکھوں میں عقیدت کا سرور جگمگا رہا تھا۔ چہرہ سے تقدس برسا پڑتا تھا۔ دیوی نے شاید اسے اپنے جلال کے رنگ میں ڈبو دیا تھا۔

اتنے میں ایک دوسری عورت مندر میں آئی۔ سر کی سفید لٹیں زرد اور مرجھائی ہوئی چہرہ کے دونوں طرف لٹک رہی تھیں۔ بدن پر صرف ایک سفید ساڑھی تھی۔ ہاتھ میں چوڑیوں کے سوا اور کوئی زیور نہ تھا۔ سانحہ غم کی تصویر معلوم ہوتی تھی۔ اس نے بھی دیوی کے سامنے سر جھکایا۔ اور دونوں ہاتھوں سے آنچل کو پھیلا کر بولی:-

"دیوی! جس نے میرا دھن لیا ہو۔ اس کا ستیاناس کرو"۔

جیسے ستار مضراب کی چوٹ کھا کر تھرتھرا اٹھتا ہے۔ اسی طرح بھاما کا دل خوف سے تھرتھرا اٹھا۔ یہ الفاظ نوک سناں کی طرح اس کے کلیجہ میں چبھے۔ اس نے دیوی کی طرف چشم فریاد سے دیکھا۔ ان کا چہرہ غضب ناک تھا۔ انکی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ اس کے گوشِ دل میں کہیں عالم بالا سے صدا آئی۔ "پرایا دھن لوٹا دے۔ نہیں تیرا ستیاناس ہو جائے گا"۔

بھاما کھڑی ہو گئی۔ اور اس بوڑھی عورت سے بولی "کیوں ماتا! تمہارا دھن کسی نے لیا ہے"؟ ضعیفہ نے اس نگاہ سے اس کی طرف دیکھا۔ گویا ڈوبتے کو تنکے کا سہارا ملا۔ بولی "ہاں بیٹی!"

"کتنے دن ہوئے"؟

"کوئی ڈیڑھ مہینہ ہوا ہو گا"

"کتنے روپے تھے"؟

"پورے ایک سو بیس"

"کیسے کھوئے"؟

"کیا جانے کہیں گر گئے۔ میرے سوامی پلٹن میں نوکر تھے۔ آج کئی برس ہوئے۔ وہ پرلوک سدھارے۔ اب مجھے سرکار سے ساٹھ روپے سالانہ پنشن ملتی ہے۔ اب کے دو سال کی پنشن ایک ہی ساتھ ملی تھی۔ کھجانے (خزانہ) سے روپیہ لے کر آ رہی تھی۔ معلوم نہیں۔ کب اور کہاں کھسل پڑے۔ آٹھوں گنیاں تھیں"۔

بھاما۔ اگر وہ تمہیں مل جائیں۔ تو کیا دو گی"؟

ضعیفہ کا زرد چہرہ یوں کھل گیا۔ جیسے مینہ کے بعد پیڑوں کی پتیاں کھل

جاتی ہیں۔ بجھی ہوئی آنکھیں چمک اُٹھیں ۔ سمٹے ہوئے اعضا پھیل گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کسی منتر سے اس کی عمر گھٹ گئی ہے۔ رخساروں کی جھریاں مٹتی ہوئی معلوم ہوئیں۔ بھاما کی طرف نگاہ احسان سے دیکھ کر بولی ۔ کچھ تمہیں معلوم ہے۔ کس نے پائی ہیں؟"

بھاما ۔"ہاں میرے پتی کو ملی ہیں ۔ وہ تمہیں اسی دن سے ڈھونڈ رہے ہیں"۔

ضعیفہ ۔ بیٹی ڈھیر نہیں ۔ اس میں سے پچاس روپے دے دوں گی ۔

بھاما ۔ روپے کیا ہونگے ۔ کوئی ان سے اچھی چیز دو ۔

ضعیفہ ۔ بیٹی اور کیا دوں ۔ جب تک جیوں گی ۔ تمہارا جس گاؤں گی ۔

بھاما ۔ نہیں اس کی مجھے ضرورت نہیں ۔

ضعیفہ ۔ اس کے سوا میرے پاس اور کیا ہے ؟

بھاما ۔ مجھے اشیرواد دو ۔ میرے پتی بیمار ہیں ۔ وہ اچھے ہو جائیں ۔

ضعیفہ گھٹنے کے بل دیوی کے روبرو بیٹھ گئی ۔ اور آنچل پھیلا کر کانپتی ہوئی آواز سے بولی ۔

" دیوی ان کا کلیان کرو "۔

بھاما نے دیوی کی طرف دیکھا انکے نورانی چہرہ پر محبت کا جلوہ نظر آیا ۔ آنکھوں میں رحم کی روح افزا جھلک تھی ۔ اس کے دل میں کہیں عالم بالا سے صدا آئی ۔"جا تیرا کلیان ہو گا"۔

(۶)

شام ہو گئی ہے۔ بھاما برج ناتھ کے ساتھ یکہ پر بیٹھ کر تلسی کے گھر اُس

کی امانت واپس کرنے جا رہی ہے۔ برج ناتھ کی گاڑھی محنت کی کمائی ڈاکٹر کے نذر ہو چکی ہے۔ امانت میں چالیس روپوں کی کمی تھی۔ بھاما نے اپنے ایک پڑوسی کی معرفت کانوں کے جھومک بیچ کر روپے مہیا کئے ہیں +

جھومک جس وقت بن کر آئے تھے۔ وہ بہت خوش ہوئی تھی۔ آج بیچ کر وہ اس سے کہیں زیادہ خوش ہے۔ جس وقت برج ناتھ نے آٹھوں گنیاں اسے دکھائی تھیں۔ اس کے سینہ میں ایک گدگدی ہوئی تھی۔ لیکن اس خوشی کو چہرہ پر آنے کی جرأت نہ ہوئی تھی۔ آج اس کی خوشی آنکھوں میں چمک رہی ہے۔ ہونٹوں پر ناچ رہی ہے۔ رخساروں کو رنگ رہی ہے۔ اور اعضاء پر کلیلیں کر رہی ہے۔ وہ نفس کی خوشی تھی۔ یہ روح کی خوشی ہے وہ خوشی شرم سے اندر چھپی ہوئی تھی۔ یہ خوشی غرور سے باہر نکلی ہوئی ہے۔

ضعیفہ کی دُعا کا اثر شروع ہو گیا ہے۔ آج صبح کو برج ناتھ پورے تین ہفتہ کے بعد تکیہ کے سہارے بیٹھے۔ وہ بار بار بھاما کی طرف محبت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ وہ آج انہیں دیوی معلوم ہوتی تھی۔ اب تک انہوں نے اس کے حسن ظاہری کا جلوہ دیکھا تھا۔ آج اس کے حُسن باطن کا جلوہ نظر آ رہا ہے۔

تلسی کا مکان ایک گلی میں واقع تھا۔ یکہ سڑک پر جاکر ٹھہر گیا۔ برج ناتھ یکہ سے اُترے۔ اور اپنی چھڑی ٹیکتے ہوئے بھاما کے ہاتھوں کے سہارے تلسی کے گھر پہنچے۔ تلسی نے روپے لئے۔ اور دونوں ہاتھ پھیلا کر دُعا دی۔ ”دُرگا جی تمہارا کلیان کریں“۔

برج ناتھ کی رگوں میں خون تیزی سے دوڑنے لگا۔ اعضاء میں ایک چُستی سی محسوس ہوئی۔ بیماری کا ضعف رخصت ہو گیا +

وہاں سے آکر برج ناتھ دروازے پر بیٹھے ہوئے تھے کہ گورے لال بیٹھے ہوئے نظر آئے۔ برج ناتھ نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔ گورے لال نے کہا۔ بھائی صاحب اب طبیعت کیسی ہے"؟

برج ناتھ نے لاپروائی سے کہا" بہت اچھی طرح سے ہوں"۔

گورے لال۔ مجھے معاف کیجئے گا۔ میں سخت نادم ہوں کہ جلد روپے نہ دے سکا۔ پہلی مارچ کی شام ہی کو گھر سے ایک ضروری خط آگیا اور میں تین مہینے کی رخصت لے کر گھر چلا گیا۔ وہاں سخت پریشانیوں میں مبتلا رہا۔ لیکن آپ کی بیماری کی خبر سن کر آج بھاگا چلا آتا ہوں۔ یہ لیجئے روپے حاضر ہیں۔ اس تاخیر کو معاف فرمایئے!

برج ناتھ نادم ہو گئے۔ بولے" جی ہاں بیمار تو تھا۔ لیکن محض معمولی بخار تھا۔ آپ کو ناحق میری وجہ سے تکلیف ہوئی۔ اگر اس وقت آپ تردد میں ہوں۔ تو روپے پھر دے دیجئے گا۔ میں امانت کے بوجھ سے سبکدوش ہو گیا ہوں۔ اب کوئی جلدی نہیں ہے"۔

گورے لال جب رخصت ہوئے تو برج ناتھ روپے لئے ہوئے اندر آئے۔ اور بھاما سے بولے" آج منشی گورے لال نے روپے دئے ہیں۔ یہ لو تمہارا خسارہ پورا ہو گیا ہے۔ صرف دس روپیہ کی کمی اور ہے"۔

بھاما نے کہا" یہ روپے میرے نہیں ہیں۔ تلسی کے ہیں۔ ایک بار پرایا دھن لے کر سیکھ گئی"۔

" لیکن تلسی کے تو پورے روپے دے دئے گئے"۔

" تو کیا؟ یہ اس کی اشیرباد کا نتیجہ اور ہے"

کان کے جھومک کہاں سے آئیں گے"؟

" اب جھونک نہ پہنوں گی - کان کے جھونک گئے۔ تو کیا ہمیشہ کے لئے
کان تو ہو گئے "

خونِ حرمت

(۱)

میں نے افسانوں اور تاریخوں میں نیرنگیٔ تقدیر کی عجیب و غریب داستانیں پڑھی ہیں۔ شاہ کو گدا اور گدا کو شاہ بنتے دیکھا ہے۔ تقدیر ایک سربستہ راز ہے۔ گلیوں میں ٹکڑے چنتی ہوئی عورتیں تختِ زریں پر متمکن ہو گئی ہیں اور وہ نشۂ ثروت کے متوالے جن کے اشارے پر تقدیر بھی سر جھکاتی تھی۔ آن واحد میں زاغ و زغن کا شکار بن گئے ہیں۔ پر میرے سر پر جو کچھ بیتی اس کی نظیر کہیں نہیں ملتی۔ آہ ان واقعات کو آج یاد کرتی ہوں۔ تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور حیرت ہوتی ہے کہ اب تک میں کیوں اور کیونکر زندہ ہوں۔ حُسن

تمناؤں کا مخرج ہے۔ میرے دل میں کیا کیا تمنائیں نہ تھیں۔ پر آہ! دست بیداد کے ہاتھوں مر مٹیں۔ میں کیا جانتی تھی۔ کہ وہی شخص جو میری ایک ایک ادا پر قربان ہوتا تھا۔ ایک دن مجھے یوں ذلیل و خوار کرے گا +

آج تین سال ہوئے۔ جب میں نے اس گھر میں قدم رکھا۔ اس وقت یہ ایک شگفتہ چمن تھا۔ میں اس چمن کی بلبل تھی۔ ہوا میں اڑتی تھی۔ ڈالیوں پر چہکتی تھی۔ پھولوں پر سوتی تھی۔ سعید میرا تھا۔ میں سعید کی تھی۔ اس حوض بلوریں کے کنارے ہم محبت کے پانسے کھیلتے تھے۔ انہیں روشوں میں الفت کے ترانے گاتے تھے۔ اسی چمن میں ہماری راز و نیاز کی مجلسیں ہوتی تھیں۔ سینوں کے دور چلتے تھے۔ وہ مجھ سے کہتے تھے "تم میری جان ہو"۔ میں ان سے کہتی تھی "تم میرے دلدار ہو"۔ ہماری جائداد وسیع تھی۔ زمانہ کی کوئی فکر۔ زندگی کا کوئی غم نہ تھا۔ ہمارے لئے زندگی ایک لطف مجسم۔ ایک شوق گرسنہ۔ ایک طلسم بہار تھی۔ جس میں مرادیں کھلتی تھیں اور خوشیاں ہنستی تھیں۔ زمانہ ہمارا ہوا خواہ تھا۔ آسمان ہمارا دمساز اور بخت ہمارا ساعد +

ایک دن سعید نے آ کر کہا "جان من! میں تم سے ایک التجا کرنے آیا ہوں۔ دیکھنا مسکراتے ہوئے لبوں پر حرف انکار نہ آئے۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنی ساری ملکیت۔ ساری جائداد تمہارے نام منتقل کر دوں۔ میرے لئے تمہاری محبت کافی ہے۔ یہی میرے لئے نعمت عظمیٰ ہے۔ میں اپنی حقیقت کو مٹا دینا چاہتا ہوں۔ چاہتا ہوں کہ تمہارے دروازے کا فقیر بن کر رہوں۔ تم میری نور جہاں بن جاؤ۔ میں تمہارا سلیم بنوں گا۔ اور تمہارے کف مرجاں کے پیالوں پر عمر بسر کروں گا۔ میری آنکھیں پر آب ہو گئیں۔ مسرتیں اپنے انتہائے عروج پر پہنچ کر قطرۂ اشک بن گئیں +

(۲)

پر ابھی پورا سال بھی نہ گزرا تھا کہ مجھے سعید کے مزاج میں کچھ تغیر نظر آنے لگا۔ ہمارے درمیان کوئی شکر رنجی کوئی بدمزگی نہ ہوئی تھی۔ مگر اب وہ سعید نہ تھا۔ جسے ایک لمحہ کے لئے بھی میری جدائی شاق گزرتی تھی۔ وہ اب رات کی رات غائب رہتا۔ اس کی آنکھوں میں اشتیاق نہ تھا۔ نہ اندازوں میں وہ تشنگی۔ نہ مزاج میں وہ گرمی۔

کچھ دنوں تک اس بے التفاتی نے مجھے خوب رلایا۔ محبت کے مزے یاد آکر تڑپا دیتے۔ میں نے پڑھا تھا کہ محبت لازوال ہوتی ہے۔ کیا وہ سرچشمہ اتنی جلدی خشک ہو گیا؟ آہ نہیں۔ وہ اب بھی موجزن تھا۔ پر اس کا بہاؤ اب کسی دوسری جانب تھا۔ وہ اب کسی دوسرے چمن کو شاداب کرتا تھا۔ آخر میں بھی سعید سے آنکھیں چرانے لگی۔ بے دلی سے نہیں۔ صرف اس لئے کہ اب مجھے اس سے آنکھیں ملانے کی تاب نہ تھی۔ اُسے دیکھتے ہی محبت کے ہزاروں کرشمے نظروں کے سامنے آجاتے۔ اور آنکھیں بھر آتیں۔ میرا دل اب بھی اس کی طرف کھنچتا تھا۔ کبھی کبھی بے اختیار جی چاہتا کہ اس کے پیروں پر گروں۔ اور کہوں۔ میرے دلدار! یہ سرد مہری کیوں؟ یہ بے رحمی کیوں؟ مجھ سے کیا خطا ہوئی ہے؟ لیکن اس خودداری کا برا ہو۔ وہ دیوار حائل بن جاتی تھی۔

یہاں تک کہ رفتہ رفتہ میرے دل میں بھی محبت کی جگہ حسرت نے لے لی۔ صبر مایوس نے دل کو تسکین دی۔ میرے لئے سعید اب گزشتہ بہار کا ایک بھولا ہوا نغمہ تھا۔ سو نہ دل ٹھنڈا ہو گیا۔ شمع محبت بجھ گئی۔ یہی نہیں۔ اس کی عزت بھی میرے دل سے رخصت ہو گئی۔ جو شخص محبت کے پاک مندر میں

کدورت سے پُر ہو۔ وہ ہرگز اس قابل نہیں کہ میں اس کے لیئے گھلوں اور مرُوں ؂

ایک روز شام کے وقت میں اپنے کمرہ میں پلنگ پر پڑی ایک قصہ پڑھ رہی تھی۔ دفعتہً ایک حسین عورت میرے کمرہ میں داخل ہوئی۔ ایسا معلوم ہوا۔ کہ گویا کمرہ جگمگا اُٹھا۔ نورِ حسن نے در و دیوار کو روشن کر دیا۔ گویا ابھی سفیدی ہوئی ہے۔ اس کی مرصع نفاست۔ اس کی دلربا شگفتگی۔ اس کی سرور انگیز ملاحت۔ کس کی تعریف کروں! مجھ پر ایک رعب سا چھا گیا۔ میرا غرورِ حسن خاک میں مل گیا۔ میں متحیر تھی۔ کہ یہ کون نازنین ہے اور یہاں کیونکر آئی؟ بے اختیار اُٹھی کہ اس سے مصافحہ کروں کہ سعید بھی مسکراتا ہوا کمرہ میں آیا۔ میں سمجھ گئی کہ یہ نازنین اس کی معشوقہ ہے۔ میرا غرور جاگ اٹھا۔ میں اُٹھی ضرور۔ پر شان سے گردن اٹھائے ہوئے آنکھوں میں رُعبِ حسن کی جگہ حقارت آ بیٹھی۔ میری نگاہ میں اب وہ نازنین حسن کی دیوی نہیں۔ ڈسنے والی ناگن تھی۔ میں پھر چارپائی پر بیٹھ گئی۔ اور کتاب کھول کر سامنے رکھ لی وہ نازنین ایک لمحہ تک کھڑی میری تصویروں کا ملاحظہ کرتی رہی۔ تب کمرہ سے نکلی۔ چلتے وقت اُس نے ایک بار میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے انگارے نکل رہے تھے۔ جن کی شعاعوں میں قاتلانہ انتقام کی سرخی جھلک رہی تھی۔ میرے دل میں سوال پیدا ہوا۔ سعید اسے یہاں کیوں لایا؟ کیا میرا غرور توڑنے کے لیئے؟

(۳)

اگرچہ ملکیت پر میرا نام تھا۔ پر یہ محض شعبدہ تھا۔ سعید کا تصرف کامل تھا۔ ملازمین بھی اسی کو اپنا آقا سمجھتے تھے۔ اور اکثر میرے ساتھ گستاخی سے پیش آتے۔ میں صبر و توکل کے ساتھ زندگی کے دن کاٹ رہی تھی۔ جب دل

ہیں تمنائیں نہ رہیں تو خلش کیوں ہوتی ؟

ساون کا مہینہ تھا۔ کالی گھٹا چھائی ہوئی تھی اور رم جھم بوندیں پڑ رہی تھیں۔ باغیچہ پر حسرت کی تاریکی اور سیہ پوش درختوں پر شب تاب کیڑوں کی چمک ایسی معلوم ہوتی تھی۔ گویا ان کے منہ سے آہ شرر بار نکل رہی ہے۔ میں دیر تک یہ تماشائے حسرت دیکھتی رہی۔ کیڑے ایک ساتھ چمکتے تھے اور ایک ساتھ بند ہو جاتے تھے۔ گو یا روشنی کی باڑھیں چھوٹ رہی ہیں۔ مجھے بھی جھولا جھولنے اور گانے کا شوق ہوا۔ موسمی کیفیات حسرت زدہ دلوں پر بھی اپنا جادو کر جاتی ہیں۔ باغیچہ میں ایک گول بنگلہ تھا۔ میں اس میں آئی اور برآمدہ کی ایک کڑی میں جھولا ڈلوا کر جھولنے لگی۔ مجھے آج معلوم ہوا کہ حسرت میں بھی ایک روحانی حظ ہوتا ہے۔ جس سے بامراد دل نا آشنا ہوتے ہیں۔ میں دفورِ شوق سے ایک ملار گانے لگی۔ ساون فراق اور غم کا مہینہ ہے۔ گیت میں ایک دل مہجور کی داستان ایسے دردناک لفظوں میں بیان کی گئی تھی کہ بے اختیار آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ اتنے میں باہر سے ایک لالٹین کی روشنی نظر آئی۔ سعید کا ملازم عقب دروازے سے داخل ہوا۔ اس کے پیچھے وہی حسینہ اور سعید دونوں چلے آ رہے تھے۔ حسینہ نے میرے پاس آکر کہا "آج یہاں مجلس نشاط آراستہ ہوگی اور شراب کے دَور چلیں گے"۔ میں نے اندازِ حقارت سے کہا "مُبارک ہو"!

حسینہ۔ بارہ ملے اور ملار کی تانیں اڑیں گی۔ سازندے آ رہے ہیں۔

میں۔ شوق سے۔

حسینہ۔ تمہارا سینہ حسد سے چاک ہو جائے گا۔

سعید نے مجھ سے کہا "زبیدہ تم اپنے کمرہ میں چلی جاؤ۔ یہ اس وقت آپے میں نہیں ہیں"۔

حسینہ نے پھر میری طرف لال لال آنکھیں نکال کر کہا "میں تمہیں اپنے پیروں کی دھول کے برابر بھی نہیں سمجھتی"۔ مجھے یارائے ضبط نہ رہا۔ اکڑ کر بولی۔" اور میں تجھے کیا سمجھتی ہوں۔ ایک کتیا دوسروں کی اُگلی ہوئی ہڈیاں چچوڑتی پھرتی ہے۔

اب سعید کے بھی تیور بدلے۔ میری طرف غضب ناک آنکھوں سے دیکھ کر بولے" زبیدہ تمہارے سر پر شیطان تو نہیں سوار ہے"؟

سعید کا یہ جملہ میرے جگر میں چبھ گیا۔ تڑپ اٹھی۔ جن لبوں سے ہمیشہ الفت و پیار کی باتیں سنی ہوں۔ انہیں سے یہ زہر نکلے اور بالکل بے خطا! کیا میں ایسی ناچیز و حقیر ہو گئی ہوں کہ ایک بازاری عورت بھی مجھے چھیڑ کر گالیاں دے سکتی ہے۔ اور میرا زبان کھولنا منع! میرے دل میں سال بھر سے جو بخار جمع ہو رہا تھا۔ وہ اُبل پڑا۔ میں جھولے سے اتر پڑی۔ اور سعید کی طرف پُر ملامت نگاہوں سے دیکھ کر بولی۔"شیطان! میرے سر پر سوار ہے یا تمہارے سر پر۔ اس کا فیصلہ تم خود کر سکتے ہو۔ سعید! میں تم کو اب تک شریف اور غیور سمجھتی تھی۔ تم نے میرے ساتھ بے وفائی کی۔ اس کا ملال مجھے ضرور تھا۔ مگر میرے خواب و خیال میں کبھی یہ نہ آیا تھا۔ کہ تم غیرت سے اتنے عاری ہو۔ تم ایک حیا فروش عورت کے پیچھے مجھے یوں ذلیل و خفیف کرو گے۔ اس کا بدلہ تمہیں خدا سے ملے گا"!

حسینہ نے تیز ہو کر کہا۔" تو مجھے حیا فروش کہتی ہے"؟

میں۔ بے شک کہتی ہوں"۔

سعید۔"اور میں بے غیرت ہوں"۔

میں۔ بے شک! بے غیرت ہی نہیں۔ شعبدہ باز۔ مکار۔ فاسق سب کچھ ہو۔ یہ الفاظ بہت کریہہ ہیں۔ لیکن میرے غصے کے اظہار کے لئے

کافی نہیں ۔

میں یہ باتیں کہہ ہی رہی تھی ۔ کہ یکایک سعیدہ کے قوی ہیکل ملازم نے میری دونوں باہیں پکڑ لیں ۔ اور دم زدن میں حسینہ نے جھولے کی رسیاں اتار کر مجھے برآمدے کے ایک آہنی ستون سے باندھ دیا ۔

اس وقت میرے دل میں کیا خیالات آرہے تھے وہ یاد نہیں ۔ پر میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ تینوں انسان نہیں جہنم کے فرشتے ہیں ۔ غصہ کی جگہ دل میں ایک ہیبت سما گئی تھی ۔ اس وقت اگر کوئی غیبی طاقت میری بندشوں کو کاٹ دیتی ۔ میرے ہاتھوں میں آب دار خنجر دے دیتی ۔ تو بھی میں زمین پر بیٹھ کر اپنی ذلت اور بے کسی پر آنسو بہانے کے سوا اور کچھ نہ کر سکتی تھی ۔ مجھے خیال آتا تھا ۔ شاید خدا کی طرف سے مجھ پر یہ قہر نازل ہوا ہے ۔ شاید میری بے نمازی اور بے دینی کی یہ سزا مل رہی ہے ۔ میں اپنی گذشتہ زندگی پر نگاہ ڈال رہی تھی کہ مجھ سے کون سی خطا سرزد ہوئی ہے ۔ جس کی یہ پاداش ہے ۔

مجھے اسی حالت میں چھوڑ کر تینوں صورتیں کمرہ میں چلی گئیں ۔ میں نے سمجھا ۔ میری سزا ختم ہوئی ۔ لیکن کیا یہ سب مجھے یوں ہی بندھا رکھیں گے کنیزیں مجھے اس ہیئت کذائی میں دیکھ لیں تو کیا کہیں ؟ نہیں اب میں اس گھر میں رہنے کے قابل ہی نہیں ۔ میں سوچ رہی تھی کہ رسیاں کیونکر کھولوں ۔ مگر افسوس ! مجھے نہ معلوم تھا کہ ابھی تک میری جو گت ہوئی ہے ۔ وہ آنے والی بے رحمیوں کا صرف بیعانہ ہے ۔ میں اب تک نہ جانتی تھی کہ نوع خفیف کتنا سفاک ۔ کتنا قاتل ہے ۔ میں اپنے دل سے بحث کر رہی تھی کہ اپنی تحقیر کا الزام مجھ پر کہاں تک ہے ۔ اگر میں حسینہ کی ان جگر خراش باتوں کا جواب نہ

دیتی ۔ تو کیا یہ نوبت نہ آتی! آتی اور ضرور آتی ۔ وہ کالی ناگن مجھے ڈسنے کا ارادہ کر کے چلی تھی ۔ اسی لئے اس نے دل آزار لہجہ میں گفتگو شروع کی تھی کہ میں غصہ میں آ کر اُس کو لعن وطعن کروں ۔ اور اسے مجھے ذلیل کرنے کا بہانہ مل جائے۔

پانی زور سے برسنے لگا تھا ۔ بوچھاڑوں سے میرا سارا جسم تر ہو گیا تھا سامنے گہرا اندھیرا تھا ۔ میں کان لگائے سن رہی تھی ۔ کہ اندر کیا مسکوٹ ہو رہی ہے ۔ مگر مینہ کی سنسناہٹ کے باعث آوازیں صاف نہ سنائی دیتی تھیں ۔ اتنے میں لالٹین پھر کمرہ سے برآمدہ میں آئی ۔ اور تینوں ہیبت ناک صورتیں پھر سامنے آ کر کھڑی ہو گئیں ۔ اب کی اس خونی پری کے ہاتھوں میں ایک پتلی سی قمچی تھی ۔ اس کے تیور دیکھ کر میرا خون سرد ہو گیا ۔ اس کی آنکھوں میں ایک خون آشام وحشت ۔ ایک سفاکانہ جنون نمودار تھا ۔ میری طرف شرارت آمیز نظروں سے دیکھ کر بولی "بیگم صاحبہ! میں تمہاری بدزبانیوں کا ایسا سبق دینا چاہتی ہوں ۔ جو تمہیں ساری عمر یاد رہے ۔ اور میرے مرشد نے بتلایا ہے کہ قمچی سے زیادہ دیرپا اور کوئی سبق نہیں ہوتا"۔

یہ کہہ کر اس ستم شعار نے میری پیٹھ پر ایک قمچی زور سے ماری ۔ میں تلملا گئی ۔ معلوم ہوا کہ کسی نے پیٹھ پر آگ کی چنگاری رکھ دی ۔ مجھ سے ضبط نہ ہو سکا ۔ والدین نے کبھی پھول کی چھڑی سے بھی نہ مارا تھا ۔ زور سے چیخیں مار مار کر رونے لگی ۔ خودداری کا غرور ۔ غیرت کا احساس سب غائب ہو گیا ۔ قمچی کی خوفناک اور روشن حقیقت کے سامنے سب جذبات فنا ہو گئے ان ہندو دیویوں کے جگر شاید آہن کے ہوتے ہوں گے جو اپنی آن پر آگ میں کود پڑتی تھیں ۔ میرے دل پر تو اس وقت یہی خیال مسلط تھا کہ اس عذاب سے کیونکر نجات ہو ۔ سعید خاموش صورت تصویر کھڑا تھا ۔ میں اس

کی طرف چشمِ فریاد سے دیکھ کر نہایت عاجزی سے بولی "سعید۔ لِلّٰہ۔ مجھے اس ظالم سے بچاؤ۔ میں تمہارے پیروں پڑتی ہوں۔ مجھے زہر دے دو۔ خنجر سے گردن کاٹ لو۔ لیکن یہ کرب سہنے کی مجھ میں تاب نہیں۔ ان دلجوئیوں کو یاد کرو۔ میری محبت کو یاد کرو۔ اسی کے صدقے۔ اس وقت مجھے اس عذاب سے بچاؤ۔ خدا انہیں اس کا اجر دے گا"

سعید ان باتوں سے کچھ پگھلا۔ حسینہ کی طرف خائف نگاہوں سے دیکھ کر بولا "زرینہ میرے کہنے سے اب جانے دو۔ میری خاطر سے ان پر رحم کرو"

زرینہ تیور بدل کر بولی۔ "تمہاری خاطر سے سب کچھ کر سکتی ہوں۔ گالیاں نہیں برداشت کر سکتی"

سعید۔ کیا ابھی تمہارے خیال میں گالیوں کی کافی سزا نہیں ہوئی؟

زرینہ۔ تب تو آپ نے میری عزت کی خوب قدر کی۔ میں نے رانیوں سے چلمچیاں اٹھوائی ہیں۔ یہ بیگم صاحبہ ہیں۔ کس خیال میں۔ اسے اگر کند چھری سے کاٹوں۔ تب بھی ان کی بدزبانیوں کی کافی سزا نہ ہوگی۔

سعید۔ مجھ سے اب یہ ستم نہیں دیکھا جاتا۔

زرینہ۔ آنکھیں بند کر لو۔

سعید۔ زرینہ غصہ نہ دلاؤ۔ میں کہتا ہوں۔ اب انہیں معاف کرو۔

زرینہ نے سعید کو ایسی حقارت آمیز نگاہ سے دیکھا۔ گویا وہ اس کا غلام ہے۔ خدا جانے اس پر اس نے کیا منتر مار دیا تھا۔ کہ اس میں خاندانی غیرت اور وقار اور انسانی حمیت کا ذرا بھی حس باقی نہ رہا تھا۔ وہ شاید اسے غصہ جیسے مردانہ جذبہ کے قابل ہی نہ سمجھتی تھی۔ اہلِ قیافہ ظاہر سے باطن

پر حکم لگانے میں کتنی غلطی کرتے ہیں - ایسے دلفریب ظاہر کے پردہ میں اتنی شقاوت اور قساوت! کوئی شک نہیں - حسن قیافہ کا دشمن ہے - بولی "اچھا تو اب آپ کو مجھ پر غصہ آنے لگا - کیوں نہ ہو - آخر منکوحہ بیگم ہی تو ہیں - میں تو حیا فروش کسبی ہی ٹھہری!"

سعید - تم طعنے دیتی ہو - اور مجھ سے یہ خون نہیں دیکھا جاتا!

زرینہ - تو یہ قمچی ہاتھ میں لو - اور اسے پوری سو ضربیں لگاؤ - غصہ اُتر جائے گا - اس کا یہی علاج ہے -

سعید - پھر وہی مذاق!

زرینہ - نہیں میں مذاق نہیں کرتی -

سعید نے قمچی لینے کو ہاتھ بڑھایا - مگر معلوم نہیں زرینہ کو کیا شبہ پیدا ہوا - اس نے سمجھا - شاید یہ قمچی کو توڑ کر پھینک دیں گے - قمچی ہٹا لی - اور بولی - "اچھا مجھ سے یہ دغا! تو لو اب میں ہی ہاتھوں کی صفائی دکھاتی ہوں" یہ کہہ کر اس بے درد نے مجھے بے تحاشہ قمچیاں مارنا شروع کیں - میں کراب سے اینٹھ اینٹھ کر چیخ رہی تھی - اس کے پیروں پڑتی تھی - منتیں کرتی تھی - اپنے فعل پر نادم تھی - دعائیں دیتی تھی - پیر اور پیغمبر کا واسطہ دیتی تھی - پر اس قتالہ کو ذرا بھی رحم نہ آتا تھا - سعید کاٹھ کے پتلے کی طرح یہ نظارہ درد و ستم آنکھوں سے دیکھ رہا تھا - اور اس کو جوش نہ آتا تھا - شاید میرا بڑے سے بڑا دشمن بھی میری گریہ وزاری پر ترس کھاتا - میری پیٹھ چھل کر لہولہان ہو گئی - زخم پڑتے تھے - ہر ایک ضرب آگ کے شعلے کی طرح بدن پر لگتی تھی - معلوم نہیں اس نے میرے کتنے درّے لگائے - یہاں تک کہ قمچی کو مجھ پر رحم آ گیا - وہ پھٹ کر ٹوٹ گئی - لکڑی کا کلیجہ پھٹ گیا - مگر انسان کا دل نہ پگھلا *

(۳۴)

مجھے یوں خوار و تباہ کر کے تینوں ازداج خبیثہ وہاں سے رخصت ہو گئیں۔ سعید کے ملازم نے چلتے وقت میری رسّیاں کھول دیں۔ لیکن میں کہاں جاتی؟ اس گھر میں کیونکر قدم رکھتی؟

میرا سارا جسم ناسور ہو رہا تھا۔ لیکن دل کے آبلے اس سے کہیں جاں گزا تھے۔ سارا دل آبلوں سے پُر ہو گیا تھا۔ جذبات حسنہ کی جگہ بھی باقی نہ رہی تھی۔ اس وقت میں کسی اندھے کو کنوئیں میں گرتے دیکھتی تو مجھے ہنسی آتی۔ کسی یتیم کا گریہ دردناک سنتی۔ تو اس کا منہ چڑاتی۔ دل کی حالت میں ایک زبردست انقلاب ہو گیا تھا۔ مجھے غصہ نہ تھا۔ غم نہ تھا۔ موت کی آرزو نہ تھی۔ یہاں تک کہ جذبۂ انتقام بھی نہ تھا۔ اس انتہا کی ذلت نے انتقام کی خواہش کو بھی فنا کر دیا تھا۔ حالانکہ میں چاہتی تو قانوناً سعید کو شکنجہ میں لا سکتی تھی۔ لیکن یہ بے حرمتی۔ یہ بے آبروئی یہ پامالی انتقام کے دائرہ اثر سے خارج تھی۔ بس صرف ایک حس باقی تھا۔ اور وہ حسِ ذلت تھا۔ میں ہمیشہ کے لئے ذلیل ہو گئی۔ کیا یہ داغ کسی طرح مِٹ سکتا تھا؟ ہرگز نہیں۔ ہاں وہ چھپایا جا سکتا تھا۔ اور اس کی ایک ہی صورت تھی کہ ذلت کے قعرِ سیاہ میں گر پڑوں۔ تاکہ سارے پیرہن کی سیاہی اس داغ سیاہ کو چھپا دے۔ کیا اس گھر سے بیابان اچھا نہیں جس کی دیواریں مسمار ہو گئی ہوں۔ اس کشتی سے کیا سطح آب اچھی نہیں۔ جس کے پیندے میں ایک بڑا شگاف ہو گیا ہو؟ اس حالت میں یہی دلیل مجھ پر غالب آئی۔ میں نے اپنی تباہی کو اور بھی مکمل۔ اپنی ذلت کو اور بھی مرفع۔ اپنی روسیاہی کو اور بھی مطلاً کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ میں نادانستہ

طور پر سعید سے اخلاقی انتقام لینے پر آمادہ ہوگئی۔ رات بھر میں وہیں پڑی کبھی درد سے کراہتی اور کبھی انہیں خیالات میں الجھتی رہی۔ یہ مہلک ارادہ لمحہ بہ لمحہ اور بھی مضبوط ہوتا جاتا تھا۔ گھر میں میری کسی نے خبر نہ لی۔ پَو پھٹتے ہی میں باغیچہ سے باہر نکل آئی۔ معلوم نہیں میرا حجاب کہاں غائب ہوگیا تھا جو شخص سمندر میں غوطہ کھا چکا ہو۔ اُسے تال تلیوں کا کیا خوف؟ میں جو در و دیوار سے شرماتی تھی۔ اس وقت شہر کی گلیوں میں بے حجابانہ چلی جارہی تھی۔ اور کہاں؟ وہیں جہاں ذلت کی قدر ہے۔ جہاں کسی پر کوئی ہنسنے والا نہیں جہاں رسوائی کا بازار آراستہ ہے۔ جہاں حیا بکتی ہے اور شرم لٹتی ہے!

اس کے تیسرے دن بازار حُسن کے ایک نمایاں حصہ میں ایک اونچے بالاخانہ پر بیٹھی ہوئی میں بازار کی سیر کر رہی تھی۔ شام کا وقت تھا۔ نیچے سڑک پر آدمیوں کا ایسا ہجوم تھا کہ شانے سے شانہ چھلتا تھا۔ آج ساون کا میلہ تھا۔ لوگ صاف ستھرے کپڑے پہنے جوق جوق دریا کی طرف جا رہے تھے۔ ہمارے بازار کی بیش قیمت جنس بھی دریا کے کنارے آراستہ تھی۔ کہیں حسینوں کے جھولے تھے۔ کہیں ساون کے گیت۔ لیکن مجھے اس بازار کی سیر کنارِ دریا سے پُرلطف معلوم ہوتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شہر کی اور سب شاہراہیں بند ہوگئی ہیں۔ صرف یہی تنگ گلی کھلی ہوئی ہے۔ اور سب کی نگاہیں بالاخانوں ہی کی طرف لگی تھیں۔ گو یا وہ زمین پر نہیں چل رہے ہیں۔ ہوا میں اڑنا چاہتے ہیں۔ ہاں تعلیم یافتہ آدمیوں کو میں نے اتنا بے باک نہیں پایا۔ وہ بھی گھورتے تھے مگر کنکھیوں سے۔ ادھیڑ عمر کے لوگ سب سے زیادہ بے باک معلوم ہوتے تھے۔ شاید اُن کی منشاء جوش جوانی کی نمود تھی۔ بازار کیا تھا۔ ایک وسیع تھیٹر تھا۔ لوگ بذلہ سنجیاں کرتے

تھے۔ لطف اٹھانے کے لئے نہیں۔ حسینوں کو سنانے کے لئے۔ روئے سخن دوسری طرف تھا۔ نگاہ کسی دوسری طرف۔ بس بھانڈوں اور نقالوں کی مجلس تھی۔

دفعتہً سعید کی فٹن نظر آئی۔ میں اس پہ بارہا سیر کر چکی تھی۔ سعید پر لطف لباس پہنے۔ اکڑا ہوا بیٹھا تھا۔ ایسا خوش وضع۔ ایسا بانکا وجیہہ جوان سارے شہر میں نہ تھا۔ بشرہ سے مردانہ پن برستا تھا۔ اس کی نگاہ ایک بار میرے بالاخانہ کی طرف اٹھی۔ اور نیچے جھک گئی۔ اس کے چہرے پر مرُدنی سی چھا گئی۔ جیسے زہریلے سانپ نے کاٹ کھایا ہو۔ اس نے کوچبان سے کچھ کہا۔ دم زدن میں فٹن ہوا ہو گئی۔ اس وقت اسے دیکھ کر مجھے جو حاسدانہ مسرت ہوئی۔ اس کے سامنے اس درد جان گزا کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ میں نے ذلیل ہو کر اُسے ذلیل کر دیا۔ یہ کٹار قمچیوں سے کہیں زیادہ تیز تھی۔ اس کی جرأت نہ تھی کہ اب مجھ سے آنکھ ملا سکے۔ نہیں۔ میں نے اسے محبوس کر دیا۔ اسے قید عمر میں ڈال دیا۔ اس قید تنہائی سے اب اس کا نکلنا غیر ممکن تھا۔ کیونکہ اسے اپنی خاندانی وجاہت کا غرور تھا۔

دوسرے دن علی الصباح خبر ملی۔ کہ کسی قاتل نے مرزا سعید کا کام تمام کر دیا۔ اس کی لاش اسی باغیچہ کے گول کمرہ میں ملی۔ سینہ میں گولی لگ گئی تھی۔ نو بجے دوسری خبر سنائی دی۔ زرینہ کو بھی کسی نے رات کے وقت قتل کر ڈالا تھا۔ اس کا سر تن سے جدا کر دیا گیا تھا۔ بعد کو تحقیقات سے معلوم ہوا کہ یہ دونوں وارداتیں سعید ہی کے ہاتھوں وقوع میں آئیں۔ اس نے پہلے زرینہ کو اس کے مکان پر قتل کیا۔ اور تب اپنے گھر آ کر اپنے سینہ میں گولی ماری۔ اس مردانہ غیرت مندی نے سعید کی محبت میرے دل میں تازہ کر دی۔

شام کے وقت میں اپنے مکان پر پہنچ گئی۔ ابھی مجھے یہاں سے گئے

ہوئے صرف چار دن گزرے تھے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ برسوں کے بعد آئی ہوں۔ در و دیوار پر حسرت چھائی ہوئی تھی۔ میں نے گھر میں قدم رکھا۔ تو بے اختیار سعید کی متبسم صورت آنکھوں کے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔ وہی مردانہ حسن۔ وہی بانکپن۔ وہی نگاہ التجا۔ بے اختیار آنکھیں بھر آئیں۔ اور دل سے ایک آہ سرد نکل آئی۔ غم اس کا نہ تھا کہ سعید نے کیوں جان دے دی۔ نہیں اس کی مجرمانہ بے حسی اور مردانہ حسن پرستی کو میں قیامت تک نہ معاف کروں گی۔ غم یہ تھا کہ یہ سودا اس کے سر میں کیوں سمایا۔ اس وقت دل کی جو کیفیت ہے۔ اس سے قیاس کرتی ہوں کہ چند دنوں میں سعید کی بیوفائی اور بے رحمی کا زخم بھر جائے گا۔ اپنی ذلت کی یاد بھی شاید مٹ جائے۔ مگر اس کی چند روزہ محبت کا نقش باقی رہے گا۔ اور اب یہی میری زندگی کا سہارا ہے۔

اِصلاح

(۱)

درگا مالی ڈاکٹر عرفان علی بار ایٹ لا کے یہاں نوکر تھا۔ پانچ روپیہ تنخواہ تھی۔ گھر میں بیوی کے علاوہ دو تین چھوٹے بچے تھے۔ بیوی پڑوسیوں کے لیے گیہوں پیس دیا کرتی تھی۔ دو بچے جو ذرا ذی شعور تھے اِدھر اُدھر سے لکڑیاں اُپلے وغیرہ چُن لاتے تھے۔ مگر تاہم ان کی بڑی تکلیف سے بسر ہوتی تھی۔ درگا ڈاکٹر صاحب کی نظر بچا کر باغیچہ سے پھول چُن لیا کرتا۔ اور بازار میں پجاریوں کے ہاتھ بیچ دیتا تھا۔ کبھی کبھی اس کا دست غنیمت پھلوں پر بھی جا پڑتا تھا۔ یہ اس کی بالائی آمدنی تھی۔ اس سے روزانہ نمک تیل کا خرچ نکل

آتا تھا۔ اس نے کئی بار ڈاکٹر صاحب سے اضافہ تنخواہ کی التجا کی تھی۔ مگر ڈاکٹر صاحب کے ذہن میں اضافہ کی کوئی معقول وجہ نہ آتی تھی۔ وہ صاف کہہ دیا کرتے تھے۔ ”بھئی میں تمہیں جبراً تو نہیں روکتا۔ تمہارا یہاں نباہ نہیں ہوتا۔ کہیں اور تلاش کرو۔ میرے لئے مالیوں کا قحط نہیں ہے“۔ درگا میں اتنی جرأت نہ تھی کہ وہ لگا ہوا روزگار چھوڑ کر دوسری نوکری ڈھونڈنے نکلتا۔ اس سے زیادہ تنخواہ ملنے کی اسے امید بھی کم تھی۔ اس لئے قہرِ درویش برجانِ درویش پڑا دن کاٹتا تھا۔ اور اپنی تقدیر کو روتا تھا۔

ڈاکٹر صاحب کو باغبانی کا خاص ذوق تھا۔ انواع و اقسام کے پھول پتے لگا رکھے تھے۔ اچھے اچھے پھلوں کے درخت ملیح آباد۔ سہارن پور۔ دربھنگہ وغیرہ مقامات سے منگوا کر لگائے تھے۔ درختوں کو پھل سے لدا ہوا دیکھ کر انہیں دلی مسرت ہوتی تھی۔ اپنے احباب کے یہاں اکثر گل دستے اور سبزیاں وغیرہ تحفتہً بھجواتے رہتے تھے۔ انہیں خود کھانے کا شوق نہ تھا۔ مگر کھلانے میں انہیں خاص لطف آتا تھا۔ ہر ایک پھل کے موسم میں دوستوں کی دعوت اتمار کرتے۔ پکنک پارٹیاں۔ ان کے مشغلہ تفریح کا ایک خاص جزو تھیں۔

ایک بار گرمیوں میں انہوں نے اپنے کئی ہم مشرب دوستوں کو آم کی دعوت دی۔ ایک ملیح آبادی سفیدے میں کئی پھل لگے ہوئے تھے۔ انہیں وہ روزانہ چہل قدمی کرتے ہوئے دیکھا کرتے تھے۔ اس خیال سے انہیں وہی خوشی ہوتی تھی۔ جو کسی پہلوان کو اپنے پٹھوں کے کرتب دکھانے سے ہوتی ہے۔ اتنے بڑے خوش رنگ پھل خود ان کی نگاہ سے کبھی نہ گزرے تھے۔ پھلوں کی شیرینی کا انہیں اتنا کامل یقین تھا کہ وہ چکھ کر اپنا اطمینان کرنا ضروری نہ سمجھتے تھے۔ بالخصوص اس لئے کہ اس خود پروری سے وہ اپنے کسی ایک دوست کو لطف

ذائقہ سے محروم کر دینگے۔

شام کا وقت تھا۔ چیت کا مہینہ۔ احباب باغیچہ میں آکر حوض کے کنارے کرسیوں پر بیٹھے برف اور دودھ کا انتظام پہلے ہی سے کر لیا گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب پہلے پھلوں کو درخت میں لگے ہوئے دکھلا کر تب انہیں تڑوانا چاہتے تھے۔ تاکہ کسی کو یہ شک کرنے کا موقع نہ ملے۔ کہ پھل اس باغ کے نہیں ہیں۔ جب سب حضرات جمع ہو گئے۔ تو انہوں نے کہا "آپ لوگوں کو تکلیف تو ہو گی۔ مگر ذرا چل کر پھلوں کو درخت میں لٹکے ہوئے ملاحظہ فرمایئے۔ کتنے خوشنما معلوم ہوتے ہیں۔ گلاب میں بھی ایسی دلآویز سرخی نہ ہو گی۔ رنگ سے ملاحت ٹپکی پڑتی ہے۔ ان کی رنگت اور صورت اس درجہ رغبت انگیز ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ میں نے یہ قلم خاص ملیح آباد سے منگوایا تھا اور اس کی خاص طور پر نگہداشت کی گئی ہے"۔

احباب اٹھے۔ ڈاکٹر صاحب میزبان کی حیثیت سے آگے آگے چلے۔ روشوں کے دونوں طرف گلاب کے تختے تھے۔ ان کی بہار دکھلاتے ہوئے وہ بالآخر سفیدہ کے درخت کے سامنے آگئے۔ مگر وہاں ایک پھل بھی نہ تھا۔ انہوں نے خیال کیا۔ شاید یہ درخت نہیں ہے۔ دو قدم اور آگے چلے۔ دوسرا درخت مل گیا۔ اور آگے بڑھے۔ کٹھل کا درخت آگیا۔ پھر پیچھے لوٹے اور تعجب کرتے ہوئے سفیدہ کے درخت کے سامنے رک گئے۔ پھل کیا ہوئے؟ درخت تو یہی ہے۔ اس میں مطلق شبہ نہیں۔ مگر پھل کہاں گئے؟ دوستوں کی طرف خطاوارانہ انداز سے دیکھا۔ اور معافی طلب لہجہ میں بولے "ضرور مالی کی شرارت ہے۔ دیکھئے میں کم بخت کو ابھی بلاتا ہوں۔ میں حد درجہ نادم ہوں کہ آپ صاحبوں کو ناحق تکلیف ہوئی۔ واللہ مجھے اس وقت جتنا ملال ہے۔ اس کا اظہار نہیں

کر سکتا۔ ایسے خوش ذائقہ۔ خوش رنگ۔ خوشنما پھل میں نے اپنی زندگی میں نہ دیکھے تھے۔ ان کے یوں تلف ہونے کا مجھے بے انتہا قلق ہے۔"

یہ کہتے ہوئے وہ ایک انداز شہادت سے کرسی پر بیٹھ گئے۔ احباب نے کہا "جناب آپ ہم لوگوں کی تکلیف کا خیال نہ فرمائیں۔ وہ نہ سہی۔ دوسرے پھل سہی"۔ ایک رنگین طبع صاحب بولے "جناب مجھے تو سب آم ایک ہی سے لگتے ہیں۔ سفیدے۔ موہن بھوگ۔ لنگڑے۔ بمبئی۔ فجری۔ وسہری۔ اس میں کوئی فرق نہیں معلوم ہوتا۔ معلوم نہیں کیونکر آپ لوگوں کو ان کی لذتوں میں امتیاز معلوم ہوتا ہے۔"

دوسرے صاحب نے فرمایا "یہاں بھی یہی کیفیت ہے۔ اس وقت جو موجود ہوں وہی منگوائیے! جو گئے۔ ان کا افسوس بے سود ہے۔"

عرفان علی۔ حضنت آموں کی کیا کمی ہے۔ سارا باغ بھرا ہوا ہے۔ خوب شوق سے کھائیے۔ مگر وہ لطافت اور نزاکت کہاں؟ آپ کو یقین نہ آئے گا۔ واللہ سفیدوں پر ایسا نکھار تھا کہ بالکل سیب معلوم ہوتے تھے۔ سیب خوشنما ضرور ہوتا ہے۔ مگر اس میں وہ رغبت انگیز لطافت کہاں؟ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شجر آرزو میں وصال کے پھل لگے ہوئے ہیں۔ واللہ سخت افسوس ہے۔ کمال افسوس ہے۔ اس مالی نے آج وہ حرکت کی ہے کہ جی چاہتا ہے۔ نمک حرام کو گولی مار دوں۔ اس وقت سامنے آجائے۔ تو آدھ موا کر دوں (مسکرا کر) اگر خدا نخواستہ کل مجھ پر ضرب شدید کا کوئی استغاثہ ہو۔ تو آپ لوگ شاہد رہیے گا کہ مجھے کس قدر روحانی اشتعال ہوا ہے۔

مالی کا پتہ نہ تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے سائیس سے آم تڑوائے۔ دوستوں نے آم کھائے۔ دودھ پیا۔ ڈاکٹر صاحب کا شکریہ ادا کر کے اپنے اپنے گھر کی

راہ لی۔ انہیں ڈاکٹر صاحب کے نقصان عظیم کا مطلق احساس نہ ہوا۔ مگر ڈاکٹر صاحب وہیں حوض کے کنارے ڈنڈا ہاتھ میں لئے مالی کے انتظار میں قطب از جا نمے جنبد بنے بیٹھے رہے ۔

(۲)

دُرگا شام کو بازار سے لوٹا۔ وہ چوکنی نظروں سے اِدھر اُدھر تاکتا آتا تھا۔ جونہی اس نے ڈاکٹر کو حوض کے کنارے ڈنڈا ہاتھ میں لئے بیٹھے دیکھا۔ اس کے ہوش اُڑ گئے۔ سمجھ گیا۔ کہ چوری پکڑ لی گئی۔ اس خوف سے آج اس نے آنے میں عمداً دیر کی تھی۔ اس نے سمجھا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کہیں سیر کرنے گئے ہونگے میں کٹھل کے درخت کے نیچے اپنے جھونپڑے میں چپکے سے جا بیٹھوں گا۔ صبح کو پوچھ پاچھ ہوئی بھی تو مجھے صفائی دینے کا موقعہ رہے گا۔ سرکار میری تلاشی لے لیں۔ اس طرح معاملہ دب جائے گا۔ چور وقت کو اپنی بریت کی بہترین دلیل سمجھتا ہے۔ ایک ایک لمحہ اسے دلیر بناتا جاتا ہے۔ لیکن رنگے ہوئے ہاتھوں پکڑے جانا۔ اس کے لئے قہر ہے۔ وہ بے زبان ہو جاتا ہے۔ اس کی سینہ زوری سلب ہو جاتی ہے۔ خون کے سوکھے رنگ کے داغ بن سکتے ہیں۔ لیکن تازہ خون آپ ہی آپ پکارتا ہے۔ اس میں زبان ہوتی ہے۔ درگا کے پیر تھم گئے۔ سینہ دھڑکنے لگا۔ ڈاکٹر صاحب کی نگاہ اس پر پڑ گئی تھی۔ اب واپسی کا ارادہ بے کار تھا۔ ڈاکٹر صاحب دوال سے دیکھتے ہی اُٹھے کہ چل کر خوب مرمت کروں۔ لیکن بیرسٹر تھے۔ خیال آگیا کہ اس کا بیان لینا ضروری ہے۔ اشارہ سے قریب بلایا۔ اور پوچھا۔ ” سفیدہ میں کئی پھل لگے ہوئے تھے۔ ان میں ایک بھی نظر نہیں آتا۔ کیا ہوئے؟ درگا نے معصومانہ انداز سے

دیکھ کر کہا۔ ہجور ابھی میں بجار گیا ہوں تو آم جوں کے توں تھے۔ اتنی دیر میں کوئی توڑ لے گیا ہو۔ تو میں نہیں کہہ سکتا۔"

عرفان علی۔ تمہارا کس پر شبہ ہے؟

مالی۔ ہجور اب میں کیسے بتاؤں؟ اتنے نوکر چاکر ہیں۔ نہ جانے کس کی نیت بگڑی ہو۔

عرفان علی۔ مگر میرا شبہ تمہارے ہی اوپر ہے۔ اگر توڑ کر رکھے ہوں۔ تو لاکر دے دو۔ یا صاف صاف کہہ دو۔ کہ میں نے توڑے ہیں۔ ورنہ میں بُری طرح پیش آؤں گا۔

چور محض سزا سے نہیں بچنا چاہتا۔ وہ بدنامی سے بھی بچنا چاہتا ہے۔ وہ سزا سے اتنا نہیں ڈرتا۔ جتنا بدنامی سے۔ جب اسے سزا سے بچنے کی ساری امید منقطع ہو جاتی ہے۔ اس وقت بھی وہ اپنے جرم کا اقبال نہیں کرتا۔ درگا اس وقت اپنے فعل کا اعتراف کر کے سزا سے بچ سکتا تھا۔ پر اس نے کہا۔ "ہجور مالک ہیں۔ جو چاہیں کریں۔ پر میں نے آم نہیں توڑے۔ سرکار ہی بتا دیں کہ اتنے دن آپ کی تابے داری کرتے ہو گئے۔ کبھی ایک ٹہنی بھی چھوئی ہے؟"

عرفان علی۔ "تم قسم کھا سکتے ہو"؟

درگا۔ ہجور گنگا کی کسم جو میں نے آموں میں ہاتھ بھی لگایا ہو۔

عرفان علی۔ اس قسم کی سند نہیں۔ تم لوٹے میں پانی لاؤ۔ اس میں تلسی کے پتے رکھو۔ اور تب قسم کھا کر کہو۔ کہ اگر میں نے آم توڑے ہوں تو میرا لڑکا میرے کام نہ آئے۔ تب مجھے تمہارے اوپر اعتماد ہو گا۔

درگا۔ ہجور سانچ کو آنچ کیا۔ جیسے کہیئے قسم کھا جاؤں۔ جب میں نے

کام ہی نہیں کیا۔ تب مجھ پر کسم کیا پڑے گی؟

عرفان علی۔ باتیں نہ بناؤ۔ جاکر پانی لاؤ۔

ڈاکٹر صاحب قیافہ شناس آدمی تھے۔ رات دن مجرموں سے سابقہ رہتا تھا۔ ورگا اگرچہ زبان سے دلیرانہ باتیں کر رہا تھا۔ پر اس کے دل میں خوف سمایا ہوا تھا۔ وہ اپنے جھونپڑے میں آیا۔ لیکن لوٹے میں پانی لے کر پھر جانے کی اس کی ہمت نہ ہوئی۔ اس کے ہاتھ تھرتھرانے لگے۔ کئی ایسے واقعے یاد آ گئے۔ جب کہ جھوٹی گنگا اٹھانے والوں پر آسمانی بلائیں نازل ہو گئی تھیں بھگوان کے حاضر و ناظر ہونے کا ایسا یقین آج تک اُسے نہ ہوا تھا۔ اُس نے فیصلہ کیا کہ میں جھوٹی گنگا نہ اٹھاؤں گا۔ یہی ہوگا نا۔ کہ برخاست ہو جاؤنگا۔ کچھ جرمانہ ہو جائے گا۔ یہ منظور ہے۔ نوکری بھی کہیں نہ کہیں مل ہی جائے گی اور نوکری بھی نہ ملے۔ تو مزدوری تو کہیں نہیں گئی ہے۔ کدال بھی چلاؤں گا تو چار پانچ آنے روز پا جاؤں گا۔

وہ آہستہ آہستہ خالی ہاتھ ڈاکٹر صاحب کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔

ڈاکٹر صاحب نے تند لہجہ میں کہا۔ "پانی لاؤ"۔

ورگا۔ میں گنگا نہ اٹھاؤں گا۔

ڈاکٹر۔ تو ثابت ہو گیا کہ تم نے ضرور آم توڑے۔

ورگا۔ اب سرکار جو چاہیں سمجھیں۔ مان لیجیئے میں نے ہی توڑ لئے تو آپ کا غلام ہوں۔ رات، دن تابے داری کرتا ہوں۔ بال بچے آموں کے لئے روئیں تو کہاں جاؤں۔ اب کے جان بخشی کی جائے۔ پھر ایسی خطا نہ ہوگی۔

ڈاکٹر صاحب اتنے فیاض نہ تھے۔ انہوں نے یہی احسان کیا کہ ورگا کو پولیس کے سپرد نہ کیا۔ اور نہ اسے ہنٹر لگائے۔ اس کے مذہبی اعتقاد نے انہیں

کچھ نرمی کی جانب مائل کر دیا تھا۔ مگر ایسے بدنیت شخص کو اپنے یہاں رکھنا غیر ممکن تھا۔ انہوں نے اسی دم درگا کو معزول کر دیا۔ اور اس کی باقی تنخواہ جرمانہ میں ضبط کر لی۔

(۳۳)

کئی ماہ گذرنے کے بعد ایک روز ڈاکٹر عرفان علی مسٹر پریم شنکر کے باغیچہ کی سیر کرنے گئے۔ وہاں سے چند اچھی اچھی قلمیں لانے کا ارادہ تھا۔ پریم شنکر کو بھی باغبانی کا شوق تھا۔ اور دونوں آدمیوں کے درمیان یہی ایک مناسبت تھی۔ ورنہ دونوں بالکل متضاد تھے۔ پریم شنکر قناعت پسند۔ سادہ مزاج۔ غریب دوست آدمی تھے۔ وہ کئی سال امریکہ رہ چکے تھے۔ وہاں زراعت اور فلاحت کی تعلیم حاصل کی تھی۔ اور اب یہاں آکر اسی فن کو ذریعہ معاش بنا لیا تھا۔ انسانی خاصہ اور موجودہ نظام معاشرت کے متعلق ان کے عجیب خیالات تھے۔ جن کے باعث شہر کے مہذب طبقہ کے لوگ انہیں مراقی فاترالعقل سمجھتے تھے۔ ان کے خیالات سے لوگوں کو ایک قسم کی فلسفیانہ ہمدردی ضرور تھی۔ مگر اس میں لوگوں کو شک تھا کہ ان پر عمل بھی کیا جا سکتا ہے۔ یہ عمل کی دُنیا ہے۔ فلسفہ کی دُنیا نہیں ہے۔ یہاں فلسفہ ہمیشہ فلسفہ ہی رہے گا۔ اُسے واقعات زندگی سے کوئی علاقہ نہیں۔ ڈاکٹر صاحب باغیچہ میں داخل ہوئے تو پریم شنکر کو کیاریاں سینچتے ہوئے پایا۔ کنوئیں پر ایک سفید پوش آدمی کھڑا پمپ سے پانی نکال رہا تھا۔ وہ درگا مالی تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے دل میں اس وقت درگا کی جانب سے ایک بغض للہ سا پیدا ہوا۔ جس شخص کو انہوں نے سزا دے کر اپنے یہاں سے علیحدہ کر دیا تھا۔ اسے اس قدر خوش باش ہونے کا کیا حق تھا

اگر درگا اس وقت پھٹے حال۔ روتی صورت بنائے نظر آتا۔ اور انہیں دیکھتے ہی ان کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو جاتا۔ تو شاید ڈاکٹر صاحب کو اس پر رحم آجاتا۔ وہ اسے غالباً کچھ انعام دیتے۔ اور پریم شنکر سے اس کی نسبت چند کلمات خیر کہنے کی تکلیف گوارا کرتے۔ وہ خاصتہً نیک آدمی تھے اور اپنے ملازموں سے مہربانی کے ساتھ پیش آتے تھے۔ مگر ان کی اس مہربانی اور اس التفات میں مطلق فرق نہ تھا۔ جو انہیں اپنے کتوں یا گھوڑوں کے ساتھ تھی۔ اس مہربانی کی بنیاد انصاف پر نہیں، رحم پر تھی۔ درگا نے انہیں دیکھا۔ کنوئیں پر کھڑے کھڑے ادب سے سلام کیا۔ اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ اس کی یہ خودداری ڈاکٹر صاحب کے جگر میں کانٹے کی طرح چبھی۔ انہیں اس خیال سے غصہ آیا کہ میرے یہاں سے نکلنا اس کے حق میں اکسیر ہو گیا۔ پریم شنکر جونہی ان سے مصافحہ کر کے انہیں چند نئے تختوں کی طرف لے چلے تو ڈاکٹر صاحب نے پوچھا "یہ آدمی آپ کے یہاں کتنے دنوں سے ہے"؟

پریم شنکر۔ چار پانچ مہینے ہوئے ہونگے۔

عرفان علی۔ کچھ نوچ کھسوٹ تو نہیں کرتا۔ اس سے پہلے یہ میرے یہاں مالی تھا۔ اس کی دست درازیوں سے تنگ آکر میں نے اسے نکال دیا تھا۔ کبھی پھول توڑ کر بیچ لیتا۔ کبھی پودے اکھاڑ لے جاتا۔ اور پھلوں کا تو ذکر ہی کیا۔ ایک بار میں نے چند احباب کی دعوت کی تھی۔ ملیح آبادی سفیدہ خوب پھلا ہوا تھا۔ جب سب لوگ آکر بیٹھ گئے اور میں درخت کے پاس گیا۔ تو سارے پھل غائب۔ کچھ نہ پوچھئے۔ اس وقت کتنی خفت ہوئی۔ میں نے اسی وقت ان حضرت کو دھتکار بتائی۔ بڑا ہی دغاباز بدنیت آدمی ہے اور ایسا شاطر کہ اسے گرفتار کرنا محال ہے۔ کوئی وکیل ہی جیسا کائیاں آدمی ہو۔ تو اسے پکڑ سکتا ہے۔ ایسی صفائی

اور دلیری سے انکار کرتا ہے کہ اس کا منہ تکتے رہ جائیے۔ آپ کو تو کبھی چرکا نہیں دیا؟

پریم شنکر۔ جی مطلق نہیں۔ مجھے اس نے شکایت کا کبھی موقع نہیں دیا۔ یہاں تو خوب محنت کرتا ہے۔ یہاں تک کہ دوپہر کی چھٹی میں بھی آرام نہیں کرتا۔ مجھے تو اس پر اتنا بھروسہ ہو گیا ہے کہ سبزی۔ پھل۔ پودے۔ بیج سب اسی کے ہاتھوں میں چھوڑ دئے ہیں۔ دن بھر میں جو کچھ آمدنی ہوتی ہے وہ شام کو مجھے دے دیتا ہے اور کبھی ایک پائی کا بھی فرق نہیں ہوتا۔

عرفان علی۔ جناب یہی تو اس کی مشاقی کی تعریف ہے کہ آپ کو اُلٹے استرے سے مونڈے اور آپکو مطلق خبر نہ ہو۔ آپ اسے کیا تنخواہ دیتے ہیں؟

پریم شنکر۔ یہاں کسی کو تنخواہ نہیں دی جاتی۔ سب آدمی نفع میں برابر شریک ہوتے ہیں۔ مہینہ میں ضروری اخراجات نکال دینے کے بعد جو کچھ آمدنی ہوتی ہے اس پر دس فی صدی کار خیر کے لئے الگ کر لیا جاتا ہے۔ باقی روپے برابر تقسیم کر دئے جاتے ہیں۔ پچھلے ماہ ایک سو چالیس روپیہ کی آمدنی ہوئی تھی۔ مجھے ملا کر کل سات آدمی ہیں۔ ہر ایک کے حصہ میں بیس بیس روپے آئے تھے۔ اب کی ماہ میں جوار ہو گئی ہے۔ امرود اچھے آئے ہیں۔ زیادہ آمدنی کی امید ہے۔

عرفان علی نے تعجب سے پوچھا۔ کیا آپ اس قدر قلیل آمدنی پر بسر کر لیتے ہیں۔؟

پریم شنکر۔ جی ہاں! بہت آسانی سے۔ میں ان مصنوعی ضروریات کا پابند نہیں ہوں۔ جسے آجکل داخل تہذیب سمجھا جاتا ہے۔ میں وہی کپڑے پہنتا ہوں وہی کھانا کھاتا ہوں۔ اور اسی طرح رہتا ہوں۔ زیادہ کی ضرورت ہی کیوں ہو؟ دس بیس روپیہ ماہوار دیانت کا صرفہ ہے جو غربا کو تقسیم کی جاتی ہیں۔ یہ رقم مشترکہ آمدنی سے وضع کی جاتی ہے اور سب کے سب آدمی اس ثواب میں شریک ہوتے ہیں۔ سائیکل جو آپ کو نظر

آرہی ہے وہ مشترکہ رقم سے لی گئی ہے، جسے ضرورت ہوتی ہے اس پر سوار ہوتا ہے۔ چونکہ ان آدمیوں کو مجھ پر زیادہ اعتبار ہے اس لئے وہ مجھے اپنا مکھیا سمجھتے ہیں اور میرے علم اور تجربہ کے باعث میرا دباؤ مانتے ہیں۔ جو کچھ کہتا ہوں اس کی تعمیل کرتے ہیں۔ کوئی یہ محسوس نہیں کرتا کہ میں کسی کا نوکر ہوں۔ سب کے سب ساجھے دار ہیں۔ اس لئے سب جان توڑ کر محنت کرتے ہیں اور کامل ایمانداری کے ساتھ۔ جب ایک شخص مالک اور دوسرا اسکا نوکر ہوتا ہے تو فوراً رقابت شروع ہو جاتی ہے۔ مالک چاہتا ہے کہ میں اس محنت سے زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کروں۔ نوکر چاہتا ہے کہ میں کم سے کم کام .... کروں۔ ان کے درمیان ذرا بھی ہمدردی یا برادرانہ تعلق نہیں ہوتا۔ دونوں ایک دوسرے کے دشمن ہوتے ہیں۔ کام چھوٹا ہو یا بڑا۔ اس رقیبانہ کشمکش کا نتیجہ برا ہوتا ہے۔ اس نے دنیا میں دولت اور افلاس کے دو جداجدا فرقے قائم کر دئے ہیں اور ان میں خونریز جنگ ہو رہی ہے۔ مگر قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ رقابت کا دور اب نزع کی حالت میں ہے اسکی جگہ اب باہمی امداد اور ہمدردی کا دور شروع ہونے والا ہے۔ میں نے دوسرے ملکوں میں رقابت کے نظارے خوب دیکھے ہیں اور ان سے سیر ہو گیا۔ باہمی امداد میں نجات کی صورت نظر آتی ہے۔ اب ہمیں زبردستی کو خیرباد کہہ کر ایثار سے کام لینا پڑیگا۔

عرفان علی۔ تو یہ کہیئے کہ آپ سوشلسٹ ہیں۔

پریم شنکر۔ جی نہیں میں سوشلسٹ یا ڈیماکریٹ کچھ نہیں ہوں۔ میں صرف حق اور انصاف کا خادم ہوں۔ میں اخلاق کو علم سے بالاتر سمجھتا ہوں۔ علم اور ذہانت۔ فہم اور فراست یا دیگر ذہنی اور دماغی اوصاف کو ہوس اور زر پرستی کا غلام نہیں بنانا چاہتا۔ مجھے موجودہ تعلیم اور تہذیب پر مطلق اعتماد نہیں ہے۔ علم کا کام ہے، تہذیب اخلاق اور تہذیب اخلاق کا نتیجہ فیاضی۔ فراخدلی۔ ایثار۔ بےنفسی۔ ہمدردی۔ غریب دوستی اور انصاف پسندی ہے۔ وہ تعلیم جو ہمیں ثروت و جاہ کا غلام بنا دے، جو ہمیں

زبردست آزاری پر مائل کرے۔ جو ہمیں تکلفات کا مطیع بنائے جو ہمیں دوسروں کا خون پی کر فربہ ہونے کی تحریک کرے۔ تعلیم نہیں شیطنت ہے۔ جہلا حرص و طمع کے بس میں ہو جائیں۔ تو قابل معافی ہیں۔ مگر مدعیان علم و تہذیب کے لئے نفس پرستی حد درجہ شرمناک ہے۔ علم و فضیلت کو ہم نے بام ثروت کا زینہ بنا لیا۔ حالانکہ وہ خدمت کا وسیلہ تھا۔ اونچی سے اونچی تعلیم پائے ہوئے لوگ زیادہ سے زیادہ حریص نظر آتے ہیں۔ بس زبردستی ہماری تعلیم و تہذیب کا معیار ہے۔ میں اس تعلیم سے جہالت کو بدرجہا بہتر سمجھتا ہوں۔ ہمارے پروفیسر صاحب ایک ہزار سے کم تنخواہ پائیں تو ان کا منہ نہیں سیدھا ہوتا۔ ہمارے دیوانی اور مال کے حکام دو ہزار ماہوار پانے پر بھی شکوۂ تقدیر کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب چاہتے ہیں کہ ساری دنیا مریض ہو جائے اور میں سونے کی دیوار کھڑی کر لوں اور ہمارے وکیل صاحب (معاف کیجئے گا) اپنی قانون دانی کو ہیرے کے تول بیچنا چاہتے ہیں۔ سب کے سب "وقت دولت ہے" کے کلیہ کے غلام بنے بیٹھے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک سیکڑوں ہزاروں آدمیوں کی روزی غصب کر لیتا ہے اور پھر بھی خادم قوم بننے کا دعویٰ کرتا ہے۔ رعایا فاقہ کشی کرے۔ برہنہ رہے۔ طاعون سے مرے۔ ہمارا دماغی گروہ ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ پیدا دوسرے کریں کھانا ہمارا کام ہے۔ میں اس گروہ کو محض وجود معطل نہیں بلکہ شر وائر سمجھتا ہوں۔

ڈاکٹر عرفان علی نے بہت تحمل سے کام لے کر پوچھا۔ "تو کیا آپ چاہتے ہیں کہ ہم سب مزدوری کریں"؟

پریم شنکر۔ جی نہیں۔ حالانکہ اگر ایسا ہو تو میں اسے نوع انسان کے لئے مایۂ خیر و برکت سمجھوں۔ مجھے صرف حالات میں اس درجہ تفاوت سے اعتراض ہے۔ اگر ایک غریب آدمی پانچ روپے ماہوار میں گزار سکتا ہے تو ایک دماغی کام کرنے والے آدمی کے لئے اس

کی دوگنی چوگنی رقم کافی ہونی چاہیئے۔ مگر پانچ اور پانچ ہزار۔ پچاس اور پچاس ہزار کا بعد المشرقین کیوں ہو؟ انتظام سلطنت قانونی فیصلہ۔ قانون کی حمایت۔ طبابت۔ تصویر کشی۔ رقاصی معلمی۔ دلالی۔ تجارت اور صدہا دیگر پیشے ایسے ہیں جن میں ایک بھی کسب دولت نہیں کرتا۔ ان سب کا مدار دوسروں کی کمائی پر ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ وہ پیشے جو ضروریات زندگی پیدا کریں۔ قیام حیات کے لئے سامان بہم پہنچائیں۔ آج دنیا کے سارے مدبر۔ سارے وکیل۔ سارے دلال۔ سارے پروفیسر معرض فنا میں آجائیں تو دنیا آنسو کا ایک قطرہ بھی نہ گرائے گی۔ بلکہ خوشی سے گھی کے چراغ جلائے گی۔ اس کے سر سے ایک بوجھ اتر جائے گا۔ کاشتکار اپنا ہل چلائیگا اور اپنے گوشۂ قناعت اور عافیت میں بیٹھا ہوا آرام سے زندگی بسر کریگا۔ آپ فرمائیں گے۔ یہ تو تمدن کے دور اولین کا نقشہ ہے۔ انسان نے قرنوں اور صدیوں میں جو ترقیاں کی ہیں۔ ان کو ہٹا کر پھر اسی دور توحش کی طرف واپس جاتا ہے۔ آپ فنون لطیفہ کی ترقی کو انسان کے جذباتی اور روحانی عروج کا لازمہ قرار دینگے۔ علیٰ ہذا آپ کو موجودہ تہذیب کا ہر ایک پہلو حیات انسانی کے لئے ضروری نظر آئے گا۔ کیونکہ انسان محض چوپایہ نہیں ہے۔ لیکن حق یہ ہے کہ تہذیب اور ترقی خود غرضی اور جفاشعاری کی ایک مستور صورت ہے اور کچھ نہیں۔ ہندوستان کا کاشتکار چین کے مزارع سے لڑنے نہیں جاتا۔ اسی تعلیم یافتہ گروہ نے اپنے مطلب کے لئے قوم کا سوانگ کھڑا کیا۔ قومی حقوق کی حفاظت کے لئے فوجیں بنائیں۔ انصرام سلطنت کا نقشہ کھینچا۔ مسائل بین الاقوام کی ایجاد تجارت اور صنعت کے لاینحل عقدے اختراع کئے اور اب اپنی فتوحات پر ناز کرتا ہے۔ اپنی تہذیب پہ پھولا نہیں سماتا۔

عرفان علی۔ آپ اقتصادیات کے مسئلہ تقسیم محنت کو بالکل نظرانداز کر رہے ہیں قدرت نے افراد کو خاص خاص قابلیتیں عطا کی ہیں۔ ان کے بہترین استعمال کے لئے

خاص موقعوں کی ضرورت ہوتی ہے۔"

پریم شنکر۔ میں یہ کب کہتا ہوں کہ ہر فرد مزدوری کرنے پر مجبور ہو۔ نہیں جسے پرماتما نے غور و فکر کی قوت عطا کی ہے۔ وہ فلسفیانہ مسائل کی تحقیق کرے۔ جس کے جذبات مفید اور عمیق ہوں۔ وہ شعر و سخن میں طبع آزمائی کرے۔ علیٰ ہٰذا میری دلیل صرف یہ ہے کہ پیشوں میں اس قدر امتیاز نہ رہنا چاہیئے۔ دماغ سے تعلیم و تہذیب اور درس و تدریس کا کام لینا چاہیئے۔ جذبات سے اخلاقی اور روحانی اصلاح کا۔ مگر ان روحانی یا دماغی کمالات کو ذریعہ ثروت نہ بنانا چاہیئے۔ میرے خیال میں بہتر یہ ہے کہ ہر شخص اپنے ہاتھوں سے کسب معاش کرے اور دل و دماغ صرف قوم کی اصلاح و فلاح روحانی مسائل کی تحقیق و تدقیق۔ علمی معلومات کی اشاعت اور ترویج کے لئے وقف ہوں لیکن تاوقتیکہ ہم اس اعلیٰ معیار تک نہ پہنچ سکیں۔ ہم کو ذہنی اور حرفتی پیشوں میں اس غیر فطری امتیاز کو مٹانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ کیونکہ یہ آئین قدرت کے بالکل خلاف معلوم ہوتا ہے کہ لازمی پیشوں کو تفوق ہو۔ بعض اہل الرائے کا خیال ہے کہ اس تسویہ سے اہل کمال بددل ہو جائیں گے اور دنیا ان کے انوار فیض سے محروم ہو جائیگی مگر وہ بھول جاتے ہیں کہ دنیا کے بڑے سے بڑے حکماء بڑے سے بڑے شعراء بڑے سے بڑے موجد۔ بڑے سے بڑے ارباب فنون لطیفہ۔ مال و زر سے بے نیاز تھے۔ اس وقت کمال کا معاوضہ اپنے قلب کی تسکین تھی۔ نوع کی ضرورت محرک کہاں تھی۔ جب سے کمال نے دولت کا دامن پکڑا۔ اسی وقت سے تہذیب کا انحطاط شروع ہوا۔"

ڈاکٹر عرفان علی اب زیادہ صبر نہ کر سکے۔ بولے "آپ کا مجوزہ نظام معاشرت فرشتوں کی دنیا کے لئے چاہے موزوں ہو۔ لیکن اس عملی دنیا کے لئے اور اس عملی دور میں ہرگز موزوں نہیں ہے۔"

پریم شنکر۔ محض اسی لئے کہ ابھی تک سرمایہ داروں کا اور مہذب جماعت کا

عوام پر اقتدار ہے؟ مگر اس کے قبل بھی بارہا اس اقتدار کو زک ہو چکی ہے اور قرائن تبلا رہے ہیں کہ زمانہ قدیم میں اب اسے پھر زک پہنچنے والی ہے۔ شاید اب کے یہ شکست فیصلہ کن ہوگی۔ تہذیب کا دور جمہوریت سے شروع ہو کر جمہوریت ہی پر ختم ہوتا ہے۔ شاہی حکومت روساء کا اقتدار سرمایہ داروں کی بالادستی یہ درمیانی منازل ہیں۔ موجودہ دور نے درمیانی منزلیں طے کر لی ہیں اور اپنی آخر منزل تک آ پہنچا ہے۔ مگر ہم ابھی تک اپنی ثروت اور اختیار کے نشہ میں اس قدر مخمور ہیں کہ ہم کو آثار اور قرائن بالکل نہیں نظر آتے۔ اطراف عالم سے جمہور کی گھنگھور صدائیں ہمارے کانوں میں پہنچ رہی ہیں۔ مگر ہم ابھی تک ایسے بے خبر ہیں۔ گویا عالم خواب میں ہوں۔ ہم اپنی یونیورسٹی ایجوکیشن اپنے قانونی انہماک۔ اپنے ڈراما اور تھیٹر اپنے مل اور کارخانوں اور اسی قسم کے دوسرے مشاغل میں محو ہیں۔ جن کا منشا دوسروں کی کمائی اور مشقت پر موٹا ہونا ہے۔ موجودہ گرانی ضروریات پر سارے عالم میں واویلا مچا ہوا ہے۔ میں بہت خوش ہوں۔ اس سے ہماری تہذیب کے تاریک پہلو پر کیسی صاف روشنی پڑتی ہے۔ اب مہذب دنیا کو تجربہ ہو رہا ہے کہ تھیٹر کا وہ ایکٹر جو پانچ ہزار روپیہ ماہوار پیدا کرتا ہے۔ معاشرت کا ضروری جزو ہے۔ یا وہ غریب کندہ ناتراش کاشتکار جسے ہم حیوان مطلق سمجھنے کے عادی ہیں۔

یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ درگا مالی ایک ڈالی میں کچھ پھل چند جوار کی بالیں چند آم سجا کر لایا۔ اس کے انداز اور بشرہ سے ایک خودداری نہ متانت برس رہی تھی گویا اب وہ ذاتی اہمیت سے باخبر ہو گیا ہے۔ وہ سلام کر کے ایک مونڈھے پر بیٹھ گیا۔ اور ڈاکٹر صاحب سے پوچھا "آپ کو کن چیزوں کی قلمیں چاہئیں۔ آپ بابو جی کو آرڈر دیجئے۔ میں کل آپ کے مکان پر پہنچا دوں گا۔ بال بچے تو اچھی طرح ہیں"؟

عرفان علی نے کسی قدر محجوب ہو کر کہا "ہاں لڑکے اچھی طرح ہیں۔ تم یہاں آرام سے ہو؟"

درگا۔ جی ہاں۔ سب حضور کی مہربانی ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے ایک کاغذ پر چند قلموں کے نام لکھ کر رکھ دیئے۔ اور رخصت مانگی۔ پریم شنکر ان کے ساتھ ساتھ پھاٹک تک آئے۔ ڈاکٹر صاحب نے دروازہ پر متانت سے مسکرا کر کہا۔ حضرت میں آپ کے اصولوں کا قائل تو نہیں ہوا۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ آپ نے ایک کمینہ اور شیطان آدمی کو انسان بنا دیا یہ آپ کی صحبت کا فیض ہے۔ میں ذات کا قائل ہوں۔ انسٹی ٹیوشنوں کا قائل نہیں لیکن معاف فرمایئے گا۔ میں پھر بھی کہونگا کہ آپ اس سے ہوشیار رہیئے گا۔ "ایجونکس" کا علم ابھی تک کوئی ایسا نسخہ ایجاد نہیں کر سکا۔ جو تخم کی تاثیر کو مٹا دے +